پاکستان کے قیام پہ سوال اٹھانے والے آج کے دانشوروں کے لیے بطور خاص

مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے درمیان ہونے والی ناقابل یقین تاریخی گفتگو کا احوال پہلی بار

نومبر 2013ء

اُردو ڈائجسٹ

urdudigest.pk/

افسانہ نمبر

KitabPK.Com

KitabPK.Com

اپنے بچوں کو یوں
بے عزت
نہ کریں!

سانحے
فراموش کرنے میں
ہم کس پر چلے گئے ہیں

دل کو صحت مند
رکھنے والے **35** گر

کیا رائج الوقت تصوف
ایک سراب ہے

عام آدمی پارٹی
بھارت کے روایتی
سیاسی نظام میں زلزلہ

افسانہ نمبر میں نامور لکھنے والے

بانو قدسیہ | نیلوفر اقبال | خالدہ حسین | امرتا پریتم | آغا گل | مظہر الاسلام | عرفان جاوید | عمار مسعود

KitabPK.Com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کا قرآن

صدقہ دینے والے کا اجر

اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے۔ تب کہے اے پروردگار! کیوں نہ مجھے تھوڑی سی اور مہلت دی تا کہ میں صدقہ (خیرات) کر لیتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا O

(سورۃ منافقون:10:63)

جو لوگ، مرد اور عورتیں، صدقات (خیرات) کرنے والے ہیں اور (خلوص نیت سے) اللہ کو نیک قرض دیتے ہیں ان کو دگنا (اجر) ملے گا اور ان کے لیے عزت کا اجر ہے O (سورۃ حدید:18:57)

رسول ﷺ کا فرمان

صدقہ جہنم کی آگ سے بچنے کا ذریعہ ہے

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص اپنی پاک کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پاک چیز ہی پہنچتی ہے تو اللہ اسے بڑھاتا ہے حتیٰ کہ وہ پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے'' (اور اس کا اجر و ثواب اسی حساب سے ملتا ہے)۔

(بخاری کتاب97: باب23: مسلم کتاب الزکوۃ۔ باب19)

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب قیامت کے دن تم میں سے ہر شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ براہِ راست بات کرے گا۔ پھر بندہ نظر اُٹھا کر دیکھے گا، تو اپنے سامنے آگ ہی آگ نظر آئے گی جو اس کا استقبال کر رہی ہو گی، چنانچہ تم میں سے اس سے بچنے کا ذریعہ صدقہ ہے خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر کسی کو یہ بھی میسر نہ آئے تو کلمہ خیر اور اچھی بات کہے (کہ یہ بھی صدقہ ہے)۔''

(بخاری کتاب81: باب49: مسلم کتاب الزکوۃ۔ باب20)

KitabPK.Com

اُردو ڈائجسٹ

نومبر 2013ء
ذی الحجہ 1434ھ
www.urdudigest.pk جلد نمبر 53 شمارہ نمبر 11

صدر مجلس ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ الطاف حسن قریشی
مینیجنگ ایڈیٹر طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر اختر عباس ایڈیٹر (ریسرچ) پروفیسر محمد فاروق قریشی
مجلسِ تحریر حافظ افروغ حسن، نوید اسلام صدیقی، سلمیٰ اعوان
سب ایڈیٹر غلام سجاد
مہتمم طباعت فاروق اعجاز قریشی انچارج کمیونیکیشن افنان کامران قریشی
تخلیق و تزئین واصف ملک، رائعہ رضا کمپوزر اشرف سکندر، اشفاق علی
پروف خواں خالد محی الدین

مارکیٹنگ/اشتہارات

edvertisamant@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093
مینیجر اینڈورٹائزمنٹ احمد فیاض 0324-4255178
لاہور ندیم حامد 0300-4242620
گجرات/گوجرانوالہ احسان اللہ بٹ 0300-9620294

سالانہ خریداری

خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے
subscription@urdu-digest.com فون: 92-42-37589957

اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

600 روپے کی شاندار بچت کے ساتھ

پاکستان 1450 کے بجائے 850 روپے میں
بیرونِ ملک 50 امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Benk of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
editor@urdu-digest.com

قیمت 100 روپے
طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے جسارت پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

بھارت.... ایک دوراہے پر

عید سے دوسرے روز دہلی میں پیکجنگ اور کاغذ کی صنعت سے متعلق کانفرنس اور نمائش میں شرکت کے لیے ہم نے ''شتاپ دی'' کا اِنتخاب کیا۔ امرتسر سے دہلی کے چھ گھنٹے کے اس سفر میں ہمیں بھارتی ریلوے کی کارکردگی دیکھنے کا خوب موقع ملا۔ جہاں وقت کی پابندی نے ہمیں متاثر کیا وہیں پر ٹکٹ کی قیمت میں بے اِنتہا اضافہ، اسٹیشن پر گندگی، آوارہ کتوں کی بھرمار اور ٹرین میں صفائی کا فقدان ریلوے کی کارکردگی پر سوالیہ نشان تھے۔ انڈر گراؤنڈ میٹرو ٹرین کے باوجود تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور بے ہنگم ٹریفک نے دہلی کو دنیا کا دوسرا آلودہ ترین شہر بنا دیا ہے۔ یہی صورتحال بھارت کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی ہے۔ دہلی کے پرگتی میدان میں کانفرنس کے دوران پورے ہندوستان سے آئے کاروباری افراد اور پریس کے نمائندوں سے ملنے اور تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ حکومت کی بری کارکردگی پر سبھی متفق تھے۔ وہ سونیا گاندھی اور کانگریس کو خراب معاشی صورتحال اور وسیع پیمانے پر کرپشن کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ من موہن سنگھ جو کبھی انڈیا کے معاشی ہیرو تصور کیے جاتے تھے آج کوئلے کے میگا اسکینڈل سے اپنا دامن بچانے کی فکر میں ہیں۔

کانفرنس میں شرکت کے بعد میسور میں کاغذ اور پیکجنگ کے ایک کارخانے کے دورے کے لیے دہلی سے Spice Jet کی پرواز کے ذریعے اڑھائی گھنٹے بعد بنگلور پہنچا اور وہاں سے بذریعہ سڑک تقریباً چار گھنٹے کا تھکا دینے والا سفر میرا اور میری اہلیہ کا منتظر تھا۔ کاروباری امور سے فراغت کے بعد میسور اور سرنگا پٹم میں موجود تاریخی مقامات کی سیر کی اور خصوصاً سرنگا پٹم میں سلطان فتح علی خان ٹیپو شہید کے مقبرے پر فاتحہ خوانی کی۔

بھارت اگرچہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت، ایشیا کی ایک بڑی فوجی طاقت اور اقتصادی ٹائیگر ہونے کا دعویدار ہے لیکن اس کے چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر قصبات اور دیہات میں حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ سڑکوں کی حالت خراب اور عوام غربت کی چکی میں پسے ہوئے ہیں۔ پینے کا صاف پانی اور صحت و تعلیم کی سہولتوں کی عدم دستیابی عام سی بات ہے۔ مہنگائی نے عام آدمی کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ پیاز پاکستانی کرنسی کے حساب سے دو سو روپے کلو تک بک رہا ہے۔ دیہات کے اندر آئے روز کسان خودکشیاں کر رہے ہیں۔

مالی شرح نمو چھ فیصد سے کم ہو کر پانچ فیصد رہ گئی ہے جو مزید گراوٹ کا شکار ہے۔ ہر طرف کرپشن کے میگا اسکینڈلز کا چرچا ہے۔ غربت کی شرح میں خوفناک اِضافہ بھارتی حکومت کو مسلسل فوڈ سبسڈی بڑھانے پر مجبور کر رہا ہے جو کہ 2001ء میں 17499 کروڑ سے بڑھ کر 13-2012ء میں 75000 کروڑ روپے ہو چکی ہے۔ NREGA پروگرام کے تحت بیروزگاری الاؤنس کی مد میں 40,000 کروڑ روپے دیے جا رہے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان غیر یقینی معاشی حالات میں یہ سلسلہ کب تک جاری رکھا جا سکے گا۔

مرحلہ وار مرکزی انتخابات اگلے سال مئی کے مہینے تک مکمل ہوں گے لیکن کوئی بھی جماعت اکیلی حکومت سازی کی پوزیشن میں دکھائی نہیں دیتی۔ ان حالات میں علاقائی جماعتوں اور اقلیتوں خصوصاً دِلت اور مسلمانوں کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہوگا۔ بھارت میں کرپشن کے خلاف آواز اٹھانے والے انا ہزارے کے ایک اہم ''جرنیل'' مسٹر آرونِد کجری وال کی نئی جماعت ''عام آدمی پارٹی'' AAP دہلی میں تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہی ہے جس کی کامیابی بھارت کی سیاست میں ہلچل مچا سکتی ہے۔ بھارت میں کشمیری حریت پسندوں، نکسل باڑیوں اور ماؤ نواز باغیوں کی تحریکیں شدت پکڑتی جا رہی ہیں۔

اس وقت بھارت میں سیاسی اور معاشی پنڈت پاکستان کی صورت حال کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ واضح مینڈیٹ کی بنا پر تشکیل پانے والی نواز حکومت کی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے چند ہی برسوں میں پاکستانی معیشت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی جبکہ بھارت میں Vodafone کے کیس پر حکومتی اقدامات کی وجہ سے غیر ملکی سرمایہ کار اپنا سرمایہ تیزی سے باہر منتقل کر رہے ہیں جس کی وجہ سے زرمبادلہ کے ذخائر کم اور بھارتی روپیہ اپنی قدر کھو رہا ہے۔ بھارتی ماہرین اور مبصرین کا خیال ہے کہ موجودہ مخلوط مرکزی حکومت ایک معاشی گرداب میں پھنس چکی ہے اور آنے والے دنوں میں ایک مستحکم اور جرأت مند حکومت کا قیام اب ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔

طیب اعجاز قریشی

tayyab.aijaz@urdu-digest.com

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

افسانہ نمبر

فہرست

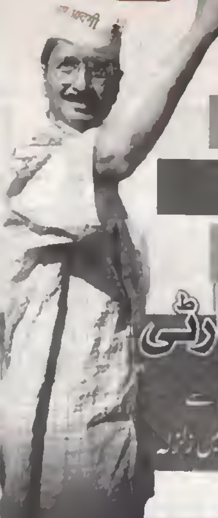

226

[redacted]

پروفیسر محمد فاروق قریشی

عام آدمی پارٹی

''عام آدمی پارٹی'' کے قیام سے بھارت کے روایتی سیاسی نظام میں زلزلہ

ننھا مانجھی

سرائیکی وسیب کے پسِ منظر میں لکھی گئی ایک عمدہ کہانی، جو آپ کو یاد رہے گی

210 محمد خالد اختر

KitabPK.Com

فہرست

افسانہ نمبر

نومبر 2013ء

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

15 کچھ اپنی زبان میں

قومی دھارے کا بلوچستان

18 ہم کہاں کھڑے ہیں

امریکی تعلقات کے اندھیرے اور اُجالے

گائے ڈی موپساں

156

دو دوست

چمکتی دھوپ میں پڑے دو تھیلوں کا ماجرا

انھوں نے دو لوگوں پر بالکل ہی الگ ــــ الگ ــــ اثر کیا تھا

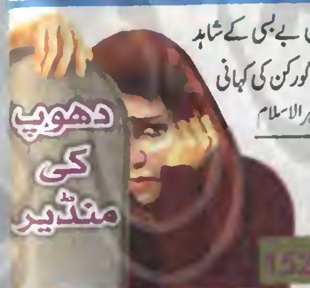

عرفان جاوید 221

وہ اپنی سوچ اور پسند کو برحق سمجھ کر

زندہ تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اُس سوچ نے

کہاں کہاں تک سیندھ لگائی ہے

ایک غیرت مند کی انوکھی کہانی

گردن پر گرم سانس

قبروں کی بے بسی کے شاہد

ایک گورکن کی کہانی

مظہر الاسلام

دھوپ کی منڈیر

152

امرتا پریتم 147

ایک آرزومند کی شکستگی کی کہانی

عمارت ساز

شُودر

عبادت میں ڈوبے

ایک بنگالی محبوب کی کہانی

آغا گل 142

ایک بھتنے کی شرارتوں کا تذکرہ

جسے علم کے دو بول سیکھنے سے

لیے کا پیالہ اور پنیر زیادہ اچھا لگا

ایک تھا پنساری

خالدہ حسین

161

گلابی ربن

173

بلند سماجی رتبہ پا لینے والے ایک نوجوان افسر

کا معصومانہ ماجرا

عمار مسعود

33 خود شناسی ــــــــ ڈاکٹر حمید اللہ

عالم اسلام کے ایک صاحب علم و بصیرت کی تحریر

36 اس اسیری میں مزا آئے ــــــ روبینہ شاہین

معصوم لڑکی کی محبت کا اظہار بے پناہ

40 نبی کریم ﷺ جیسا ہے کوئی حاکم! ــــ سید عاصم محمود

آپ ﷺ کی مدینہ منورہ میں دس برس تک حکمرانی کا ذکرِ دلپذیر

65 دل کو صحت مند رکھنے کے 35 گُر ــــ جنید اکرام

دل سے متعلق سیکڑوں برس پر محیط تحقیق و جستجو کا نچوڑ

93 تصوف ایک سراب ــــــــ پروفیسر محمد فاروق قریشی

اقبال کے نظریۂ خودی اور تصوف کے حوالے سے ایک تجزیاتی تحریر

98 آدم خور شیر ــــــــ اقبال فیروز

لیمانا کے جنگل کے خونخوار شیر کا دل دہلا دینے والا واقعہ

108 پھر خواب میں آئے باواجی ــــ اعتبار ساجد

ایک نو بیاہتا دُلھے کا قصہ

113 بُری باتوں کے کیچڑ میں ــــ جاوید چودھری

سقراط کے ایک فارمولے کا تذکرہ

116 پہلی گیند پہ کھلاڑی آؤٹ ــــ اعجاز چودھری

نامور پاکستانی کرکٹر انتخاب عالم کی سنہری یادیں

124 بھینس کا علاج ــــــــ پروفیسر محمد عبدالنعیم

اندھی تقلید کی ہلاکت خیزی پر خصوصی تحریر

169 خوشی ــــــــ انطوف چیخوف

ایک کلرک کو ملنے والی انوکھی خوشی کا ماجرا

193 چھنا وڑ ــــــــ بشیر احمد بھٹی

ایک وڑ کا ماجرا، اُس نے شیر والے بابے کو مشکل میں گھرے دیکھ لیا تھا

246 کشمکش ــــــــ بنت پاکستان سارہ

کمبل میں دُبکی ایک بوڑھی عورت کا قصہ

251 خوب صورت ــــــــ امتیاز حسین

ایک خوشگوار دن کا ماجرا، جو ناخوشگواری پر ختم ہونے والا تھا

255 آشنا اپنی حقیقت سے ــــ اُمّ عاقب

عورت کا اصل مقام کیا ہے؟

257 اُسامہ بن لادن کا تعاقب پروفیسر محمد فاروق قریشی

اسامہ بن لادن کی تلاش میں ڈاکٹر شکیل آفریدی نے کیا کردار ادا کیا؟

270 جوش عقیدت میں بے ادبی ــــ ڈاکٹر طاہر مسعود

ایک علمی و ادبی تنقیدی خط

234 مصر و فلسطین میں 14 دن ــــ اختر عباس

مصر نے دنیا کو وکٹری کا نیا نشان دیا ہے

241

اپنے لیے سارے راستے

بند کرنے والوں کے لیے خصوصی کہانی

کنول ریاض

اعتبار

248

ہسپتال میں داخل

ایک بوڑھے کی کہانی

معافی

سارہ انجم

129 بانو قدسیہ

اسباق الثلاثہ

اپنی پرانی پوتین بھول بیٹھنے والے

ایک نوجوان کی کہانی

KitabPK.Com

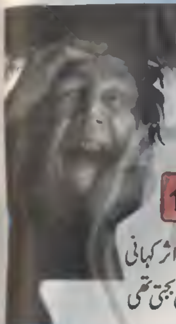

بے خبری

اختر عباس 181

صرف سامنے دیکھتی ایک ماں کی عبرت اثر کہانی
اس کے اندر ذرا ذرا سی بات پر گھنٹی نہیں بجتی تھی

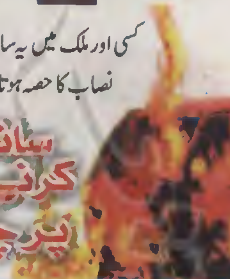

سانحے فراموش کرنے میں ہم کس پر چلے گئے ہیں

حنا انور 81

کسی اور ملک میں یہ سانحہ ہوتا، تو سمیعہ نذیر کا کارنامہ
نصاب کا حصہ ہوتا اور وہ قومی ہیرو قرار پاتی

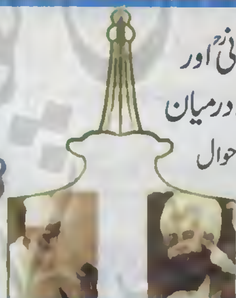

ایک تاریخی مکالمہ

مولانا حسین احمد مدنیؒ اور
مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے درمیان
ہونے والی تاریخی گفتگو کا احوال

رضی الدین سید 44

کھوٹا سکّہ

نیلوفر اقبال

کسی اور کی جنگ لڑ کر
واپس آنے والے ایک
بیٹے کی خوب صورتی کا انوکھا ماجرا

188

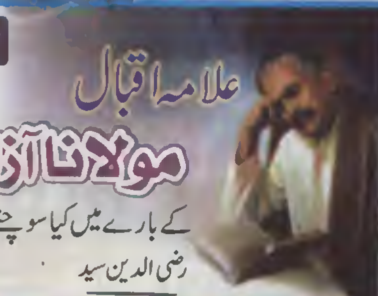

علامہ اقبال مولانا آزاد

کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

رضی الدین سید 57

رو پہلا عِشق فسانہ ہے

ایک طوفانی محبت کا عبرت اثر ماجرا

رابعہ شاہ 198

مستقل کالم و سلسلے

باتیں دانش کی	رفیدہ کلیم فاروقی
وزن کم کریں، صحت نہیں	نوشین ناز
چمن خیال	قارئین کے خطوط
قصہ کوئز	غلام سجاد
بوجھیں تو جانیں	سجاد قادر
در دل پہ دستک	اختر عباس

KitabPK.Com

قومی دھارے کا بلوچستان

رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ اور محلِ وقوع کے اعتبار سے نہایت حساس علاقہ، بلوچستان گزشتہ چند عشروں میں قومی دھارے سے کٹتا چلا آرہا تھا۔ بلوچ راہنما نواب اکبر خان بگٹی کی شہادت کے بعد بعض بلوچ تنظیموں میں باغیانہ جذبات پیدا ہوئے اور بدقسمتی سے وہاں کی تمام قومیت پرست جماعتوں نے 2008ء کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ نتیجے میں ایک سیاسی خلا پیدا ہوا جسے اسٹیبلشمنٹ نے مصنوعی قیادت کے ذریعے پُر کرنے کی ایک ناکام کوشش کی۔ جنرل پرویز مشرف نے جو فوجی آپریشن مختلف صورتوں میں جاری رکھا ہوا تھا، اُس کی آڑ میں بعض بیرونی طاقتیں بلوچستان میں علیحدگی پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کرتی اور اُنھیں کمک پہنچاتی رہیں۔ والیٔ قلات کے علاوہ چند قبائلی سردار اور حالات سے مایوس بعض پُر جوش بلوچ خود ساختہ جلاوطنی کی راہ پر چل نکلے اور نام نہاد آزادی کے اعلانات جاری کرنا شروع کر دیے جن سے یہ منفی تاثر پھیلنے لگا کہ بلوچستان پاکستان کی عمل داری سے باہر نکلتا جا رہا ہے۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے جب فوج کی کمان سنبھالی، تو اُنھوں نے یہ ماٹو اپنایا کہ بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے برابر لانا اور بلوچستان کے عوام کو سماجی اور معاشی طور پر بااِختیار بنانا ہے۔ اُنھوں نے تمام فوجی آپریشن بند اور نئی چھاؤنیوں کی تعمیر کے سارے منصوبے ختم کر دیے۔ فوج اور ایف سی نے تعلیمی اور فنی ادارے بنائے اور ہزاروں نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کیے۔ اُن کی پیہم کوششوں سے فوج میں بلوچستان کی نمایندگی پہلی بار مکمل ہوئی اور معاشرتی اور معاشی نشو ونما میں خاطر خواہ اِضافہ دیکھنے میں آیا۔ عام اِنتخابات کا اعلان غیر یقینی حالات میں ہوا تھا۔ عام تاثر یہ تھا کہ وقت پر انتخابات نہیں ہو سکیں گے اور بلوچستان میں اُن کا اِنعقاد حد درجہ دشوار ہوگا۔ علیحدگی پسند گوریلے دھمکیاں دیتے رہے کہ وہ اِنتخابات کا عمل طاقت کے ذریعے روکیں گے اور بیلٹ پیپر پولنگ اِسٹیشنوں تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ فوج اور ایف سی نے بلوچستان میں حالات پُرامن رکھنے میں نہایت فعال کردار ادا کیا اور ہیلی کاپٹر کے ذریعے دہشت زدہ علاقوں میں اِنتخابات کا سامان اور عملہ پہنچایا تھا۔ آرمی چیف نے پولنگ ڈے سے پہلے تمام انتظامات کی خودنگرانی

KitabPK.Com

کی۔ خوش قسمتی سے قومیت پرست جماعتوں نے اِنتخابات میں حصہ لیا۔ سردار اختر مینگل کی جماعت نے بھی جو پانچ سات برسوں سے جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اِس دوران مسلم لیگ ن بڑی اِستقامت کے ساتھ سیاسی پیش قدمی کرتی رہی اور اُس نے ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ کی نیشنل پارٹی اور جناب محمود خاں اچکزئی کی پختونخواہ ملی عوامی پارٹی سے انتخابی اِتحاد کرلیا۔ مئی کے اِنتخابات میں صوبائی اسمبلی میں سب سے زیادہ نشستیں مسلم لیگ ن کے حصے میں آئیں، دوسرے نمبر پر پختونخواہ ملی عوامی پارٹی اور تیسرے نمبر پر نیشنل پارٹی آئی۔ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت نے وسیع تر ملکی مفاد میں وزارت عالیہ کا تاج ڈاکٹر عبدالمالک کے سر پر رکھ دیا اور گورنری جناب محمود خاں اچکزئی کے بھائی کو سونپ دی۔ اِس طرح پہلی بار بلوچستان کی حکومت قومیت پرست جماعتوں کے حصے میں آئی اور سردار اختر مینگل بھی رُکن اسمبلی کا حلف اُٹھا کر قومی دھارے میں شامل ہوگئے۔ نگران وزیرِاعلیٰ نواب غوث بخش باروزئی نے بھی اِنتخابی عمل کے اِستحکام اور اُسے نتیجہ خیز بنانے میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔

سیاسی طور پر قومی دھارے میں آجانے کے بعد بلوچستان کو ایک بہت بڑی آزمائش کا سامنا تھا۔ ضلع آواران کی دو تحصیلوں میں ہولناک زلزلہ آیا جس نے اُس علاقے کی غربت اور پس ماندگی پوری طرح بے نقاب کردی۔ ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ اَسی ہزار کے لگ بھگ آبادی کو زیروزبر کر ڈالا۔ تفصیلی جائزے سے یہ پتا چلا ہے کہ تباہ کاریوں کا دائرہ اُنتیس ہزار کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے جو ایک چھوٹے ملک کے برابر بنتا ہے۔ لاہور ڈویژن جس میں قصور، شیخوپورہ، ننکانہ صاحب اور لاہور کے اِضلاع شامل ہیں، اُس کا رقبہ تقریباً سترہ ہزار مربع میل بتایا جاتا ہے۔ زلزلے میں چوبیس ہزار سے زائد مکانات، اِسکول اور ہسپتال منہدم ہوگئے ہیں اور تباہی کا منظر تاحدِ نظر پھیلا ہوا ہے، اِس علاقے میں ڈاکٹر اللہ نذر کا اثر و رسوخ پایا جاتا ہے۔ غالباً انہی کی اپیل پر یہاں کے ووٹروں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور مسلم لیگ ق کے اُمیدوار جناب عبدالقدوس بزنجو پانچ سو کے لگ بھگ ووٹ حاصل کر کے کامیاب قرار پائے اور بعد میں ڈپٹی سپیکر منتخب ہوئے۔

بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق ڈاکٹر اللہ نذر پر غیر ملکی طاقتوں کے اثرات خاصے گہرے ہیں جو فوج، ایف سی اور پاکستان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کرتے اور عوام کے اندر نفرت پیدا کرتے رہے ہیں۔ ان نفرت بھرے جذبات کے تحت زلزلہ زدہ علاقے میں کچھ لوگ ایف سی کے ذریعے آنے والی امداد لینے سے اِنکار کرتے اور عسکریت پسند گروہ اُن ہیلی کاپٹرز پر گاہے گاہے راکٹ بھی داغتے رہے جو اِمدادی سامان لے کر آرہے تھے، تاہم اِن حادثات میں بتدریج کمی آگئی ہے اور اب ماحول بڑی حد تک پُرامن محسوس ہوتا ہے۔ بعض کم نظر اور ضرورت سے زائد جامد اذہان کے مالک بلوچ راہنماؤں نے بلوچ کاز کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور بلوچ علاقے ہر اعتبار سے پس ماندہ رہ گئے ہیں۔ اگر یہی عاقبت نااندیش طرزِ عمل جاری رہا، تو اندیشہ ہے کہ آواران کے باسیوں کا

مستقبل بڑا تاریک ہوجائے گا۔ پورے پاکستان سے امداد آرہی ہے اور فوج پر اعتبار کرتے ہوئے عوام ہر نوع کا امدادی سامان ''کولیکشن پوائنٹس'' پر جمع کرا رہے ہیں جو راولپنڈی، لاہور، کراچی اور کوئٹہ میں قائم ہیں۔ وزیرِاعلیٰ پنجاب میاں محمد شہباز شریف کمر میں شدید اور ناقابلِ برداشت درد کے باوجود پہلی فرصت میں آواران پہنچے اور اُن کا ہیلی کاپٹر مسلسل امدادی سامان پہنچاتا رہا ہے۔

زلزلے سے متاثر علاقوں میں جو صحافی جارہے ہیں، وہ اِس اَمر کی شہادت دیتے ہیں کہ متاثرین میں بڑی غیرت پائی جاتی ہے۔ وہ سامان کے پیچھے دوڑتے ہیں نہ ہاتھ پھیلاتے ہیں اور ایک وقار کے ساتھ امداد وصول کرتے ہیں۔ ایدھی ٹرسٹ، ہلالِ احمر اور الخدمت کے رضا کار شب و روز ریلیف پہنچا رہے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پینتیس ہزار خیمے صوبائی حکومت اور ڈونر ایجنسیوں نے فراہم کیے ہیں۔ امدادی پیکٹس لاکھوں کی تعداد میں پہنچائے جارہے ہیں۔ پاکستان کے مخیّر حضرات کو یہ بھرپور احساس ہونا چاہیے کہ پریشانی میں دستگیری کرنے سے اخوت اور اپنائیت کے رشتے مضبوط اور بہت گہرے ہوتے ہیں۔ بلوچ عوام تک یہ پیغام پہنچانے کا سب سے مناسب یہی موقع ہے کہ مصیبت میں سارے اہلِ وطن تمھارے ساتھ ہیں اور وہ تمھارے بنیادی مسائل حل کر کے دم لیں گے۔ ریلیف کا کام الحمدللہ خوش اِسلوبی سے سرانجام پارہا ہے جس میں صوبائی انتظامیہ کے علاوہ فوج اور ایف سی بہت بار اُٹھائے ہوئے ہیں۔ آبادکاری کا مرحلہ بہت کٹھن ہے جو غیر معمولی منصوبہ بندی کا متقاضی ہوگا۔ آبادکاری اگر سائنسی بنیادوں اور سماجی اور سیاسی حقیقتوں کے صحیح ادراک اور فہم و فراست سے کی جائے گی، تو اِس خطے کی پس ماندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی اور ترقی اور خوشحالی کا ایک سنہری دور طلوع ہوگا۔ اِس ضمن میں سب سے زیادہ اہمیت جدید طرز کے تعلیمی اداروں کے قیام پر دینا ہوگی اور اِس ضلع کی معیشت کو ترقی دینے کے لیے ایک بڑے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا ہوگا۔

بلوچستان کے وزیرِاعلیٰ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ کا تعلق یہاں کے ملحق علاقے سے ہے۔ اُن کے ضلع کا ایک گاؤں بھی زلزلے سے متاثر ہوا ہے۔ اُن پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ شفاف سیاسی عمل کے ذریعے عوام کی ذہنی تربیت کا اہتمام کریں اور اپنی ترجیحات میں اِس علاقے کی نشوونما کو اوّلین اہمیت دیں۔ اِسی طرح قومی سیاسی قیادت پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے مصیبت زدہ بلوچ بھائیوں کا مستقبل سنوارنے میں ایک فعال اور مؤثر کردار ادا کرے۔ بہتر ہوگا کہ بیرونی ڈونر ایجنسیوں اور این جی اوز پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے وسائل بروئے کار لائے جائیں اور اپنی فلاحی تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اِس ضمن میں ہمارے میڈیا کو بھی تاریخ ساز کردار ادا کرتے ہوئے عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے اور معاشرتی اِنصاف کو فراہمی کے راستے کشادہ کرنا ہوں گے۔ یہ ہماری قومی قیادت کی بصیرت کا نہایت کڑا امتحان ہے کہ وہ بلوچستان کو قومی دھارے میں شامل رکھنے کے لیے کیا کیا بنیادی تبدیلیاں لانے کا عزم کرتی اور دوررس نتائج کے حامل قدم اُٹھاتی ہے۔ الطاف حسن قریشی

KitabPK.Com

امریکی تعلّقات کے اندھیرے اور اُجالے

امریکا اور پاکستان ایک دوسرے کی ضرورت ہوتے ہوئے بھی
تاریخ کے بعض نازک مرحلوں میں ایک دوسرے سے ایک فاصلے پر کھڑے اور
دشمنوں کی طرح لڑتے نظر آتے ہیں۔
ایسا کیوں ہوتا آیا ہے وزیرِاعظم نواز شریف کے دورے کے بعد آیندہ اُن کا طرزِ عمل کیا ہوگا
ایک تجزیاتی رپورٹ

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

امریکا جو اٹھارھویں صدی میں برطانیہ کی غلامی سے آزاد ہوا، وہ ابتدا میں صرف تیرہ ریاستوں پر مشتمل یورپ کے ایک چھوٹے سے مُلک کے برابر تھا۔ تیسرے امریکی صدر جیفرسن جو بلا کے ذہین اور مہم جو انسان تھے، اُنھوں نے برطانیہ اور فرانس کے درمیان خون ریز جنگ کا فائدہ اُٹھایا۔ اُس وقت نپولین فرانسیسی افواج کی قیادت کر رہا تھا اور اُسے مالی وسائل کی شدید قلت کا سامنا تھا۔ امریکی خطے میں فرانس کی بڑی کالونیاں واقع تھیں جو صدر جیفرسن کی پیشکش پر نپولین نے امریکا کے ہاتھ فروخت کر دیں جس کی بدولت امریکی قلمرو ایک براعظم میں تبدیل ہو گئی۔ بڑے بڑے خطے خرید لینے کا عمل بعد میں بھی جاری رہا اور سرد جنگ کے باجود امریکا نے الاسکا روسی حکمرانوں سے خرید لیا جو اب امریکا کی اکاون ویں ریاست اور وسیع و عریض رقبے کی مالک ہے۔

ابتدا میں امریکی اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک الگ تھلگ رہنے والی قوم تھی۔ پہلی جنگِ عظیم سے امریکا مکمل طور پر لاتعلق رہا اور اِس کے خاتمے پر عالمی امن کے قیام کے لیے جو لیگ آف نیشنز وجود میں آئی، اِس کی تشکیل سے وہ بھی لاتعلق رہا جو آخر کار ناکامی سے دوچار ہوئی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکی صدر روز ویلٹ نے کچھار سے نکلنے کا فیصلہ کیا اور سخت اندرونی مخالفت کے باوجود اتحادی طاقتوں کا پشتی بان بن گیا۔ وہ ہٹلر جس نے یورپ کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا اور روس کو بھی زیر کرنے کی مہم پر نکل کھڑا ہوا تھا، بدترین

شکست سے دوچار ہوا۔ امریکی طاقت کے آگے جاپان کو بھی ہتھیار ڈالنا پڑے اور امریکا جو چند سال پہلے ہی ایٹم بم بنانے میں دوسری عالمی طاقتوں پر سبقت لے گیا تھا، اُس نے طاقت کے نشے میں ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹمی بم گرائے اور لاکھوں جاپانی موت کے گھاٹ اُتار دیے۔ یوں عالمی امور میں امریکی دلچسپی کئی اعتبار سے مفید رہی اور بعض پہلوؤں سے کسی قدر خطرناک۔ مفید اِس لحاظ سے کہ برطانیہ جو ایک صدی تک سپر پاور کے منصب پر فائز رہا تھا، اُس کا زور ٹوٹ گیا اور وہ اپنی نوآبادیات کو آزادی دینے پر مجبور ہوا جس میں ہندوستان سرِفہرست تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ عالمی طاقت کا توازن یورپ سے امریکا منتقل ہوا جو انسانی آزادیوں کا محافظ نظر آتا تھا۔ لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ انسانی تاریخ میں پہلی بار ایٹمی طاقت کا استعمال دیکھنے میں آیا جو بڑے پیمانے پر بنی نوع انسانی کی تباہی کا باعث بنا۔ یہ نقصان بھی محسوس کیا جا رہا ہے کہ امریکا حادثاتی طور پر اقوامِ عالم کا سردار بن گیا ہے جسے بیشتر قوموں کی تاریخ، نفسیات، سیاسی رجحانات اور تہذیبی اقدار سے واقفیت بڑی محدود اور اس کی سفارت کاری میں گہرائی اور دوراندیشی بہت کم ہے۔ اِسی کم نگاہی سے بہت سارے فتنے جنم لیتے اور عالمی امن کا دامن گاہے گاہے تار تار ہوتا آیا ہے۔

☆

امریکا 1923ء کے آغاز تک برصغیر ہند کے سیاسی مدوجزر اور مسلم قوم کے اندر اُبھرتی ہوئی جداگانہ وطن کی تحریک سے تقریباً نابلد تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس جو 1886ء میں قائم ہوئی تھی اور وہ ایک بڑی سیاسی جماعت اور مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے نظریے کے حوالے سے برطانیہ اور امریکا میں کسی قدر جانی پہچانی جاتی تھی، مگر مسلم لیگ کی سیاسی سرگرمیوں کا اُن کے اکابرین کو کچھ علم نہیں تھا۔ پہلی بار ایک برطانوی مصنف کلاوڈ وین ٹائن نے اپنی کتاب میں لکھا کہ ''ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان ہر لحاظ سے ایک قوم ہیں اور حکومت کو اُنھیں ایک قوم ہی تصور کرنا چاہیے۔'' محمد علی جناح کا ایک لیڈر کی حیثیت سے مغرب میں اِس وقت تعارف ہوا جب اُنھوں نے 12 نومبر 1930ء میں لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور اِس کی رُوداد قائداعظم کی تصویر کے ساتھ روزنامہ ٹائمز لندن میں شائع ہوئی۔ اِس روزنامے نے اپنے تجزیے میں یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی اور سماجی اختلافات بہت گہرے ہیں۔ امریکی روزنامے نیویارک ٹائمز نے بابائے قوم کی پوری تقریر شائع کی جو امریکی تھنک ٹینکس میں گفتگو کا موضوع بنی۔ کوئی دس سال بعد اِسی روزنامے نے 25 فروری 1940ء کی اشاعت میں تحریر کیا کہ مسلمان انڈین فوج کا بہترین حصہ ہیں، چنانچہ برطانیہ اُن کو ناراض نہیں کر سکے گا اور اُسے اُن کے قومی جذبات کا احترام کرنا ہوگا۔ دو سال بعد اسی روزنامے کے نمایندے بریڈ ٹ میتھوز نے ہندوستان کا تفصیلی دورہ کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''پاکستان کے نظریے نے مسلم لیگ کو

KitabPK.Com

اس قدر مضبوط بنا دیا ہے کہ اب اگر جناح بھی چاہیں' تو وہ اس نظریے سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔'' اِن دنوں حالات غیر معمولی رفتار سے تبدیل ہو رہے تھے اور دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر برطانوی وزیر اعظم چرچل اور امریکی صدر روز ویلٹ کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا کہ نوآبادیات کو جلد آزادی دی جائے گی۔ انگلستان میں جو انتخابات ہوئے، تو لیبر پارٹی کامیاب ہوئی اور مسٹر ایٹلی وزیراعظم چنے گئے جو چرچل کے مقابلے میں نوآبادیات کو بلا تاخیر آزادی دینے کے حق میں تھے۔

امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال مانیٹرنگ کرنا شروع کر دی تھی کہ اب برصغیر اُس کی دلچسپی کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ اسی ضمن میں اہم امریکی سفارت کاروں نے مئی اور جولائی 1947ء کے درمیان بابائے قوم سے بڑی اہم اور دوررس اہمیت کی ملاقاتیں کیں جن کا تذکرہ مسٹر ایم۔ ایس کترا ونی نے اپنی تصنیف ''پاکستان میں امریکی کردار'' میں کیا ہے۔ قائداعظم نے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے عہدے داروں کو یقین دلایا تھا کہ ایک آزاد اور خودمختار پاکستان امریکا کے مفاد میں ہوگا کیونکہ روسی جارحیت کا مسلمان متحد ہو کر مقابلہ کر سکیں گے۔ اِس بنیادی نکتے پر بھی وہ زور دیتے رہے کہ شرق اوسط کو ہندو سامراج سے محفوظ رکھنے کے لیے پاکستان کا قیام کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ انہی ملاقاتوں میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے خدوخال طے پائے۔ قائداعظم نے جولائی 1947ء کو دہلی میں پریس بریفنگ میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں کہا: ''نئی ریاست تمام قوموں کی بہترین دوست ہوگی۔ ہم دنیا میں امن کے خواہاں ہیں اور اِس ضمن میں ہم سے جو کچھ ہو سکا' اپنا کردار ادا کریں گے۔'' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امریکا وجود میں آنے والے پاکستان کے قریب آتا گیا۔ 7 ر اگست 1947ء کو پاکستان کے نامزد گورنر جنرل دہلی سے کراچی روانہ ہوئے' تو انڈیا میں امریکی سفیر اُنہیں رخصت کرنے ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ قائداعظم نے گورنر جنرل کی حیثیت سے 15 ر اگست 1947ء کو حلف اُٹھایا، تو امریکا پاکستان کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک تھا اور آزادی کی تقریبات میں شامل ہونے والا امریکی وفد سب سے بڑا تھا۔ اِس بڑھتی ہوئی قربت کے تناظر میں قائداعظم نے امریکا کی معروف صحافی مارگریٹ لورک وائٹ کو امریکا کے بارے میں جو بیان دیا تھا' وہ آج بھی ایک بڑی حقیقت کا مظہر ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ''امریکا کو پاکستان کی نسبتاً زیادہ ضرورت ہے جتنی پاکستان کو امریکا کی ہے۔ پاکستان محلِ وقوع کے اعتبار سے دنیا کا محور ہے۔''

......☆......

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر امریکا اور سوویت یونین سپر پاورز کے طور پر اُبھرے اور کچھ ہی عرصے بعد اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی دوڑ میں اِن کے درمیان سرد جنگ شروع ہو گئی۔ امریکا ''آزاد دنیا'' کے لیڈر کے طور پر پیش قدمی کر رہا تھا جبکہ روس کے گرد ایک ''آہنی پردہ'' تنا ہوا تھا اور اِس کی قیادت خونیں انقلابات کے ذریعے اشترا کی

نظامِ زندگی مسلّط کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے مشرقی یورپ کے بیشتر ممالک پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پاکستان کا قیام آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا اور بابائے قوم کو یہ بنیادی فیصلہ کرنا تھا کہ دونوں سپر طاقتوں کے درمیان ایک توازن کیسے قائم کیا جائے۔ قائداعظم صاف طور پر دیکھ رہے تھے کہ امریکا سے باہمی احترام اور انسانی آزادی کی بنیاد پر تعلقات استوار کیے جا سکتے ہیں اور نئی ریاست کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے' چنانچہ اُنہوں نے ستمبر 1946ء میں ابوالحسن اصفہانی اور بیگم ذکیہ شاہنواز کو اِس مقصد سے امریکا روانہ کیا کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس کے اِس زہریلے پروپیگنڈے کا مؤثر جواب دیں کہ مسلمان رجعت پسند ہیں اور اُن کی خواتین سیاسی عمل سے کٹی ہوئیں اور اپنے حقوق سے یکسر بے خبر ہیں۔ اُنہیں یہ ٹاسک بھی دیا گیا کہ وہ صراحت کے ساتھ یہ نکتہ بیان کریں کہ نئی ریاست میں تھیوکریسی ہوگی نہ برداشت کا فقدان ہوگا' بلکہ تمام شہریوں کو مکمل سیاسی اور مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ قائداعظم اِس دوران مختلف امریکی صحافیوں سے تبادلۂ خیال بھی کرتے رہے۔ انہی کوششوں کا ثمر تھا کہ جب قائداعظم نے پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اُٹھایا' تو امریکی صدر ٹرومین نے حسبِ ذیل تہنیتی پیغام دیا جو آیندہ کے تعلقات کی بنیاد بنا تھا:

> ''میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ پاکستان امریکا کی مضبوط دوستی اور خیر سگالی کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کرے گا۔ امریکی حکومت اور عوام آپ کے ملک سے طویل قریبی اور خوشگوار مراسم کی اُمید رکھتے ہیں۔ ہم آپ کی خوشی میں شامل ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ پاکستان اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے تیزی سے ترقی کرے گا۔ ہم اِس امر کے منتظر ہیں کہ نیا ملک انسانی فلاح کے لیے عالمی امور میں تعمیری کردار ادا کرے گا۔''

اِس پیغام کے جواب میں گورنر جنرل پاکستان نے یہ پیغام بھیجا:

> ''آپ نے امریکی عوام کی طرف سے دولتِ پاکستان کے نام نیک تمناؤں اور مبارک باد کا جو پُرجوش پیغام ارسال کیا ہے' اِس سے حکومتِ پاکستان' عوام اور میں بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ ہم دوستی اور خیر سگالی کے جذبات کی بہت قدر کرتے ہیں۔ میرے ذہن میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ امریکا اور پاکستان کے درمیان طویل قریبی اور خوشگوار تعلقات کا آغاز ہے۔''

قائداعظم نے اپنے دیرینہ قابلِ اعتماد ساتھی ابوالحسن اصفہانی کو امریکا میں سفیر نامزد کیا جنہوں نے 8 ر اکتوبر 1947ء کو امریکی صدر ٹرومین کو کاغذاتِ نامزدگی پیش کیے اور پاکستان کی معیشت کے استحکام' تعلیمی ترقی اور عوام کا

KitabPK.Com

معیارِ زندگی بلند کرنے پر زور دیا۔ اِس پر امریکی صدر نے مختلف شعبوں میں تعاون کی یقین دہانی کرائی۔

نئی مملکت کے مالی حالات نہایت دگرگوں تھے۔ اِس کے پاس فوج اور سرکاری ملازمین کو تنخواہ دینے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ بھارت نے پاکستان کو ملنے والی بہت بڑی رقم روک لی تھی۔ ایسے میں نظام حیدرآباد دکن نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور جناب ابوالحسن اصفہانی نے بھی زبردست ایثار سے کام لیا۔ قائداعظم نے مشکل حالات سے نمٹنے کے لیے حیدرآباد دکن کے مشہور صنعت کار میر لائق علی خاں کو اپنا خصوصی نمایندہ بنا کر امریکا روانہ کیا جنہوں نے پاکستان کی دفاعی اور انتظامی ضرورتوں کے لیے دو ارب امریکی ڈالر امداد کی باقاعدہ درخواست دی۔ وہ درخواست مسترد کر دی گئی اور محض ایک کروڑ ڈالر مہاجرین کی بحالی کے ضمن میں فراہم کیے گئے۔ یہ ابتدائے عشق تھا جو آگے چل کر بہت برگ و بار لاتا اور نشاطِ کار کا عنوان بنتا رہا۔

......☆......

اِس کے برعکس دوسری سپر پاور سوویت یونین کا طرزِ عمل شروع ہی سے مخاصمانہ تھا۔ روسی لیڈر قائداعظم کو برطانیہ کا حامی اور دشمن سیاست دان گردانتے رہے۔ روسیوں کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کا مقصد بھارت کو آزاد ہونے سے روکنا ہے۔ قیامِ پاکستان پر سوویت یونین نے نیک تمناؤں کا پیغام بھیجنے کے بجائے پاکستان کو ایک ''مصنوعی ریاست'' قرار دیا۔ اِس کے جواب میں قائداعظم نے روس کے رویے پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان نے روس کی شہ پر پاکستان کے اقوامِ متحدہ کے رکن بننے کی مخالفت کیہے۔ اُنہیں پوری طرح شرح صدر تھا کہ پاکستان جو ایک مسلمان ملک ہے' اِس میں کمیونزم کی کوئی گنجائش نہیں۔ اِس یقین کے باوجود اُنہوں نے روس کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی روش اپنائی اور کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی جماعت قرار دینے سے اجتناب کیا۔ اُن کی ہدایت پر وزیرِ خارجہ سر ظفر اللہ خان 13/اپریل 1948ء کو روس کے نائب وزیر برائے امورِ خارجہ سے ملے اور دونوں ملکوں میں سفیروں کی تعیناتی کا فیصلہ ہوا جو دیر تک تعطّل کا شکار ہوتا رہا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ روس پشاور میں روسی سفارت خانے کا رابطہ دفتر کھولنے کا مطالبہ کرتا رہا تھا جو پختونستان کا ہوا کھڑا کر دینے کے باعث پاکستان کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ قیامِ پاکستان کے تیرہ ماہ بعد پاکستان نے روس میں اپنا سفیر نامزد کر دیا اور تجارتی تعلقات بھی قائم کر لیے۔

روس کے معاندانہ رویوں کے باعث پاکستان کے لیے امریکا سے قریبی روابط قائم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ قائداعظم نے شرقِ اوسط میں پاکستان کا تعارف کرانے کے لیے ملک فیروز خاں نون کو مسلمان ملکوں کے دورے پر روانہ کیا۔ اُنہوں نے ترکی میں امریکی سفیر کو باور کرایا کہ پاکستان کے مسلمان کمیونزم کے مخالف ہیں جبکہ بھارت نے ماسکو میں وزیرِاعظم نہرو کی ہمشیرہ مسز پنڈت کو سفیر تعینات کر رکھا ہے۔ شدید نظریاتی اختلافات کے

باعث پاکستان میں روس کا کوئی سفیر نہیں۔ اِس نہج میں پاکستان امریکا کی منڈی بن سکتا ہے' اِس لیے اُس کے ساتھ مالی اور دفاعی تعاون بہت ضروری ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کی سلامتی کو روس اور بھارت کی طرف سے خطرات لاحق ہیں جنہوں نے آپس میں سیاسی گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔

......☆......

امریکا اور پاکستان کے مابین چند سال بعد ایک دفاعی معاہدہ طے پایا اور کمیونزم کی یلغار کی روک تھام کے لیے سینٹو اور سیٹو کے معاہدے معرضِ وجود میں آئے جن میں پاکستان کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ بعدازاں بہت سارے نازک مرحلے بھی آئے اور پاک امریکی تعلقات میں زلزلے بھی آتے رہے جن کی جھٹکے آج بھی بڑی شدت سے محسوس ہو رہے ہیں۔ ہمیں اِن تعلقات کی ماہیت کا اگر صحیح ادراک ہو جائے' تو پاکستان امریکی روابط مضبوط بنیادوں پر فروغ پا سکتے ہیں۔ جب پاکستان تشکیل کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا' تو امریکا کے لیے سب سے زیادہ کشش پاکستان کی فوج میں تھی جو کمیونزم کے آگے ڈٹ جانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی تھی۔ اُسے پورا یقین تھا کہ پاکستان کے مسلمان اور اِس کی فوج ''آزاد دنیا'' کے بہت بڑے حلیف ثابت ہو سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے تاریخ ساز الہ آباد کے خطبے میں کہا تھا کہ ہندوستان کے اندر مسلم ریاست کے قیام سے کمیونزم کا راستہ روکا جا سکے گا۔ اِس تجزیے کی اساس پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں اوّلین امریکی ترجیح ہماری مسلح افواج ہیں۔ پہلے انہیں کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس کیا جاتا رہا اور اب وہ عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک نہایت اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ اِس سے بھی اہم بات یہ کہ افغانستان سے اتحادی فوجوں کے محفوظ انخلا کے لیے اُن کا تعاون کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستان میں امریکا کی دوسری ترجیح ایٹمی عدم پھیلاؤ کو یقینی بنانا ہے۔ اُسے خطرہ ہے کہ دہشت گرد کی رسائی جوہری ہتھیاروں تک ہو جانے کی صورت میں بہت بڑی تباہی پھیل سکتی ہے' اِس لیے پاکستان کی مسلح افواج کو اِس کام کی خصوصی تربیت دی جا رہی ہے اور جنرل قدوائی گزشتہ تیرہ برسوں سے کمانڈ اینڈ کنٹرول کے انچارج چلے آ رہے ہیں۔ اِس کی تیسری ترجیح شمالی وزیرستان سے اُٹھنے والی دہشت گردی کا خاتمہ ہے۔ اِس مقصد کے لیے سی آئی اے نے اپنا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کر لیا ہے۔ پاکستان کے اعلیٰ عہدے داروں نے بتایا ہے کہ صدر زرداری کے زمانے میں چار سو امریکیوں کو انٹیلی جنس کلیئرنس کے بغیر ویزے جاری ہوئے تھے جن میں ریمنڈ ڈیوس بھی شامل تھا۔ انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے امریکا پاکستان کا نصاب تبدیل کر دینا اور امریکی کلچر کو فروغ دینا ہے۔ اِس ہدف تک پہنچنے کے لیے شعبۂ تعلیم اور میڈیا میں سرمایہ کاری کی جا رہی ہے۔ اِس کی سب سے اہم ترجیح اِس وقت افغانستان ہے جہاں وہ بارہ سال سے شورشوں میں گھرا ہوا ہے اور ہر سال بیس ارب ڈالر سے زائد اخراجات

KitabPK.Com

اُٹھ رہے ہیں۔ اِس دوران جو دفاعی ڈھانچا قائم ہوا ہے، وہ ناپائیدار معلوم ہوتا ہے' تاہم وہاں سے اتحادی افواج کا انخلا 2014ء کے وسط سے شروع ہو جائے گا اور یہ واپسی پاکستان کی سرزمین سے ہوگی۔ فطری طور پر امریکا کی کوشش یہ ہوگی کہ پاکستان امریکی افواج کے محفوظ انخلا اور اِس کے بعد افغانستان میں امن قائم رکھنے میں بھرپور تعاون کرے۔ اِس کی پانچویں ترجیح یہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں بھارت کو قائدانہ کردار سونپا جائے اور اُسے افغانستان کے معاملات میں بھی دخیل بنا دیا جائے۔ نواز شریف اوباما ملاقات کا جو اعلامیہ جاری ہوا ہے، ان میں انہی ترجیحات کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔

پاکستان کے عوام امریکا کی بنیادی ترجیحات میں غالباً شامل نہیں، البتہ عالمی سطح پر یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ جہالت، بھوک، افلاس، بے روزگاری اور بیماری عالمی امن کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں اور اُن کے سدِ باب کے لیے مؤثر عملی اقدامات کی رفتار تیز کرنا ضروری ہے، چنانچہ اقوامِ متحدہ کے مختلف ادارے انسانی فلاح و بہبود کے بہت سارے کام کر رہے ہیں اور امریکا بھی اپنے طور پر کم پس ماندہ ممالک میں سماجی اور تعلیمی ترقی پر اربوں ڈالر خرچ کر رہا ہے۔ کئی عشروں کے بعد اُسے احساس ہوا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں جس قدر فوج اہم ہے، اسی قدر عوام بھی غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُسے بڑی حیرت ہے کہ وہ جس ملک میں ڈالر خرچ کرتا ہے، وہاں کے عوام اُس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اِس احساس کے تحت اُس نے پاکستان کے لیے 2009ء میں کیری لوگر ایکٹ منظور کیا جس میں پہلی بار عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے فوجی امداد کے مساوی اقتصادی امداد منظور کی گئی۔ اقتصادی امداد کو این جی اوز کے ذریعے بروئے کار لانے سے ایک اور فساد برپا ہوا کہ پچاس فی صد سروس چارجز پر خرچ ہوگئی اور عوام کے حصے میں بہت کم آیا۔ اِس نے امریکی مخالف جذبات کو ہوا دی اور امریکی اسٹیبلشمنٹ نے بعض ایسے اقدامات کیے جن سے پاک امریکی تعلقات میں شگاف پڑتے گئے اور اُن پر نزع کا عالم طاری ہونے لگا۔ سب سے پہلے 2009ء میں دونوں ملکوں کے درمیان انٹیلی جنس شیئرنگ کا سلسلہ ٹوٹا، پھر آئی ایس آئی اور سی آئی اے میں ٹھن گئی۔ اِس کے بعد امریکی اسٹیبلشمنٹ کے ایبٹ آباد آپریشن نے پورے پاکستان میں امریکی مخالف جذبات کا ایک طوفان اُٹھا دیا تھا اور سلالہ چیک پوسٹ پر امریکی فوجیوں کے حملے نے مشترکہ مفادات کی جیومیٹری نذرِ آتش کر ڈالی۔ دو سال سے پاک امریکی تعلقات غیر معمولی کشیدگی کا شکار چلے آ رہے تھے اور قطع تعلق کا ایک ہولناک سناٹا تھا۔

......☆......

پاکستان کے وزیرِ اعظم فقط واشنگٹن تعلقات کے ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑنے گئے تھے' اِس لیے اُنھوں نے گہرے غور و خوض کے بعد مذاکرات کا قومی ایجنڈا ترتیب دیا نہ تازہ دم ٹیم تیار کی۔ وہ تو امریکا میں سفیر نامزد کرنے

میں بھی غیر ضروری لیت و لعل سے کام لیتے رہے۔ اُن کی سفارتی ٹیم اِس قدر کمزور ثابت ہوئی کہ جب وزیرِ اعظم اقوامِ متحدہ سے خطاب کرنے نیویارک گئے' تو وہ امریکی صدر سے ملاقات کا اہتمام نہ کر سکی جبکہ بھارتی وزیرِ اعظم اِسی دورے میں صدر اوباما سے ملے تھے۔ ہماری وزارتِ خارجہ کی نااہلی سے جناب وزیرِ اعظم کو آٹھ دس روز بعد لاکھوں خرچ کر کے دوبارہ امریکا جانا پڑا جبکہ ملاقات کی تاریخ بھی پہلے سے طے نہیں تھی۔ 23/اکتوبر کی دوپہر جناب نواز شریف امریکی صدر سے ملے' یہ تاریخ دراصل برازیلی صدر کے لیے معین تھی' مگر باعزت خاتون صدر نے ملاقات کے لیے آنے سے اِس لیے انکار کر دیا تھا کہ امریکا نے اُن کے فون ٹیپ کیے تھے۔ تب یہ تاریخ آخری وقت میں پاکستانی وزیرِ اعظم کے لیے مقرر ہوئی۔ اِن تمام باتوں سے اپنی نااہلی اور دوسروں کی طرف سے ناقدری کا شدید احساس ہوا۔ حکومت کی بے عملی کے باوجود جناب نواز شریف نے ہر فورم پر پاکستان کا موقف بیان کیا' کشمیر کا مسئلہ اُٹھایا اور ڈرون حملے بند کرنے کا تقاضا کیا' امریکی منڈیوں تک پاکستانی مصنوعات کی رسائی کا مطالبہ بھی داغا اور توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے تعاون کی ضرورت کا احساس بھی دلایا جبکہ اِس امر کا پورا پورا خیال رکھا کہ آبگینوں کو ٹھیس نہ پہنچ جائے کیونکہ بنیادی مقصد سرد مہری کو گرم جوشی میں تبدیل کرنا تھا۔ وہ کچھ لینے کے لیے نہیں بلکہ ٹوٹی ہوئی بات چیت جوڑنے کے لیے گئے تھے۔ اِس میں اُنہیں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ اُن کی ملاقات سے باہمی اعتماد کی فضا پیدا ہوئی ہے اور تجدیدِ محبّت کے اشارے بھی ملے ہیں۔

اعلیٰ سطح کے امریکی عہدے داروں سے ملنے اور جان کیری سے ملاقات کے لیے خود چلے جانے کے نتیجے میں جناب وزیرِ اعظم کو احساس ہوا کہ زیادہ بگاڑ اپنے گھر میں ہے اور بڑی کوتاہیاں ہم سے سرزد ہوئی ہیں۔ اُنہوں نے ایک سچے سیاسی لیڈر کے طور پر کمزوریوں کا اعتراف بھی کر لیا اور اِس عزم کا اظہار بھی کیا کہ ہم پورے سیاسی عمل میں شفافیت لائیں گے اور اپنا گھر درست کریں گے۔ وہ بے ساختگی سے دل کی بات زبان پر لے آئے اور صدر اوباما سے دو گھنٹے تک محو گفتگو رہے اور اُنہیں اپنے ہر سوال اور ہر مطالبے کا جواب ساتھ ساتھ ملتا رہا۔ جناب وزیرِ اعظم نے زور دیتے ہوئے کہا کہ ہم امداد کے بجائے تجارت کا فروغ چاہتے ہیں۔ جواب ملا امریکا آپ کی مصنوعات کا پہلے ہی سب سے بڑا خریدار ہے۔ شکر ہے کسی امریکی عہدے دار نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ وزیرِ تجارت کے بغیر تجارت میں کیونکر اضافہ کر سکیں گے۔ ڈرون حملوں کے بارے میں صاف جواب مل گیا کہ وہ بند نہیں کیے جا سکتے کیونکہ وہ دہشت گردی کے خلاف ایک محفوظ ہتھیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کشمیر کے تنازع میں ثالثی سے بھی معذرت کر لی گئی۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی کے جواب میں شکیل آفریدی کا مسئلہ اُٹھایا گیا جو امریکا کے نزدیک ایک ہیرو کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اِس کے علاوہ مطالبہ کیا گیا کہ ممبئی دہشت گردی میں ملوث جماعت الدعوۃ پر پابندی لگائی جائے اور جناب حافظ محمد سعید گرفتار کیے جائیں۔

KitabPK.Com

......☆......

مذاکرات سے جو حلقے بہت زیادہ توقعات وابستہ کیے ہوئے تھے شاید اُنہیں کچھ مایوسی ہوئی ہو' مگر تعلقات کی بحالی کے حوالے سے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ پہلی بہت اچھی خبر یہ ہے کہ اسٹریٹجک ڈائیلاگ جو ڈیڑھ دو سال سے تعطل کا شکار تھے' اُن کو دوبارہ مارچ 2014ء سے شروع کرنے کا باقاعدہ اعلان ہوا اور ورکنگ گروپس کی نشان دہی بھی کر دی گئی۔ اِن ڈائیلاگ کے نتیجے میں ایک ایسا میکانزم قائم ہو جائے گا کہ اہم شعبوں میں تعاون کا عمل اَز خود بروئے کار آتا رہے گا۔ دوسری اچھی خبر یہ کہ امریکا نے طالبان سے مذاکرات کی حمایت کی ہے جس کی بنیاد پر ہمارے وزیر اطلاعات ونشریات جناب پرویز رشید نے یہ مژدہ سنایا ہے کہ ڈرون حملے بند ہو جائیں گے کیونکہ اگر وہ جاری رہے تو طالبان سے مذاکرات کا سلسلہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکے گا امریکی پالیسی میں یہ اعلان بہت بڑی تبدیلی کا عکاس ہے کیونکہ جب 2006ء جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے وزیرستان میں عسکریت پسندوں کے ساتھ امن کا معاہدہ کیا، تو امریکا نے سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔ یہ تبدیلی کئی اعتبار سے ایک مثبت پیش رفت ہے۔ تیسری اچھی خبر یہ کہ کولیشن اسپورٹ کے 300 ملین ڈالر ادا کر دیے گئے ہیں جبکہ کیری لوگر ایکٹ کے تحت دی جانے والی فوجی اور اقتصادی امداد جو ڈیڑھ ارب ڈالر سے زائد ہے اور دو سال سے رکی ہوئی تھی' وہ بھی جلد ریلیز کر دی جائے گی۔ مشیرِ خارجہ جناب سرتاج عزیز نے یہ خوشخبری بھی دی ہے کہ توانائی کے شعبے کو ترقی دینے کے لیے ایک ارب ڈالر دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ سرکاری خزانے میں ان رقوم کے جمع ہو جانے سے ڈالر سو روپے کی سطح تک آ جائے گا' پٹرولیم مصنوعات کی قیمتیں کم ہوں گی' عوام کا بوجھ یقیناً کم ہو گا اور پوری معیشت پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔ سب سے اچھی بات یہ کہ جناب نواز شریف کا سرکاری سطح پر پُرتپاک خیر مقدم ہوا۔ امریکی اور برطانوی میڈیا نے اُن کے دورے کی مثبت انداز سے کوریج کی اور صدر اوباما نے اِسے دوستی کے ایک نئے باب سے تعبیر کیا۔ صاف نظر آتا تھا کہ امریکا پاکستان کو ایک یٹیجک پارٹنر کی حیثیت سے بڑی اہمیت دے رہا ہے اور اسے محفوظ' پائیدار' خوشحال اور جمہوریت سے تابندہ ملک دیکھنے کا آرزومند ہے۔

دو ملکوں کے تعلقات میں اختلافات بھی اُبھرتے ہیں اور ایک ساتھ کام کرنے کا عزم بھی جھلکتا رہتا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے اور اِس پر بہت زیادہ چیں بہ چیں ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہماری نظر میں ڈرون حملوں کا ایشو ایک بہت حساس معاملہ ہے۔ امریکا ڈرونز کو مستقبل کا ہتھیار سمجھتا ہے کیونکہ اِس کی لڑاکا فوج میدان میں اُترنے سے خوفزدہ ہے۔ اِس تناظر میں اِس کی طرف سے ڈرونز سے کنارہ کشی کا اعلان متوقع نہیں تھا' مگر وزیر اعظم نواز شریف نے جب سے یہ مسئلہ اُٹھایا ہے' امریکا پر عالمی دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون اگست 2013ء میں اسلام آباد آئے' تو اُنہوں نے ڈرون حملوں کو بین الاقوامی قانون کی

سنگین خلاف ورزی قرار دیا تھا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے انہیں جنگی جرائم میں شامل کیا ہے۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ سالِ رواں میں دسمبر تک ڈرون حملے بند یا طویل مدت کے لیے معطل کر دیے جائیں۔ مذاکرات کے بعد اوباما انتظامیہ عالمی دباؤ کا جائزہ لے رہی ہے اور امریکی رائے عامہ کے اندر بھی ایک ارتعاش پایا جاتا ہے۔ اس کا مستقل حل یہ ہے کہ پاکستان ڈرون ٹیکنالوجی حاصل کرے جو اب امریکا کے علاوہ چین سے بھی لی جا سکتی ہے اور وہ خود فیصلہ کرے کہ کون سا ٹارگٹ ہٹ کرنا ہے۔ اِسی طرح ڈاکٹر عافیہ صدیقی بھی امریکا اور پاکستان کے مابین قیدیوں کے تبادلے کے بعد پاکستان کے حوالے کر دی جائیں گی۔ جناب حافظ محمد سعید پر مقدمہ چلانے کا امریکی مطالبہ اِس لیے ناقابلِ قبول ہے کہ پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ نے اُنہیں دہشت گردی کے ہر الزام سے باعزت بری کر دیا ہے۔ ڈاکٹر شکیل آفریدی کا مقدمہ بھی عدالتوں میں چل رہا ہے' اِس لیے اُنہیں امریکا کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ باتیں ہمارے وزیر اعظم اِس لیے بلند آہنگ میں نہیں کہہ سکے کہ اُنہیں بڑی حکمت اور سلیقے سے زخم زخم تعلقات کی رفوگری کرنا تھی۔

......☆......

وزیر اعظم کے امریکی دورے سے یہ تاثر ملا ہے کہ اوباما انتظامیہ پاکستان پر بھارت کا نقطۂ نظر ٹھونسنا چاہتی ہے۔ ممبئی میں دہشت گردی' سرحدوں کے پار عسکریت پسندی' جناب حافظ محمد سعید کی گرفتاری اور جماعت الدعوۃ پر پابندی' یہ وہ مطالبات ہیں جو بھارت سالہا سال سے کرتا آیا ہے اور بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ نے صدر اوباما سے ملاقات کے دوران بھی دہرائے تھے۔ دراصل امریکا کے لیے پاکستان کی غیر معمولی اہمیت کے باوجود اُس نے نئی ریاست کی شدید مشکلات کے ابتدائی مرحلے میں بھی دستگیری کرنے سے اجتناب کیا تھا۔ وزیرِ خزانہ ملک غلام محمد نے دفاعی اور انتظامی ضرورتوں کے لیے جب دو ارب ڈالر امداد کے لیے باقاعدہ درخواست دی' تو وہ مسترد کر دی گئی اور صرف دس ملین ڈالر مہاجرین کی بحالی کے لیے فراہم کیے گئے جبکہ ساٹھ ستر لاکھ کے لگ بھگ لٹے پٹے خاندان قافلوں کی صورت میں آ رہے تھے اور پاکستان کی معیشت ڈگمگا رہی تھی۔ 1948ء میں کشمیر کے مسئلے پر بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ بھڑک اُٹھی' تو پاکستان کی طرف سے امریکی حمایت حاصل کرنے کی کوشش ہوئی' لیکن اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور اُس پر کئی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔

ایک بڑا ملک ہونے کی حیثیت سے بھارت امریکی خارجہ پالیسی میں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ 1962ء میں چین اور بھارت کے مابین جنگ ہوئی' تو امریکا نے بھارت میں اسلحے کے انبار لگا دیے۔ صدر ایوب خاں نے اِس امر پر شدید احتجاج کیا اور امریکا پر الزام لگایا کہ اُس نے خطے میں طاقت کا توازن بگاڑ دیا ہے۔ اِسی حساس مسئلے پر اُن کے امریکا سے تعلقات بگڑنا شروع ہوئے' پھر 1965ء کی جنگ نے معاملہ اور زیادہ بگاڑ دیا۔ امریکا نے

KitabPK.Com

پاکستانی فوج کو اسلحہ کمیونزم کے خلاف لڑنے کے لیے دیا تھا اور جب وہ بھارت کے خلاف استعمال ہوا‘ تو وہ بہت سیخ پا ہوا۔ اُس نے گھمسان کی جنگ کے دوران پاکستان کو اسلحے کی سپلائی بند کر دی اور اُسے فائر بندی قبول کرنا پڑی۔ جنگ کے خاتمے پر صدر ایوب خاں واشنگٹن گئے‘ تو امریکی صدر نے اُن سے بڑی بے دلی سے دو انگلیاں ملائیں اور سارا معاملہ روس کے سپرد کر دیا۔ 1971ء میں وہ مشرقی پاکستان میں داخلی بغاوت کے باعث پاکستان کے کام نہ آسکا‘ لیکن سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد اندرا گاندھی مغربی پاکستان کو بھی زیر کر لینا چاہتی تھی‘ تب صدر نکسن نے روس کے ذریعے بھارت کو یہ پیغام پہنچایا کہ امریکا پاکستان کو پورا تحفظ فراہم کرے گا‘ اِس دھمکی کے بعد سیز فائر کا اعلان ہوا۔ نوے کی دہائی تک امریکا بھارت پر پاکستان کو ترجیح دیتا رہا‘ لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بل کلنٹن نے بھارت میں چھ روز اور اسلام آباد میں صرف چھ گھنٹے قیام کیا۔ صدر اوباما نے دونوں ملکوں کو برابر کی اہمیت دینے کی روایت کو بری طرح پامال کرتے ہوئے بھارت کا دورہ کیا‘ مگر پاکستان کو وعدۂ فردا پر ٹرخا دیا۔ اب اُنھوں نے وزیرِاعظم نواز شریف کی دعوت قبول کر لی ہے اور اُمید ہے کہ وہ دال اور قیمہ تناول کرنے اِدھر بہت جلد آئیں گے۔ امریکی بھارت کو جنوب مشرقی ایشیا کے لیڈر کا درجہ دے رہے ہیں۔

......☆......

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ امریکا جو انسانی آزادیوں اور جمہوری قدروں کا محافظ تھا‘ اب ایک استعماری طاقت کے طور پر دنیا بھر کی تنقید کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ اِس کی خارجہ پالیسی سے توازن اور گہرائی کے بجائے‘ فریب دہی‘ خونخواری اور شہنشاہیت کی بو آرہی ہے‘ لیکن انسانی اور معاشرتی سطح پر امریکا ایک یکسر مختلف ملک ہے۔ اِس امریکا میں دنیا کی بہترین یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے قائم ہیں جن میں لاکھوں مسلمان طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور نئی نئی ایجادات کی تلاش میں ہیں۔ یہاں بڑی تعداد میں ایسے ذہین اور بیدار مغز نوجوان کشاں کشاں آرہے ہیں جن کی آنکھوں میں خواب سجے ہوتے ہیں اور اُن کی عملی تعبیر کے لیے یہاں اَن گنت سہولتیں موجود ہیں۔ فرد کی آزادی اور قانون کی حکمرانی کے ستونوں پر معاشرے کی عمارت کھڑی ہے اور اَن گنت قومیتیں یہاں آپس میں شِیر وشکر ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑی تعداد میں مسجدیں آباد ہو چکی ہیں اور تعلیم و تحقیق کے اسلامی ادارے بڑی تیزی سے شہروں اور قصبات میں پھیل رہے ہیں اور بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دے رہے ہیں۔ بے تکلف اور صاف گو امریکی اپنی اسٹیبلشمنٹ سے یکسر مختلف ہیں۔ امریکا اِس منزل تک سخت آزمائشوں کے بعد پہنچا ہے۔ سیاہ فام آبادی ابھی تک احساسِ کم تری میں مبتلا ہے‘ مگر سیاہ فام اور مسلمان گھرانے میں پرورش پانے والے اوباما کے منصبِ صدارت پر فائز ہو جانے سے امریکی تاریخ میں ایک نیا عہد طلوع ہوا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ امریکا قدرتی وسائل سے مالا مال ہے اور اِس کے سائنس دان درخت اور مصنوعی پتوں سے توانائی حاصل کرنے کی

صلاحیت حاصل کر چکے ہیں۔ ہمیں امریکا سے نفرت کرنے کے بجائے تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے چاہئیں۔ اسلام تو امن اور سلامتی کا درس دیتا ہے جو امریکا میں بڑی سرعت سے پھیلتا جا رہا ہے۔ وہاں کے معاشرے میں وہ تعصب نہیں جو یورپ کی تاریخ اور کلچر میں رچا بسا ہے۔ ہمیں ایسے سکالرز تیار کرنے چاہئیں جو وہاں کے لوگوں سے اُن کے محاورے میں بات کر سکیں۔ سیاہ فام لوگ اسلام کے نظامِ مساوات سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو رہے ہیں۔ ہمیں تعلقات کی پائیدار بنیادیں استوار کرنے کے لیے اِس میدان میں بڑی جاں فشانی سے کام کرنا چاہیے۔ تاریخ میں امامت کا منصب اُسی قوم کے حصے میں آتا رہا جو علم و تحقیق اور تازہ افکار کی دولت میں سبقت لے جاتی رہی ہے۔ فطرت کا یہی قانون آج بھی بروئے کار ہے۔

جناب نواز شریف نے چین اور امریکا کے دورے کے بعد یہ جملے بار بار دہرائے ہیں کہ پہلے ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنا اور اپنا گھر ٹھیک کرنا ہوگا۔ یہی بات وہ بیرونِ ملک بھی کہتے رہے ہیں۔ اُن کا یہ احساس خود احتسابی کا تقاضا کرتا ہے اور زبردست داخلی اصلاحات کا متقاضی ہے۔ گھر درست کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دہشت گردی پر قابو پایا جائے‘ میرٹ اور قانون کی حکمرانی قائم کی جائے‘ انتظامی ڈھانچے کو سیاسی اور ذاتی اثرات سے محفوظ کیا جائے۔ اعلیٰ مناصب پر فرض شناس اور دیانت دار افراد تعینات کیے جائیں‘ یکساں نظامِ تعلیم رائج کیا جائے اور اداروں کے ذریعے بروقت فیصلے کیے جائیں۔ یہ سارے کام پہلا تقاضا یہ کرتے ہیں کہ وزیرِاعظم زیادہ وقت ملک میں گزاریں‘ اپنی سیاسی جماعت کو عوام کی سطح پر فعال بنائیں اور اِس کے ذریعے عوام کو ایک اہم رول ادا کرنے کے لیے تیار کریں۔ وجوہات کچھ بھی ہوں‘ وزیرِاعظم نواز شریف اپنے پانچ ماہ کے دورِ حکومت میں ایک ماہ سے زیادہ ملک سے باہر گزار چکے ہیں اور ہفتے میں ڈھائی دن رائے ونڈ کی فضاؤں میں گم رہتے ہیں۔ اُن کا میڈیا اور اصحاب الرائے سے رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے اور اُن کی فیصلہ سازی کی صلاحیت مدہم پڑتی جا رہی ہے۔ اُنہیں سب سے پہلے اپنے آپ کو درست کرنا ہوگا اور پوری توجہ افغانستان کے مسئلے پر دینا ہوگی۔ اُنہیں امریکا سے دو ڈھائی ارب ڈالر کی امداد پر انحصار کرنے کے بجائے غیر ملکی ماہرین سے یہ تخمینہ لگوانا چاہیے کہ گزشتہ بارہ برسوں میں نیٹو افواج کی سپلائی پہنچانے کے سلسلے میں پاکستان کا جو پورا مواصلاتی نظام اُدھڑ چکا ہے‘ اُس کی تعمیرِ نو پر کتنا خرچ آئے گا۔ یہ تخمینہ کسی طور بھی سوا ارب ڈالر سے کم نہیں ہوگا۔ اِس کی بنیاد پر امریکا سے کامل سنجیدگی اور تیاری کے ساتھ بات چیت کی جانی چاہیے۔ یہ ہم پر جو ساٹھ ارب ڈالر کا قرضہ چڑھا ہوا ہے وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شامل ہونے کا نتیجہ ہے۔ پاکستان کے اِس مطالبے میں عالمی رائے عامہ بھی اِس کا ساتھ دے گی کیونکہ وہ انصاف پر مبنی ہوگا۔ جناب نواز شریف یہ بارگراں اُٹھانے کا حوصلہ اور چیلنجوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ اسی جرأت اظہار نے امریکی قیادت کو متاثر کیا ہے اور پاکستان کو بہت اہم اسٹریٹجک پارٹنر قرار دیا ہے۔

KitabPK.Com

NOTICE INVITING TENDERS.

Sealed tenders based on Standardized Market Rates (amended upto the date of receipt of tenders) are invited for the works mentioned below from the contractors / firms enlisted with C&W Department / W&S Department City District Government, Lahore in the field of **Road Works who have got their names renewed/enlisted for the financial year 2013-14.**

Tender documents can be obtained from the office of Executive District Officer, Works & Services) / **District Officer (Roads Highway City Division No.1 Lahore)** City District Government, Lahore against written request accompanied with attested copies of enlistment / up to date renewal letter and fee receipt, production of valid original **PEC license for the current calendar year, 2013,** authority letter on pad form of the contractor / firm, CNIC of the contractor / Managing partner of the firm alongwith registered power of attorney and for transparency payment of prescribed fee as shown before each work, through a Bank Challan to be deposited in Head of Account "1240 PW Receipt" (District Govt. Account-IV) in favour of **District Officer (Roads-I)** City District Government, Lahore. Tender fee shall not be received in shape of cash.

Tenders will be issued by the aforesaid offices on **07.11.2013** during office hours.

Tendered rates and amounts should be filled in figures, as well as, in words and tender should be signed as per general directions given in the tender documents.

Tenders will be received & opened by the **District Tender Board** City District Government, Lahore in the office of the undersigned on **11.11.2013 at 2.00 P.M.** in the presence of Committee / intending contractors or their authorized representatives who come for same. **If the tenders are not received on 11.11.2013 then the same will be received on 12.11.2013 at 2.00 P.M.**. Tender opening time shall be strictly observed and no extension in receiving time shall be allowed.

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ ستمبر میں دیے گئے اسلامی کوئز کے درست جوابات

اسلامی کوئز 1۔ (الف) قصد کرنا، ارادہ کر کے کہیں جانا (ب) پانچواں

اسلامی کوئز 2۔ (الف) منیٰ کے مقام پر دس ذوالحجہ (ب) تین دن

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ بشریٰ حبیب، کراچی 2۔ ضیا حبیب، فیصل آباد 3۔ سحر ہمدانی، سرگودھا 4۔ رفقہ بتول (جہلم)

درست جوابات دینے والوں کے نام

سدرہ عارف (کراچی) ہشام صابر (ہری پور) فرحت اللہ (ہری پور) حافظ سعید عبداللہ (ہری پور) منور سعید خانزادہ (سکرنڈ) ریحان عقیل (کراچی) راحت عائشہ (کراچی) محمد عدنان اشرف (بہاولنگر) فرحان اشرف (بہاولنگر) عرفان عثمانی (لاہور) مصباح العین نخی رشید اعوان (گوجرانوالہ) ایاز خلیل (حیدرآباد) (اجبال سلیم (حیدرآباد) بشریٰ حبیب (کراچی) طلہ یسین (حیدرآباد) مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد) گلائی (مالاکنڈ) اشتیاق احمد (مالاکنڈ) ثمینہ یاسمین، سعید انس زیدی، سید زید ارشاد، ارشاد علی، ضیا صہیب (فیصل آباد) معاذ احمر، ارشد علی گجر، محمد احتشام (شیخوپورہ) حاکم علی (راولپنڈی) جہانزیب عزیز (شورکوٹ) سحر ہمدانی (سرگودھا) طاہر عنایت (پشاور) رفقہ بتول (جہلم) محمد احتشام ارشد (لاہور)

اسلامی کوئز 1

کعبہ (بیت اللہ) مسلمانوں کا قبلہ، مکہ مکرمہ (حجاز مقدس) میں واقع ہے۔ تورات میں اسے "بیت ایل" کہا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اسے امن کی جگہ قرار دیا ہے۔ یہ مکعب شکل کی ایک عمارت ہے جو مختلف سائز کے بڑے پتھروں سے تعمیر کی گئی ہے۔ 18 فٹ اور عرض 14 فٹ اور اونچائی 35 فٹ ہے۔ اس وقت اس پر چھت بھی ہے۔ تعمیر ابراہیمیؑ میں اس پر چھت نہیں ڈالی گئی تھی۔ اس میں ایک دروازہ ہے جو حرم شریف کی عام سطح سے 7/6 فٹ بلند ہے۔ دورِ نبویؐ میں اس کے دو دروازے ہوا کرتے تھے۔ ایک دروازے کے ذریعے داخل ہوا جاتا تھا اور دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کا راستہ ہوتا تھا۔

(الف) کعبہ کی چوکھٹ کو کیا کہا جاتا ہے؟ (ب) تورات میں خانہ کعبہ کو کیا کہا گیا ہے؟

اسلامی کوئز 2

کفر، کفرانِ نعمت یعنی نعمت کی ناشکر گزاری کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے اور جو شخص اس فعل کا ارتکاب کرے اسے کافر کہا جاتا ہے۔ قرآن کے بیشتر مقامات میں اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو نہ ماننے کو کفر کہا گیا ہے جو وہ اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء اور رسل کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا ہے تاکہ وہ راہِ راست اختیار کریں۔ سورۃ محمد کی آیت 1 میں نبی کریمؐ کی طرف سے پیش کردہ تعلیم و ہدایت کو نہ ماننے کو کفر کہا گیا ہے۔ اسی طرح آیت 8 میں اللہ کے دین کی مدد نہ کرنے کے فعل کو بھی کفر کہا گیا ہے۔

(الف) کفر کے لفظی معنی کیا ہیں؟ (ب) شرک کسے کہتے ہیں؟

انعامات کے لیے تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

منصورہ ملتان روڈ لاہور

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے ورنہ TCS پہنچ نہیں پاتا اور گزشتہ کئی ماہ سے ہمیں TCS واپس مل رہے ہیں۔ **(مدیر اُردو ڈائجسٹ** لاہور**)**

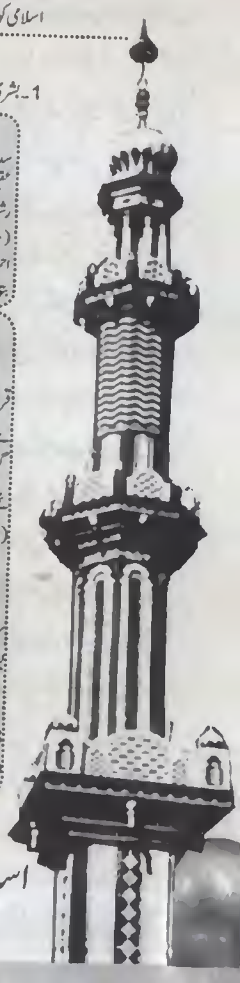

KitabPK.Com

Conditional tender and tenders not accompanied with **Earnest Money i** **shape of deposit-at-call** receipt from schedule Bank and attested copies of registere partnership deed and power of attorney in case of firm will not be entertained. Earnes money to be deposited will be 2%. In case of tendered amount quoted is 5% below or les beyond 5% below of estimated cost, the lowest bidder shall have to deposit performanc security in shape of Deposit-at-call from a schedule bank equivalent to difference of th estimated cost as per standing instructions of Govt. of the Punjab.

Any information / detail of work regarding the tenders mentioned below ca be obtained from the Divisional Head Clerk / Head Draftsman during office time.

Undersigned shall have the right for rejecting any or all of the tenders withou assigning any reason thereof. Issue of tenders will be subject to the policy of Distric Government Authorities regarding measures to ensure progress / quality of works shown t contractors as reviewed from time to time. Acceptance of tenders will also be subject to provisions contained in the B&R Code.

Note: - In case of any typographically mistake, if noticed, the original documents will be referred to.

SR. NO.	NAME OF WORK	APPROVED COST (RS. IN MILLION)	EARNEST MONEY IN RUPEES	TENDER FEE (RS. IN RUPEES)	COMPLETI ON TIME
1.	Re-carpeting of main road Maraka village, UC # 122 Lahore (length=1.40 Km).	10.286	Rs.2,05,718/-	Rs.5143/-	03-months
2.	Rehabilitation/carpeting of road from Ferozepur road to Madhey shah Village length=2.00 Km	14.072	Rs.2,81,440/-	Rs.7036/-	02-months

IPL-10477

District Officer (Roads)
Highway City Division No.1,
Lahore

یہ سب جوہر ہم میں مخفی ہیں اور ہم ان سے بے خبر

خود شناسی

عالمِ اسلام کے ایک صاحبِ علم و بصیرت کی تحریر

وہ یقین رکھتے ہیں کہ اس دنیا کا نظام ہم سے وابستہ ہے اور ہم حقیر وادنیٰ نہیں خوبیوں سے بھرے ہیں

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

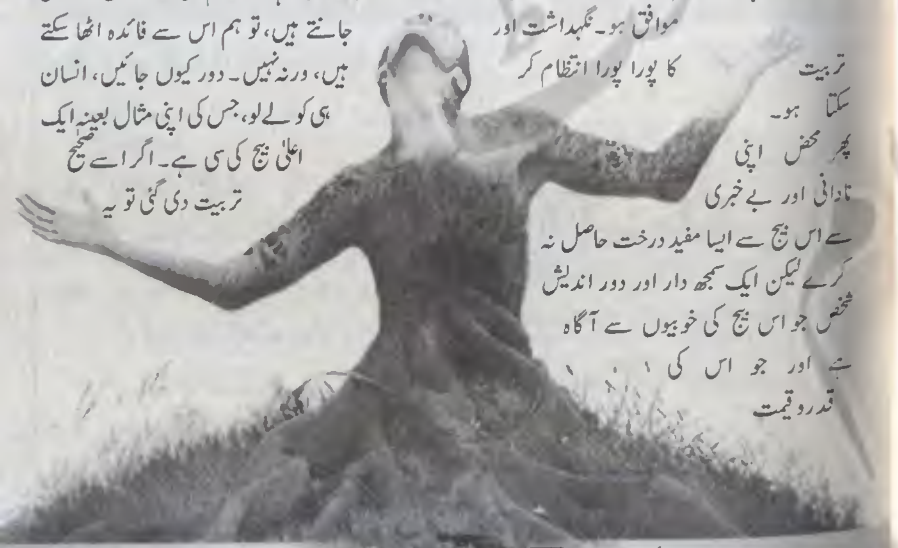

بیج میں مکمل درخت پوشیدہ ہوتا ہے۔ پھل، پھول، تنا، شاخیں غرض سبھی کچھ اس ذرا سے بیج میں مخفی ہے۔ ایک سرسری نظر سے دیکھنے والے کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اس ننھے سے بیج سے اتنا تناور درخت کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ شخص نہایت بدقسمت ہے جس کے پاس اعلیٰ قسم کا بیج ہو۔ زمین اور آب و ہوا موافق ہو۔ نگہداشت اور تربیت کا پورا پورا انتظام کر سکتا ہو۔ پھر محض اپنی نادانی اور بے خبری سے اس بیج سے ایسا مفید درخت حاصل نہ کرے لیکن ایک سمجھ دار اور دور اندیش شخص جو اس بیج کی خوبیوں سے آگاہ ہے اور جو اس کی قدر و قیمت جانتا ہے اسے بوتا ہے، دن رات اس کی رکھوالی کرتا اور انجام کار اپنی محنت کا پھل پاتا ہے۔ وہ نادان شخص جس نے اسے بیکار شے سمجھ کر یوں ہی ضائع کر دیا تھا۔ جب اس قدر عظیم الشان اور مفید خلائق درخت کو دیکھتا ہے، تو حیران رہ جاتا ہے اور دست تاسف ملتا ہے کہ ہائے بدبختی! میں نے کیوں اس بیج سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر میں نے اسے بویا ہوتا، تو میں بھی آج اس شخص کی طرح اس کے پھل سے اس کے پھولوں سے، اس کے سائے اور لکڑی سے متمتع ہوتا۔ میں اکیلا نہیں بلکہ میری آیندہ نسلیں بھی اس سے فائدہ اٹھاتیں۔ لیکن اب جب کہ وقت ہاتھ سے نکل چکا تو کیا ہو سکتا ہے۔

ہم نے ادھر ایک ایسے بیج کی مثال بیان کی ہے جس کی صحیح تربیت سے انسان غیر معمولی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ درحقیقت دنیا کی باقی تمام چیزوں کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ہم کسی شے کا صحیح استعمال جانتے ہیں، تو ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ورنہ نہیں۔ دور کیوں جائیں، انسان ہی کو لے لو، جس کی اپنی مثال بعینہٖ ایک اعلیٰ بیج کی سی ہے۔ اگر اسے صحیح تربیت دی گئی تو یہ

KitabPK.Com

ایسی شان پیدا کرے گا کہ اسے دیکھ کر ایک عالم محو حیرت رہ جائے گا۔ مشکل صرف ایک ہے اور وہ یہی کہ ہم اپنی قدر و قیمت نہیں جانتے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا ہیں اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ پست خیالی اور دون ہمتی ہمیشہ انسان کی سدِّ راہ رہی ہے اور بڑے بڑے ہونہار انھیں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ اپنے سامنے بلند مقاصد تو رکھ لیتے ہیں لیکن جب مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، تو سب کچھ چھوڑ کر ایک طرف ہو بیٹھتے ہیں اور گوشۂ گمنامی میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ انھیں اپنی طاقت پر بھروسا نہیں ہوتا۔ انھیں اس بات کا یقین ہی نہیں آتا کہ استقلال اور پیہم کوشش مخالفت کی سخت سے سخت چٹان کو چور چور کر سکتی ہے۔ لوہے کو پگھلا سکتی اور پانی کو پھاڑ سکتی ہے۔

ایسے مایوس مریضوں کا بہتر علاج تاریخ ہے۔ ان کوتاہ اندیشوں اور کم ہمتوں کو دکھایا جائے کہ بدبختو! جن نامساعد اور ناموافق حالات کی تم شکایت کرتے ہو، جن مخالفین سے تم اپنے آپ کو شب و روز گھرا ہوا پاتے ہو، مصائب کے جیسے سربفلک پہاڑ تمھارے لیے سدراہ ہو رہے ہیں اور جنھیں دیکھ کر تمھاری کمر ہمت ٹوٹ گئی ہے، ان حالات سے بڑھ کر برے حالات اور ان تمھارے مخالفین سے بڑھ کر مخالفین نے تمھارے اسلاف کے جوش عزم کے دریا کا بہاؤ روکنا چاہا تھا لیکن ان ثابت قدمی کے مجسموں نے اپنی ثابت قدمی سے ان تمام مخالفتوں کی ایک کاہ کے برابر پروانہ کی اور سب کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔

وہی مخالفین جو ان کو ایک وقت میں حقیر سمجھتے تھے، ان پر پھبتیاں کستے اور مذاق اڑاتے تھے۔

پرہیز علاج سے بہتر ہے لیکن پرہیز صحیح اور مستند معلومات کے بغیر ممکن نہیں

- کیا آپ اپنی بیماری کی نوعیت کو سمجھنا چاہتے ہیں؟
- شوگر آنکھوں کو کیا نقصان پہنچاتی ہے؟ اس سے بچاؤ کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟
- کیا عینک اُتر سکتی ہے؟
- لیزر سے عینک اُتارنے کا آپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
- کیا آپ کو لیزر لگوانے کا مشورہ دیا گیا ہے اور آپ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ لگوائیں یا نہ لگوائیں؟

ڈاکٹر آصف کھوکھر آئی سرجن
ایم بی بی ایس (پنجاب) ایم سی پی ایس (آئی) ایم اے (علوم اسلامیہ)
Email: drasifkhokhar@hotmail.com

اس طرح کے سوالوں کے جواب اور جدید ترین طریقہ ہائے علاج سے متعلق معلومات کے لیے
مندرجہ ذیل ویب سائٹ کا مطالعہ کریں
www.drasifkhokhar.com
آنکھوں کی بیماریوں سے متعلق اُردو کی واحد ویب سائٹ

جب انھوں نے ان غیر معمولی ہستیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے اور اس قدر مخالفتوں کے باوجود کامیاب ہوتے دیکھ لیا، تو چار و ناچار ان کے گرویدہ، ان کے مداح اور ان کے غلام ہو گئے۔ دنیا میں ایسی ہستیاں بھی گزری ہیں جنھوں نے تن تنہا زمانے کے بہاؤ کو بدل دیا ہے اور اپنی ذات سے ایک مستقل تاریخ کی بنیاد رکھی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی بتاتی ہے کہ ایک مستقل مزاج اکھڑ سے اکھڑ، جاہل سے جاہل اور سرکش سے سرکش قوم کو صرف یہی نہیں کہ راہ راست پر لایا جا سکتا ہے بلکہ انھیں ترقی کی اس بلندی پر پہنچایا جا سکتا ہے کہ آیندہ نسلیں اور مہذب قومیں انھیں اپنے لیے مشعل ہدایت بنائیں۔

سکندر اعظم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس کے بلند ارادے کے سامنے سارے عالم کی وسعت تنگ تھی۔ سارے جہان کو مسخر کر لینا اس کے آگے ایک ادنیٰ کام تھا۔ یہ خالی دعویٰ ہی نہیں بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ اس نے صرف چند سال کے عرصہ میں یہ سب کچھ کر دکھایا اور بمشکل 32 سال کا ہو گا کہ اس دار فانی میں اپنی شہرت اور بقا کی غیر فانی مثال قائم کر کے عالم بقا کو چلتا ہوا۔

نپولین اعظم کو کون نہیں جانتا۔ ایک یتیم بچے نے اپنے ذاتی جوہر سے وہ شان پیدا کی کہ یورپ کی مستحکم ترین سلطنتوں کو ان کی جڑ تک ہلا دیا اور ان کی صدہا سالہ عظمت کو یکسر خاک میں ملا دیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کوئی شے نہیں کہ انسان کے لیے ناممکن ہو۔ کسی نے کہا آگے راستہ میں کوہ الپس پڑتا ہے جس کی چوٹیاں برف سے ڈھک رہی ہیں۔ اس پر سے عبور کرنے کا کوئی راستہ نہیں اس لیے اس راستہ کو چھوڑ دیں۔ کوئی معمولی دل و جگر کا آدمی ہوتا تو یقیناً اپنے ارادے سے باز آتا اور ایسے مشورے کو غنیمت سمجھتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر نپولین بھی اس مشورے پر عمل کرتا، تو پھر وہ نپولین ہی نہ ہوتا۔ اس نے اہل مشیر کے جواب میں صرف اس قدر کہا ع

ڈھونڈ لیں گے یا بنا لیں گے ہم اپنی آپ راہ

طارق افواج لے کر بحیرۂ روم کو پار کرتا ہے۔ جب ساحل اندلس پر اترتے ہیں تو کشتیوں کو آگ لگا دینے کا حکم دیتا ہے۔ فوج حیران ہے کہ یہ کیا نادانی ہے جو بچاؤ اور نجات کا ذریعہ ہے اسی کو اپنے ہاتھ سے تباہ کیا جا رہا ہے لیکن وہ جواں مرد ''طارق'' ان باتوں پر مسکرا دیتا ہے اور تلوار سونت کر ملک میں گھس پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک اسپین میں ''سلطنت مور'' کی بنیاد رکھتا ہے۔

غرض یہ سب ہماری اپنی ذات کی تفسیریں ہیں۔ یہ سب جوہر ہم میں مخفی ہیں۔ لیکن ہم ان سے بے خبر ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمیں یقین دلایا جائے کہ ہم ایک غیر معمولی ہستی ہیں اور دنیا کا نظام ہم سے وابستہ ہے۔ ہم اپنے آپ کو حقیر و ذلیل نہ سمجھیں بلکہ جو جوہر اور جو خوبی اللہ تعالیٰ نے ہم میں ودیعت کی ہے اسے ترقی دیں اور پھر دیکھیں کہ مخالفتیں کس طرح دھواں ہو کر اڑتی ہیں اور کس طرح رکاوٹوں کی سخت چٹانیں روئی کے گالے بن بن کر ہوا ہوتی ہیں۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

(انتخاب: مظہر سلیم مجوکہ)

KitabPK.Com

اے اللہ

میں تیری بے حد شکر گزار ہوں کہ تُو نے مجھے یہ توفیق بخشی کہ میں تیرے سامنے تیرے لیے اپنی محبتوں، چاہتوں، آرزوؤں، تمناؤں کا اظہار کرسکوں۔ اے خدا تو سب سے بلند، سب سے عالی شان بہت مہربان اور رحیم ہے اور سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔ اے اللہ، میرے دل میں تیرے لیے بہت کچھ ہے، مگر جو کچھ بھی ہے وہ تیرے شایان شان نہیں۔ اے خدا میں چاہتی ہوں کہ میں تجھ سے وہ پیار کروں جس کے تو لائق ہے، میں تیری ذات میں گم ہوجانا چاہتی ہوں کہ خود کو بھول جاؤں اور تجھے یاد رکھوں۔

پہلے پہل تیرا نام کب سنا تھا؟ یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ اجنبیت کے ساتھ نہیں سنا تھا۔

جب میں چھوٹی تھی، تو تجھے دیکھنے کی بہت آرزو تھی۔ سنا کرتی تھی کہ قیامت کے دن تُو نظر آئے گا اور میں خواہش کرتی کہ خدا کرے قیامت جلد برپا ہو اور تُو نظر آئے۔ پھر تیرے لیے میرے ذہن میں خود ہی ایک خاکہ سا بن گیا۔ میرے تصور میں تھا کہ ایک سرخ و سفید بابا جی بہت بڑی سفید ڈاڑھی والے، سفید براق کپڑے اور ٹوپی پہنے ہوئے، ایک سبز تخت پر نیم دراز ہیں اور بے شمار لوگ ہاتھ باندھے، سر جھکائے سامنے کھڑے ہیں۔ لیکن بچپن کا معصوم سا

اس اسیری میں مزا آئے تو کچھ بات بنے

دنیا کی سب سے بڑی سچائی سے
ایک معصوم لڑکی کی محبت کا اظہار، بے پناہ
آرزو بڑی ہو تو لفظ لکھے کیوں نہیں جاتے!

روبینہ شاہین

تصور اُس وقت ریزہ ریزہ ہوگیا جب یہ پتا چلا کہ اللہ تو ایک نور ہے۔ تاہم میں مایوس نہ ہوئی، بلکہ ذہن میں ایک اور تصور آگیا کہ ایک جگہ بہت زیادہ روشنی ہے سنہری اور دودھیا سی اور یہ تصور اب بھی قائم ہے۔

دل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ اللہ میاں عرش پر رہتے ہیں اور وہیں سے زمین کو دیکھا کرتے ہیں، لیکن جب پتا چلا کہ اللہ میاں تو ہر جگہ موجود ہیں اور شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں، تو یہ حقیقت میرے لیے بہت ہی پیاری، مگر بہت ہی خوفناک تھی۔ کیونکہ پیار کے ساتھ ساتھ ڈر بھی تو لگتا تھا۔

جیسے جیسے مجھے قیامت، قبر، دوزخ وغیرہ کے متعلق پتا چلتا گیا۔ ویسے ویسے ڈر لگنے لگا اور سوچنے لگی کہ اس دنیا سے کہیں چلی جاؤں، نہ یہاں ہوں گی اور نہ خدا کے سامنے جانا پڑے گا۔ لیکن میں جاؤں گی کہاں؟ ہر جگہ تو خدا موجود ہے، کہیں بھی کوئی راستہ نہیں۔ اس لمحے مجھے اپنی بے بسی پر رونا آتا۔ یہ کیسی قید ہے؟ نہ اس دنیا میں چھوٹ ہے اور نہ آخرت میں گویا۔

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال آتا کہ اللہ میاں نے مجھے اس دنیا میں اکیلا تو نہیں چھوڑا۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ ہے، ہر وقت میری مدد کرنے کو تیار، ہر ضرورت پوری کرنے پر قادر اور اس دنیا اور آخرت میں سزا سے بچنے کے لیے اُس نے قرآن میں تمام طریقے بھی بتادیے ہیں اور جتنا پیار وہ کرتا ہے کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ اب اگر خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کا ارادہ ہے، تو اس میں اللہ میاں کا کیا قصور، وہ تو کہتا ہے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

اے اللہ تیری کائنات کتنی وسیع ہے اور بے شمار مخلوقات ہیں، تو ہر ایک کی ضرورت کا، جذبات کا احساسات کا خیال رکھتا ہے اور دوسرے بے شمار احسانات بھی کرتا ہے اور ان تمام ہنگاموں میں ایک ''میں'' بھی تجھے یاد رہتی ہوں۔ کس قدر خوبصورت حقیقت ہے، یہ تصور کرسکتا ہے کوئی؟

سوچنے کی بات ہے، میں ہوں کیا چیز؟ بے حد گناہ گار، بے حد کمتر، اس دنیا سے نکال دی جاؤں تو ''خس کم جہاں پاک'' والا مقولہ درست ہوجائے، پھر بھی وہ مجھے اس قدر چاہتا ہے، جیسے وہ صرف میرا ہی خدا ہو!

مجھے یاد ہے بہت سال پہلے جب مجھ پر یہ راز فاش ہوا تھا کہ وہ اوروں کا بھی خدا ہے اور دوسروں کے ساتھ بھی ویسا ہی اچھا سلوک کرتا ہے، تو مجھے اُس کی شانِ ربوبیت کا یقین ہوا۔

اے اللہ، تُو نے مجھ پر کیا کیا احسانات نہیں کیے، ہر بڑی سے بڑی نعمت سے نوازا..... اے خدا آج موقع ہے کہ تیری کرم فرمائیوں کا چرچا کروں اور چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں کہ تو مجھے بے انتہا پیار کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری کیا حیثیت ہے اور میں کتنی گناہ گار ہوں! میری معمولی سے معمولی اور بڑی سے بڑی خواہش کو تُو نے پورا کیا ہے۔ ایک بڑا احسان تو یہ ہے کہ تُو نے مجھے اپنے محبوب ﷺ کا اُمتی بنایا۔ کیا کوئی اس احسان کی

KitabPK.Com

وسعت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ کبھی نہیں۔ اے اللہ تیری عنایات کو دیکھتے ہوئے میں اپنے آپ کو خوش نصیب ترین انسان سمجھتی ہوں۔

کہاں میں کہاں یہ مقام، اللہ اللہ

پھر ایک دن قرآن پاک کی چند آیات پر نظر پڑی:

''نہ نیکیوں کا صلہ جلد ملتا ہے اور نہ گناہوں کی سزا۔''

''میں بڑا سخت انتقام لینے والا ہوں۔''

''میں تمہیں ڈھیل دوں گا۔''

ان آیات کا پڑھنا تھا کہ وہ جو ایک معصوم بے پروا سی محبت میرے دل میں تھی چکنا چور ہوگئی...... دل ڈوب سا گیا...... یااللہ، میں تو اپنے گناہوں کو بالکل ہی بھول بیٹھی تھی! مجھے تو خیال ہی نہیں آیا کہ ان تمام نعمتوں کا حق ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ نعمتوں کی برسات کا زمانہ، زمانۂ مہلت کی خزاں بھی، تو ہوسکتا ہے یعنی یہ ساری نعمتیں ''ڈھیل'' بھی تو ہوسکتی ہیں۔ کیا یہ واقعی ''ڈھیل'' ہیں؟ یہ سوال اب مجھے بہت پریشان کرتا ہے۔

یا اللہ، مجھے خیال آتا ہے کہ اگر تو پیار کرسکتا ہے، تو انتقام بھی تو لے سکتا ہے۔ اُف! کہیں دوزخ میرے ہی لیے تو نہیں بنی؟

یا اللہ، میں اتنی گناہ گار کیسے ہوگئی؟ کیا تیرا پیار مجھے گناہوں سے باز نہ رکھ سکا؟

کتنی بُری ہوں میں!!

یا اللہ، مجھے اپنے انتقام سے بچالے۔ یا اللہ، تُو مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ یا اللہ میری تمام التجائیں تیرے ہی سامنے ہیں...... یااللہ اگر تو نے معاف نہ کیا، تو اور کون کرے گا؟ اور تبھی مجھے خیال آیا کہ جیسے میں ایک چھوٹی سی بچی ہوں اور میری امی جان کسی غلطی پر مجھے سزا دے رہی ہیں اور میں مار کے خوف سے امی جان کے ساتھ چمٹ جانے کی کوشش کررہی ہوں۔

یا اللہ، یہی معاملہ تیرے ساتھ بھی ہے...... یا اللہ ہم گناہوں میں تر بتر ہوجاتے ہیں، تو تیری طرف رجوع کرتے ہیں...... اور تو ہمیں معاف فرمادیتا ہے۔ قرآن کی یہ آیات گواہ ہیں:

''اور معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی شاید تم احسان مانو۔''

''میں توبہ قبول کرنے والا رحیم ہوں۔''

''اللہ تمھارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا۔''

اور پھر میری نظروں میں قیامت کا دن گھوم گیا...... میرا اعمال نامہ اللہ میاں کے سامنے ہے۔ اللہ پاک حکم فرماتے ہیں، پڑھ کر سنایا جائے۔ فرشتے کہتے ہیں۔'' اس پر کچھ نہیں لکھا۔ کیونکہ اس نے کوئی نیکی تو کی ہی نہیں اور گناہ آپ نے معاف فرمادیے ہیں۔''

اللہ میاں مسکراتے ہوئے فرماتے ہیں۔'' جاؤ اسے جنت میں لے جاؤ ہم نے اسے بخش دیا۔''

اللہ اللہ، یہ درگزر کی انتہا...... یہ بے نیازی کی ادا...... خدایا! تیرے ہی لیے مخصوص ہے۔

> سوچنے کی بات ہے، میں ہوں کیا چیز؟ بے حد گناہ گار، بے حد کمتر، اس دنیا سے نکال دی جاؤں تو ''خس کم جہاں پاک'' والا مقولہ درست ہوجائے، پھر بھی وہ مجھے اس قدر چاہتا ہے، جیسے وہ صرف میرا ہی خدا ہو!

یا اللہ تیری رحمتوں سے تو امید ہے، لیکن تیری بے نیازی کا ایک رنگ وہ بھی جو ہوش اڑادینے والا ہے...... کیا خبر معمولی نیکی جنت میں یا معمولی گناہ کی وجہ سے دوزخ میں بھیج دی جاؤں!

لیکن اے خدا! میری سوچ جنت اور دوزخ تک ہی کیوں محدود ہے! کیا میرے اچھے یا بُرے کام جنت یا دوزخ کے واسطے ہیں؟ یعنی اگر یہ انعامات میرے سامنے سے ہٹادیے جائیں، تو کیا میں پھر بھی اچھے کام کروں گی؟ اگر کروں گی، تو کس کے لیے؟ یقیناً تیری خوشی کے لیے، تیری رضا کے لیے جو جنت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

جنت تو صرف ایک انعام ہے۔ یعنی جس نے تیری رضا حاصل کرلی، انعام کے طور پر جنت اس کے لیے ہے، لیکن جب کوئی صرف تیری خوشی کے لیے تیرا حکم مانے، تو وہ ایمان کے بہت بلند درجے پر ہوتا ہے...... بس تو نے حکم دیا اور ہم نے مان لیا...... بغیر یہ سوچے کہ نفع ہوگا یا نقصان...... نہ دل میں جنت کی تمنا اور نہ دوزخ کا خوف...... بس یوں سمجھ لیجیے کہ جیسے میری ماں نے مجھے بلایا ہو کہ مٹھائی لے لو، تو میں لپک کر جاؤں، لیکن مٹھائی کے لیے نہیں، ماں کا حکم ماننے کے خیال سے۔

یا اللہ، تیری رضا کا خیال آتے ہی میرے دل میں تیرے فرمائے ہوئے وہ الفاظ گونج جاتے ہیں کہ ''تمھارا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا جب تک تم مجھے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر نہ چاہو۔''

یا خدا! کیا میں واقعی تجھے ہر چیز سے بڑھ کر چاہتی ہوں؟ کبھی خیال آتا ہے کہ اگر اللہ میاں یہ کہیں کہ میری خوشی کے لیے اپنے ماں باپ کو چھوڑ دو، تو کیا میں چھوڑ دوں گی؟ یا یہ کہے کہ اپنی پڑھائی کے اوقات میں سے وقت نکال کر مجھے بھی تھوڑا وقت دیا کرو، تو کیا میں ایسا کروں گی؟ اسی قسم کے بے شمار خیالات دل میں آتے اور پریشان کرتے ہیں۔

یا اللہ! میں چاہتی ہوں کہ ان سب سوالات کا جواب میں مجبوری سے ''ہاں'' کہہ کر نہ دوں بلکہ یہ مجبوری میرا شوق، میرا جنون اور تیری رضا بن جائے اور والہانہ انداز میں لبیک کہوں اور یہ بھی پوچھوں کہ تیری خوشی اور کس بات میں ہے؟ مجھے جلدی سے بتادے:

میں اپنے آپ کو مکمل طور پر تیرے تابع کرنا چاہتی ہوں، لیکن یہ سب کچھ تو عمل کے ساتھ منسلک ہے اور اپنا حال یہ ہے کہ

دل عمل کے لیے ہاں تو کرتا نہیں
اس طرح یاد کرنے سے کیا فائدہ

یا اللہ، بچپن سے سنتی آئی ہوں کہ تیری تعریفیں لکھنے بیٹھو تو اگر تمام سمندروں کی سیاہی بن جائے اور تمام درختوں کے قلم بن جائیں، تو پھر بھی تیری تعریف مکمل نہ ہوگی۔

اور اب مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے ہزاروں برس بھی ملیں، تو تیرے لیے اپنے احساسات قلم بند نہ کرسکوں گی۔ کیونکہ تو بہت...... عظیم ہے۔ سب کا رب اور خالق ہے۔

تیری وسعتوں کے محیط میں تجھے پانا کتنا محال ہے
تری جستجو کو میں چھوڑ دوں کہاں میری اتنی مجال ہے

ooo

KitabPK.Com

دین و دانش

نبی کریم ﷺ جیسا ہے کوئی حاکم!

سید عاصم محمود

وہ ریاست مدینہ کے 10 برس تک حکمران رہے
یہ ریاست ایک شہر سے پھیلتے ہوئے جزیرہ نمائے عرب کے
تمام علاقوں پر محیط ہو گئی تھی، آخری برسوں میں آنحضور ﷺ وہاں کے
ایک طاقتور حکمران تھے۔ یہ اسی طاقتور حکمران کا ذکر دل پذیر ہے

چند روز قبل نظروں سے ایک رپورٹ گزری۔ اس میں درج تھا کہ اسلام آباد میں 120 ایکٹر کے رقبے پر پھیلے ایوان صدر کے سالانہ اخراجات چالیس تا پچاس کروڑ روپے ہیں۔ ظاہر ہے، یہ رقم قومی خزانے سے ادا ہوتی ہے جو قوم کی امانت ہے۔

رپورٹ کی رو سے صدر کے پروٹوکول پر 46 گاڑیاں مامور ہیں۔ نیز ایوان صدر کا روزانہ خرچ تقریباً تین لاکھ روپے ہے۔ اس ادارے پر سالانہ جتنا خرچ اٹھتا ہے، اس سے ہر سال ڈیڑھ لاکھ بچے تعلیم پا سکتے ہیں۔ نیز ہر سال 250 بستروں پر مشتمل ایک نیا ہسپتال کھل سکتا ہے۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ شاہانہ اخراجات ایک ایسے اسلامی ملک کے حکمران پر لگتے ہیں جو بھاری بھرکم قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہاں کروڑوں غریب بستے ہیں۔ مگر قومی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے، بیشتر حکمرانوں نے اقتدار سنبھالتے ہی خود کو وی وی آئی پی کے درجے پر فائز کر دیا۔

بے شک ممکن ہے کہ یہ حکمران دیانت دار اور نیک دل ہوں، لیکن وہ محلات میں رہتے ہیں اور انھیں ہر قسم کی آسائشات زندگی میسر ہوتی ہیں۔ یہ اب زندگی کا چلن بن چکا، اسی لیے لوگ بھی اسے قبول کر چکے۔

یہ چلن صحیح ہے یا غلط، مگر ''وی وی آئی پی'' درجہ حاصل کر لینے کے بعد حکمران خود بخود شاہانہ طرز زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس ضمن میں نبی کریم ﷺ کا طرز عمل کیا رہا؟

آنحضور ﷺ ایک نبی ہی نہیں، حکمران بھی تھے۔ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں ریاست کی بنیاد رکھی

اور دس برس تک اس کے حاکم رہے۔ گو اوائل میں یہ ریاست محض ایک شہر تک محدود تھی۔ وہاں ایسی اقوام بھی آباد تھیں جو رسول اللہ ﷺ کو نبی تسلیم نہیں کرتی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ ریاست کا جغرافیہ وسعت پانے لگا۔ حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب کے تقریباً تمام علاقے اس کا حصہ بن گئے۔ چنانچہ آخری برسوں میں نبی کریم ﷺ ایک وسیع اور طاقتور سلطنت کے حکمران بن چکے تھے۔

کتب سیرت افشا کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حکمران بن کر وی وی آئی پی کلچر سے کوسوں دور رہے۔ اس کے برعکس آپ ﷺ نے معاشرے میں غریبوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے کو ترجیح دی۔

آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے کبھی مسلسل تین دن پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔''

یعنی ہفتے میں دو تین دن فاقہ کرنا آپ ﷺ کا معمول تھا۔

دراصل آنحضور ﷺ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ مسلمانوں میں ایسے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود ہیں جنھیں مشکل سے کھانا دستیاب ہوتا ہے۔ آپ ﷺ عمر بھر کوشش کرتے رہے کہ ان صحابہؓ کی غربت کا خاتمہ ہو جائے اور یہ بھی سعی فرمائی کہ اپنا رہن سہن غریب صحابہ کرامؓ کے مانند رکھیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک بار انھوں نے آپ ﷺ کو بھوکا دیکھا، تو رقت کے مارے رونے لگیں۔ انھوں نے پھر آپ ﷺ سے عرض کیا:

''یارسول اللہ ﷺ! میں آپ کی خاطر اپنی جان دے دوں گی۔ آپ بس یہ کیجیے کہ اپنا معیار زندگی تھوڑا بڑھا لیجیے تاکہ آپ کو بھوکا نہ رہنا پڑے۔''

یہ سن کر سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''میں اس دنیا میں گزری زندگی کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ میرے ساتھیوں میں سے بیشتر اللہ کی راہ میں کہیں زیادہ سختیاں بڑی ثابت قدمی اور صبر سے برداشت کر رہے ہیں۔''

رسول کریم ﷺ کے نزدیک خوشی و مسرت کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں جان دے ڈالے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس دعا سے نوازا۔ ساتھ ہی نئے لباس اور خوشحال زندگی کی نوید بھی سنائی گئی۔

رسول کریم ﷺ کی ایک اور زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: ''جب میں بیاہ کے بعد آپ ﷺ کے گھر آئی، تو میں نے وہاں صرف یہ اشیا پائیں: ''ایک مرتبان جس میں کچھ جو تھے، ایک چکی، مٹی کا ایک برتن، دیگچی اور ایک چوبی پیالہ۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پھر چکی میں جو پیسے، پھر اس کا آٹا گوندھا۔ برتن میں چند کھجوریں موجود تھیں اور پیالے میں تھوڑا سا تیل۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جو کے آٹے، کھجوریں اور تیل ملا کر کھانا تیار کیا۔ اس رات نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی دلھن نے یہی کھانا تناول فرمایا۔

KitabPK.Com

کتب تاریخ وسیر میں ایسے کئی واقعات درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے دانستہ سادہ زندگی بسر فرمائی۔ حالانکہ وہ چاہتے، تو باآسانی کسی حاکم کی طرح پرآسائش زندگی گزار سکتے تھے۔ اس زمانے میں ویسے بھی حاکم مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ لہٰذا کوئی بھی آپ ﷺ کے اس حق کو چیلنج نہ کرتا۔ گو مدینہ میں کئی صحابہ کرامؓ کا شمار مفلسوں میں ہوتا تھا۔

حاکم کی طرح نہیں، تو رسول کریم ﷺ یہ اہتمام ضرور فرما سکتے تھے کہ آپ ﷺ کو تمام ضروری آسائشات زندگی میسر ہوتیں۔ آپ ﷺ یہ امر یقینی فرماتے کہ آپ ﷺ کے اہل خانہ اور خاندان والے کبھی بھوکے نہ رہیں۔ انھیں پہننے، اوڑھنے کو مناسب لباس ملے اور وہ اچھے کھانے کھائیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ازخود غریبانہ طرزِ زندگی اختیار فرمایا۔ سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا تھی؟ حالانکہ نبی کریم ﷺ چاہتے، تو تمام دنیاوی سہولیات و مراعات حاصل کر سکتے تھے، مگر آپ ﷺ نے سادہ زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی۔

دراصل یہ طرز حیات اپنا کر نبی کریم ﷺ تمام مسلمانوں اور آنے والی نسلوں کو اسلام کا یہ عظیم پیغام دینا چاہتے تھے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی بہت کم وقعت رکھتی ہے۔ اس کی آسائشات دراصل ایک امتحان ہیں اور خوشیاں ناپائیدار!

مزید برآں اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ امر کوئی معنی نہیں رکھتا کہ دنیا میں ایک انسان کا معیار زندگی کیا ہے۔ کئی غریب بہت شریف، ایماندار اور دل و جان سے اسلامی قوانین پر عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کئی دولت مند بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور شریف النفس ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر وہ انسان گناہ گار ہے جو متقی اور دین دار نہیں۔

کفار کی محبت

نبی کریم ﷺ نے جب کفار مکہ کو دین اسلام کی طرف بلایا، تو وہ شش و پنج میں پڑ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ ﷺ کیونکر نبی ہو سکتے ہیں، جب کہ آپ ﷺ کھاتے پیتے اور بازار بھی جاتے ہیں؟ لہٰذا آپ ﷺ کس قسم کے نبی ہوئے؟

یہ حقیقتاً ان کا بڑا بودا استدلال تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف جتنے بھی پیغمبر اور نبی نازل فرمائے، وہ سب انسان تھے۔ اسی لیے سبھی عام انسانوں کے مانند کھاتے پیتے، پہنتے اوڑھتے اور بولتے چالتے تھے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھانے پینے، بول چال اور دیگر معاملات میں کس قسم کا معمول اختیار فرمایا؟

یہ دیکھا گیا ہے کہ جن مرد و زن کے سامنے عظیم مقاصد ہوں اور وہ کوئی بڑا کام کرنا چاہتے ہوں، تو عموماً وہ دنیاوی اشیا اور ذاتی ضروریات کو خاص اہمیت نہیں دیتے۔ گو آج کی مادی دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ بیشتر انسانوں کا مطمح نظر زیادہ سے زیادہ آسائشیں پانا بن چکا۔ لیکن نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو مقاصد زندگی سامنے رکھے، وہ ہمیں بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک بار رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صاف ستھرا لباس زیب تن کر رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا ''یہ لباس نیا ہے یا دھو کر پہنا گیا؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ لباس دھویا گیا ہے۔

یہ سن کر سرور کائنات نے آپؓ کو اس دعا سے نوازا ''تمھیں نئے کپڑے نصیب ہوں، اچھی زندگی گزارو اور تم شہادت پاؤ۔''

رسول کریم ﷺ کے نزدیک خوشی و مسرت کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں جان دے ڈالے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو اس دعا سے نوازا۔ ساتھ ہی نئے لباس اور خوشحال زندگی کی نوید بھی سنائی گئی۔

نبی کریم ﷺ کی صحبت میں تربیت پانے کا ہی نتیجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ دنیاوی چیزوں و مسرتوں کو ہیچ سمجھتے اور فکر آخرت کو اہمیت دیتے تھے۔

اب طعام ہی کو لیجیے۔ انسان کے لیے کھانا پینا فطری امر ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان کھانے پینے کو مقصدِ زندگی بنا لے اور اسی کی خاطر جیے مرے۔

اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہمارے سامنے قابل تقلید مثال پیش کرتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے مشکلات سے پر زندگی بسر فرمائی۔ سادہ غذا تناول کرنا آپ ﷺ کا معمول تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا عام مسلمانوں پر زور نہیں دیا کہ وہ غریبانہ زندگی بسر کریں اور نہ بجز حرام اشیا کے، یہ ممانعت فرمائی کہ فلاں ذائقے دار غذا نہ کھائی جائے۔ ہاں غذا کی فراوانی پر آپ ﷺ نے شکر کرنا سکھایا اور بتایا کہ ہر کھانے کے اول و آخر میں اللہ تعالیٰ کے حضور اظہار شکرگزاری کرو۔

کسی کتاب میں یہ درج نہیں کہ کبھی آپ ﷺ نے لذیذ، چسکے دار اور بیش قیمت کھانے کی فرمائش کی یا پسند فرمایا۔

اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے کبھی صحابہ کرامؓ یا عام مسلمانوں پر زور نہیں دیا کہ وہ غریبانہ زندگی بسر کریں اور نہ بجز حرام اشیا کے، یہ ممانعت فرمائی کہ فلاں ذائقے دار غذا نہ کھائی جائے۔ ہاں غذا کی فراوانی پر آپ ﷺ نے شکر کرنا سکھایا اور بتایا کہ ہر کھانے کے اول و آخر میں اللہ تعالیٰ کے حضور اظہار شکرگزاری کرو۔

حضور اکرم ﷺ بہت کم غذا تناول فرماتے اور چند ہی کھجوروں سے آپ کا شکم مبارک بھر جاتا۔ ایک دن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو بتایا:

''آج اناج کے ساتھ بس تھوڑا سا سرکہ ہی ہے۔''

آپ ﷺ نے شاداں ہو کر فرمایا:

''آج اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے خوب پیٹ بھرے گا۔''

اس قسم کا خوشگوار اور مطمئن رویہ آپ ﷺ کا معمول تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عارضی بحران یا ضروریات زندگی کے نہ ہونے سے کبھی پریشان نہیں ہوتے تھے۔

KitabPK.Com

ایک تاریخی مکالمہ

مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے درمیان

رضی الدین سید

مولانا حسین احمد مدنیؒ

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

تحریک پاکستان

تحریک پاکستان کے دنوں میں دارالعلوم دیو بند کی دو بزرگ عالم شخصیات بہت نمایاں ہوئی تھیں جن میں سے ایک مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دوسرے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تھے۔ اتفاق سے دونوں حضرات دارالعلوم دیو بند کے ممتاز اساتذہ بھی تھے۔ تحریک پاکستان کے دنوں میں اس دور کی معروف مذہبی تنظیم ''جمعیت علمائے ہند'' کے دو ٹکڑے ہوئے جن میں سے اول الذکر کی قیادت حسب دستور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے پاس رہی جب کہ دوسرے گروپ ''جمعیت علمائے اسلام'' کی قیادت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے کی۔ تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے معاملے پر ''جمعیت علمائے ہند'' نے قائد اعظم کا ساتھ دینے کے بجائے کانگریس اور گاندھی کا ساتھ دیا جب کہ جمعیت ''علمائے اسلام'' نے کانگریس کے بجائے قائداعظم اور مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مرحوم قائداعظم کے بااعتماد ساتھیوں میں شمار کیے گئے۔ پاکستان کے معاملے میں مولانا کا ساتھ دینے والے دیگر علما میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مفتی محمد شفیعؒ جیسی جید ہستیاں بھی تھیں۔

تقسیم ہند سے قبل یکم محرم 1365ھ (دسمبر 1945ء) میں دارالعلوم دیو بند میں دونوں جید ہستیوں کے درمیان پاک و ہند کے موضوع پر ایک تفصیلی مکالمہ ہوا جس میں مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کے رفقا نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے ''پاکستان کی حمایت کیوں'' پر کئی سوالات کیے۔

تحریک پاکستان کا یہ ایک نادر دلچسپ اور اہم باب ہے جو شاید اس سے قبل اس طرح منظر عام پر نہیں آیا تھا۔

کتابچے کا نام ''مکالمۃ الصدرین'' ہے جسے آل انڈیا جمعیت العلمائے اسلام کے رکن مولانا طاہر احمد قاسمی نے دیو بند سے شائع کروایا تھا۔ اُردو ڈائجسٹ کے لیے اس کے مندرجات کو کراچی سے جناب رضی الدین سید نے روانہ کیا ہے۔

گفت وشنید کی ابتداء کیسے ہوئی؟

یکم دسمبر 1945ء کو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء ہند دہلی اپنی کسی ضرورت سے دیو بند تشریف لائے تھے۔ اس وقت وہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے دولت کدہ پر بھی بغرض عیادت و مزاج پرسی حاضر ہوئے۔ دوران مزاج پرسی، مولانا حفظ الرحمٰن نے علامہ عثمانی سے فرمایا کہ ہمیں آپ سے حالات حاضرہ پر کچھ نیاز مندانہ گزارشات کرنی ہیں۔ مسئلہ پر شرعی حیثیت سے تو ہم آپ سے کیا گفتگو کرتے۔ یہ درجہ تو ہمارا نہیں، البتہ کچھ واقعات ایسے بیان کرنے ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ شاید وہ آپ کے علم میں نہ آئے ہوں۔ ممکن ہے کہ ان واقعات کو سن کر حضرت والا کی جو رائے قائم شدہ ہے اس میں تغیر ہو جائے۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں گفتگو کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔ جب دل چاہے تشریف لائیں۔ مولانا حفظ الرحمن نے فرمایا کہ اس گفتگو میں میرے ساتھ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (ناظم ندوۃ المصنفین دہلی، برادر زادہ علامہ عثمانی) اور کوئی تیسرے صاحب جو مناسب ہوں شریک ہوں گے۔ اس کے بعد 5 دسمبر 1945ء کو مولانا حفظ الرحمٰن کا دہلی سے ایک خط بذریعہ ڈاک بنام علامہ عثمانی موصول ہوا جو بجنسہ درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o

از ندوۃ المصنفین دہلی

27 ذی الحجہ 1364ھ (1941ء)

ذوالمجد والکرم استاذی دام اللہ فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج اقدس۔

کل دیو بند سے نو بجے صبح چل کر دہلی پہنچ گیا، حضرت مولانا حسین احمد سے شب میں گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ وہ جمعیت العلمائے ہند کی ایک خصوصی مشاورت جمعرات کے روز دیو بند بلانا چاہتے ہیں تاکہ جمعیت العلمائے اسلام سے متعلق بعض اہم معاملات پر گفتگو ہو سکے۔ اس مشاورت میں غالباً حضرت مفتی صاحب (مولانا کفایت اللہ صاحب، رسالے: تعلیم الاسلام چھ حصوں کے مصنف، سیّد) اور مولانا احمد سعید بھی شرکت کریں گے۔

میں نے اپنے اس معروضہ کے پیش نظر جو حضرت والا میں حاضر ہو کر پیش کیا تھا اب یہ مناسب سمجھا کہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن اور میں جمعرات کو شب میں پہنچیں اور جمعہ کے دن گزارشات پیش کریں۔ اب میری یہ بھی سعی ہوگی کہ اکابر جمعیۃ العلما بھی اس گفتگو میں حصہ لیں، تو اکابر علمائے دیو بند کے سیاسی افکار کی یکجہتی میں ان شاء اللہ بہت مدد ملے گی۔ اگر میری گزارشات منظور ہو گئیں، تو جمعہ کے دن آٹھ بجے یہ گفتگو آپ ہی کے دولت کدہ پر ہو جائے، تو بہت بہتر۔ باقی اپنی مشاورت تو شب میں اور باقی دوسرے وقت بھی ہو سکتی ہے۔

خادم محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ

27 ذی الحجہ 1364ھ

اس پروگرام کے بموجب 7 دسمبر 1945ء یوم جمعہ کو ساڑھے آٹھ بجے حضرت مولانا حسین احمد

KitabPK.Com

(صدر جمعیۃ العلمائے ہند)، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ (سابق صدر جمعیۃ العلمائے ہند)، حضرت مولانا احمد سعید (سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند)، مولانا حفظ الرحمٰن (حال ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند)، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا عبدالحنان، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن، علامہ عثمانی کے دولت کدہ پر تشریف لائے۔ علامہ عثمانی نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان حضرات سے ملے۔ کچھ دیر مزاج پرسی ہوتی رہی، عیادت کے بعد چند منٹ مجلس پر سکوت طاری رہا۔ یہ خاموشی غالباً اس لیے تھی کہ کون ابتدا کرے اور کس نوعیت سے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہو۔

چونکہ علامہ عثمانی کو ابتدا کرنا مقصود نہ تھا اور یہ حضرات خود تشریف لائے تھے۔ اس لیے علامہ عثمانی بھی خاموش رہے۔ آخر مولانا حفظ الرحمٰن نے مسائل حاضرہ پر گفتگو کا آغاز کیا اور ایک طویل تقریر فرمائی جو تقریباً پون گھنٹا جاری رہی۔ علامہ عثمانی برابر اس تقریر کو بغور سنتے رہے۔ جب وہ تقریر فرما چکے، تو علامہ عثمانی نے فرمایا کہ مجھے پورے الفاظ اور اجزا تو آپ کی لمبی چوڑی گفتگو سے محفوظ نہیں رہے جو تخلیص میرے ذہن میں آئی ہے اس کے جوابات بلالحاظ ترتیب عرض کروں گا۔ اگر کوئی ضروری بات رہ جائے، تو آپ یاد دلا کر اس کا جواب مجھ سے لے سکتے ہیں۔

اس گفت وشنید کا سلسلہ سوا تین گھنٹا مسلسل جاری رہا اس مکالمہ میں سب سے زیادہ حصہ مولانا حفظ الرحمٰن لیتے رہے اور دوسرے درجے میں مولانا احمد سعید ان کے شریک رہے۔ کبھی کبھی کوئی اور صاحب بھی کچھ بول پڑتے تھے لیکن حضرت مفتی کفایت اللہ نے جو مزاج پرسی کے بعد سکوت اختیار فرمایا وہ اختتامِ مجلس تک ختم نہیں ہوا۔ کسی موقع پر بھی ایک حرف نہیں بولے۔

علامہ عثمانی کو اس طویل سکوت پر خود حیرت تھی۔ وہ بحث میں تو کیا حصہ لیتے اشارۃً کنایۃً بھی کسی موضوع پر اثباتاً نفیاً کسی طرح کا اظہار نہیں فرمایا۔ آخر مجلس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کچھ بولے جو تقریباً پندرہ منٹ سے زیادہ نہ تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی تقریر کا خلاصہ

مولانا حفظ الرحمٰن کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کلکتہ میں ''جمعیت العلمائے اسلام'' حکومت کی مالی امداد اور اس کے ایما سے قائم ہوئی ہے۔ مولانا آزاد سبحانی ''جمعیۃ العلمائے اسلام'' کے سلسلہ میں دہلی آئے اور حکیم دلبر حسن کے ہاں قیام کیا جن کی نسبت عام طور پر لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ وہ سرکاری آدمی ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی (سیّد) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم جمعیۃ العلمائے ہند کے اقتدار کو توڑنے کے لیے علماء کی ایک جمعیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے بعد طے ہوا کہ گورنمنٹ ان کو کافی امداد اس مقصد کے لیے دے گی۔ چنانچہ ایک بیش قرار رقم اس کے لیے منظور کر لی گئی اور اس کی ایک قسط مولانا آزاد سبحانی کے حوالہ بھی کر دی گئی۔ اس روپیہ سے کلکتہ میں کام شروع کیا گیا۔ مولوی حفظ الرحمٰن نے کہا کہ یہ اس قدر یقینی روایت ہے کہ اگر آپ اطمینان فرمانا چاہیں، تو ہم اطمینان کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا آزاد سبحانی نے اس کے بعد کلکتہ میں جلسہ کیا۔ جلسہ میں انھوں نے جو کچھ بکواس کی وہ آپ کے علم میں ہے۔ ان کی تلون مزاجی بھی سب کو معلوم ہے۔ ایک زمانہ میں وہ گاندھی کے ساتھ سایہ کی طرح رہتے تھے۔ پھر کچھ دنوں بعد ان کے خلاف ہو گئے۔ بہرحال اس مسلمان افسر کا تبادلہ ہو گیا اور ایک ہندو اس کی جگہ آ گیا۔ جس نے گورنمنٹ کو ایک نوٹ لکھا۔ جس میں دکھلایا گیا کہ ایسے لوگوں یا انجمنوں پر حکومت کا روپیہ صرف ہونا بالکل بے سود ہے۔ اس پر آیندہ کے لیے امداد بند ہو گئی۔ اسی ضمن میں مولانا حفظ الرحمٰن نے کہا کہ مولانا الیاسؒ کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداً حکومت کی جانب سے بذریعہ حاجی رشید احمد کچھ روپیہ ملتا تھا پھر بند ہو گیا۔ اس کے بعد مولوی حفظ الرحمٰن نے پاکستان کی صورت میں جو نقصانات ان کے نزدیک تھے، وہ ذرا بسیط کے ساتھ بیان کیے اور دکھایا کہ مسلمانوں کے لیے نظریہ پاکستان سراسر مضر تھا۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ نے کلام اس قدر طویل کر دیا ہے کہ نمبر وار ہر ایک چیز کا جواب دینا مشکل ہے۔ میں جو کچھ یاد رکھ سکا ہوں ان کے جوابات دوں گا۔ اگر کسی چیز کو بھول جاؤں، تو آپ مجھے یاد دلا کر اس کا جواب لے لیں۔

علامہ عثمانی کا جواب

پہلے میں اس معاملے کی نسبت گفتگو کرتا ہوں جو روایت آپ نے بیان کی، میں نہ اس کی تصدیق کرتا ہوں نہ تکذیب۔ ممکن ہے کہ آپ صحیح کہتے ہوں۔ مجھے اس سے پہلے بذریعہ ایک گمنام خط کے جو دہلی سے ڈالا گیا تھا۔ یہی بتلایا گیا تھا اور مجھے بھی اس خط میں دھمکی دی گئی تھی یہ روایت صحیح ہو یا غلط۔ بہرحال میرے علم میں آ چکی ہے۔ لیکن اس روایت سے مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور میری رائے کیا متاثر ہو سکتی ہے۔ میں نے جو رائے پاکستان کے متعلق قائم کی ہے وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔

''جمعیۃ العلمائے اسلام'' میں آزاد سبحانی رہیں یا نہ رہیں جمعیۃ العلمائے اسلام خود قائم رہے نہ رہے، میری رائے جب بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان مفید ہے۔ اگر میں تھوڑی دیر کے لیے اس روایت کو تسلیم بھی کر لوں کہ جمعیت العلمائے اسلام گورنمنٹ کے ایما سے قائم ہوئی ہے، تو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کانگریس کی ابتدا کس نے کی تھی اور کس طرح ہوئی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ابتداً اس کا قیام ایک وائسرائے کے اشارہ پر ہوا (اور برسوں وہ گورنمنٹ کی وفاداری کے راگ الاپتی رہی ہے، مرتب) بہت سی چیزوں کی ابتدا غلط ہوتی ہے مگر انجام میں بسا اوقات وہی چیز سنبھل جایا کرتی ہے۔ ہم نے مولانا آزاد سبحانی یا جمعیت العلمائے اسلام کی وجہ سے مسلم لیگ کی تائید نہیں بلکہ دیانتاً یہ رائے قائم کی ہے کہ مسلمانوں کا ایک مرکز اور ایک پلیٹ فارم ہونا چاہیے اور علمائے ملت کو اس کی پشت پناہی اور اصلاح میں جدوجہد کرنی چاہیے۔ عام دستور ہے کہ جب کوئی شخص کسی سیاسی جماعت یا تحریک کا مخالف ہو، تو اسی قسم کی باتیں اس کے حق میں مشتہر کی جاتی ہیں۔ دیکھیے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ ہمارے آپ کے مسلم بزرگ اور پیشوا تھے ان کے متعلق لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ ان کو چھ سو روپے ماہوار حکومت کی طرف سے دیے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ گو مولانا تھانویؒ کو اس کا علم نہیں تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے۔ مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ ان کو اس کا شبہ بھی نہ گزرتا تھا۔ اب اسی طرح اگر حکومت مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرے مگر اس کو یہ علم نہ ہو کہ اسے استعمال کیا جا رہا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ شرعاً اس میں ماخوذ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد علامہ عثمانی نے اشارہ کر کے فرمایا کہ ان مولوی عتیق

الرحمٰن سے آپ پوچھیے کہ معاملات دارالعلوم کے سلسلہ دیو بند کے بعض پارٹی باز اشخاص نے ان کے سامنے نہایت قطعی الفاظ میں کیا یہ نہیں کہا تھا کہ وائسرائے کے دفتر میں ہم اپنی آنکھوں سے وہ چٹھی دیکھ کر آئے ہیں جس کے ذریعہ مولانا مدنی کو شبیر احمد عثمانی نے گرفتار کرایا ہے (فَلَعْنَتُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ) لیکن میں پوچھتا ہوں کیا اس میں ذرا بھی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اس پر مولوی عتیق الرحمٰن نے آنکھیں نیچی کر لیں اور خاموش ہو رہے۔ اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ حضرات کے متعلق بھی عام طور پر مشہور کیا جاتا ہے کہ آپ ہندوؤں سے روپیہ لے کر کھا رہے ہیں کیا یہ صحیح چیزیں ہیں۔ اب ہمیں ان سب قصوں سے بالکل علیحدہ رہ کر غور کرنا چاہیے کہ کون سا راستہ اختیار کرنے میں مسلمانوں کا فائدہ ہے اور کس راستے میں ان کا نقصان (قطع نظر اس سے کہ وہ بات انگریز کے ایجنٹ کی زبان سے نکلے یا کوئی ہندو کا دلال کہے۔ مرتب)

لہٰذا اب میں مزید گفتگو سے پہلے تین چیزیں دریافت کرنا چاہتا ہوں؟

گفتگو کا محور

پہلی چیز دریافت طلب یہ ہے کہ جو فارمولا جمعیۃ العلمائے ہند نے پاکستان کا نعم البدل ظاہر کر کے ملک کے سامنے پیش کیا اور جس کا حوالہ مولانا حفظ الرحمٰن نے اپنی تقریر میں بھی دیا ہے اس فارمولا کو آپ حضرات نے کم از کم کانگریس سے منوالیا ہے یا نہیں؟

مولانا حفظ الرحمٰن نے اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے کچھ اعذار بیان کیے۔ علامہ عثمانی کو چونکہ ان اعذار سے کچھ بحث نہیں تھی اس لیے فرمایا کہ اعذار کچھ بھی ہوں میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا فارمولا کانگریس نے تسلیم کر لیا ہے یا نہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے فرمایا کہ ہمارا یہ اصول نہیں ہے کہ ہم جنگ آزادی کی شرط کے طور پر ہندوؤں سے کوئی چیز منوائیں۔

دوسری بات یہ کرنی ہے کہ آپ جو کچھ گفتگو اس وقت مجھ سے فرمانا چاہتے ہیں وہ کس تقدیر پر ہے۔ آیا یہ فرض کرتے ہوئے کہ انگریز حکومت ہندوستان سے چلی گئی ہے یا جا رہی ہے۔ یا یہ مان کر ابھی وہ موجود ہے اور سردست جا نہیں رہی۔ گویا جو کچھ لینا ہے اسی سے لینا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے فرمایا کہ یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ انگریز حکومت ابھی ہندوستان میں موجود ہے۔ اس کی موجودگی تسلیم کرتے ہوئے جو کچھ لینا ہے اسی سے لینا ہوگا۔

تیسری بات دریافت طلب یہ ہے کہ آپ حضرات جو انقلاب اس وقت چاہتے ہیں وہ فوجی انقلاب ہے یا آئینی؟ اس کا جواب دیا گیا کہ فوجی انقلاب کا تو اس وقت کوئی موقع ہی نہیں نہ فی الحال اس کا امکان ہے نہ اس کے وسائل مہیا ہیں۔ اس وقت تو آئینی انقلاب ہی زیر بحث ہے۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ بس اب بحث کا رخ متعین ہو گیا۔ اب کلام اس پر رہے گا کہ سردست انگریزی حکومت کی موجودگی کے باوجود آئینی انقلاب میں کون سا راستہ مسلمانوں کے لیے مفید ہے۔ آیا وہ راستہ جو جمعیۃ العلمائے ہند نے تجویز کیا ہے یا پاکستان کا راستہ جو مسلم لیگ اختیار کر رہی ہے۔

پاکستان کے نقصانات کا اظہار

مولانا حفظ الرحمٰن نے اپنی طویل تقریر میں فرمایا

کہ پاکستان قائم ہونے میں مسلمانوں کا سراسر نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے۔ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت 53 فیصد ہے فلاں صوبے میں اس قدر، فلاں میں اتنی اور آسام میں اکثریت دوسروں کی ہے۔ ہر جگہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں غیر مسلم اقلیت اتنی زبردست ہے کہ مسلمان اس سے کسی طرح بھی عہدہ برآنہ ہو سکیں گے اور بہت ہی تھوڑی اکثریت کچھ نہ کر سکے گی۔ بلکہ ہمیشہ معرض خطر میں رہے گی۔ ادھر مسٹر جناح یہ کہہ ہی چکے ہیں پاکستان میں جمہوری طرز کی حکومت ہو گی۔ ایسی مشکل میں ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو پاکستان سے کوئی بھی فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ تنظیم، دولت اور تعلیم میں پست ہونے کی وجہ سے 53 فی صد مسلمانوں کی اکثریت 47 فی صد غیر اقلیت ہی کے عملاً تابع و محکوم رہے گی۔ سکھ نہایت جنگجو قوم ہے وہ کسی طرح بھی پاکستان قائم نہ رہنے دے گی۔ ادھر جاٹوں کی قوم ہے وہ بھی مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔

اس موقع پر علامہ عثمانی نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک پاکستان کا مطالبہ کرنے والے صوبہ وار چھے پاکستان بنانا چاہتے ہیں۔ یا تمام مسلم اکثریت والے صوبوں کا ایک پاکستان مطلوب ہے؟ جواب دیا گیا کہ نہیں پاکستان تو ایک ہی بنانا چاہتے ہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا تب صوبہ جاتی اعداد کی گفتگو اس موقع پر بے کار ہے۔ مولانا عثمانی نے فرمایا کہ اس وقت ہم کو پاکستان کی مرکزی حکومت میں یہ دیکھنا چاہیے کہ مسلم اور غیر مسلم آبادی میں کیا تناسب ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی طرف سے کہا گیا کہ پاکستان میں مجموعی تعداد مسلمانوں کی چھ کروڑ ہو گی اور غیر مسلم تین کروڑ ہوں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ تعداد غلط ہے۔ مجموعہ میں مسلمان تقریباً سوا سات کروڑ ہیں۔ لیکن ہم سات کروڑ تسلیم کیے لیتے ہیں اور غیر مسلم جو تین کروڑ سے کم ہیں ان کو پورے تین کروڑ کر لیا جائے۔ اس تعداد سے سات اور تین کی نسبت مسلم و غیر مسلم کے درمیان ہو گی اور مجموعی آبادی میں آپ کے فرمانے کے مطابق ساٹھ اور چالیس کی نسبت ہو گی یعنی مسلمان ساٹھ فی صد اور غیر مسلم چالیس فی صد ہوں گے۔ (حالانکہ اس صورت میں مجموعہ مسلمان ستر فی صد اور غیر مسلم تیس فیصد ہوتے ہیں)

حضرت علامہ کا مسکت اور حقیقت افروز جواب

مگر علامہ عثمانی نے اس وقت بھی اغماض کر کے اور ان کے ہی بیان کردہ تناسب کو صحیح مان کر اس پر کلام فرمایا، آپ نے کہا کہ اب آپ اپنے فارمولا پر نظر ڈالیے کہ اس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا مرکزی حکومت میں کیا تناسب رہتا ہے؟ تو آپ کے فارمولے کی رو سے مرکز میں چالیس مسلمان ہوں گے اور چالیس ہندو اور بیس فی صد میں دیگر اقلیتیں ہوں گی۔ اس طرح سے آپ کے فارمولا کے لحاظ سے غیر مسلموں کی تعداد ساٹھ فیصد اور مسلمانوں کی تعداد چالیس فی صد ہوئی اور مسلم لیگ کے پاکستانی فارمولا میں (بقول آپ کے یہی نسبت علی العکس ہو گی) یعنی ساٹھ فی صد مسلمان اور چالیس فیصد غیر مسلم ہوں گے۔ حالانکہ حقیقی تناسب پاکستانی فارمولا میں ستر فیصد کا ہوتا ہے۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ آپ کے اس فارمولا سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا؟ (ہم اگر ساٹھ فیصد رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے، تو چالیس فی صد میں کیا کر سکیں گے۔)

نوٹ: جمعیۃ العلما کے فارمولا میں بھی مندرج ہے کہ خالص اسلامی مسائل میں دوتہائی مسلمان اگر کسی چیز کے مخالف ہوں گے، تو وہ چیز مسلمانوں کے لیے قبول نہیں کی جائے گی۔ اس شرط سے کسی درجہ میں مضر امور کا تدارک ہوسکتا ہے۔ لیکن باقی مسلمانوں کے حق میں جو ضروری یا مفید امور ہوں ان کے خاطر خواہ حاصل ہونے کی کوئی تدبیر نہیں کیوں کہ مرکز میں مسلم تعداد چالیس اور غیر مسلم تعداد ساٹھ فیصد ہوگی۔ ایسی تمام تجاویز غیر مسلم اکثریت کے رحم وکرم پر رہیں گی اور یہ معاملہ بھی کہ خالص اسلامی مسئلہ کون سا ہے۔ (اکثریت ہی فیصلہ کرے گی)

پاکستان ہندوؤں کے مفاد میں ہے، تو وہ اس کے مخالف کیوں ہیں؟

اس موقع پر کہا گیا کہ عیسائی ہمارے ساتھ ہوجائیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ جب پاکستان کا فارمولا سامنے آتا ہے، تو عیسائی مسلمانوں سے علیحدہ غیر مسلم بلاک میں شمار کیے جاتے ہیں اور جب جمعیۃ العلمائے ہند کا (مقدس) فارمولا پیش کیا جاتا ہے، تو وہی عیسائی گویا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوجاتے ہیں اور مسلمانوں کی طرف شمار کیے جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ غیر مسلم سب کے سب بہرصورت ایک ہی شمار ہوں گے۔ (الکفر ملۃ واحدۃ) اور خالص مسلمانوں کو ان سب کے مقابل رکھ کر مسئلہ پر غور کرنا چاہیے۔ وفد جمعیۃ العلمائے ہند نے آخر کار اس کو تسلیم کرلیا۔

اگر پاکستان ہندو کے لیے مفید ہے، تو وہ اس کی مخالفت کے لیے اس قدر مضطرب کیوں ہے؟

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ کا یہ دعویٰ کہ پاکستان قائم ہونے میں سراسر مسلمانوں کا نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے۔ اگر تسلیم کرلیا جائے، تو کیا آپ باور کرسکتے ہیں کہ ہندو پاکستان کی مخالفت محض اس لیے کررہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کا نقصان ہے اور وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کا نقصان دیکھنے کو تیار نہیں۔ ان کا تو اعلان یہ ہے کہ جو جماعت یا جو شخص بھی پاکستان اور مسلم لیگ کے خلاف کھڑا ہوگا کانگریس اس کی ہر طرح امداد کرے گی۔ (اس وعدہ کا تعلق کسی شخص خاص سے نہیں، کانگریس کے پورے ادارے سے ہے) اور ان کا قول ہے کہ پاکستان ہماری لاشوں پر ہی بن سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر یہ پرزور اور انتہائی مخالفت کیوں ہے؟ اس کے جواب میں مولانا حفظ الرحمٰن نے فرمایا ان کی کوئی مصلحت ہوگی۔ لیکن اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا۔ اور بار بار اس پہلو سے گریز کیا جاتا رہا۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس کی جو کچھ بھی مصلحت ہو آخر آپ حضرات نے بھی کچھ غور کیا کہ وہ مصلحت کیا ہوسکتی ہے؟ میرے نزدیک تو اس کی مخالفت کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ انگریز کی حکومت تو سردست اوپر قائم ہے جسے آپ خود شروع میں تسلیم کرچکے ہیں۔ ہندو یہ چاہتا ہے کہ انگریزی حکومت کے زیرسایہ دس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک شخص کی گردن پر سے بھی ہندو اکثریت کا جوا کبھی اور کہیں اترنے نہ پائے۔ اور اس طرح مسلمان ہمیشہ انگریز اور ہندو کی ڈبل غلامی میں بااختیار خود پستے رہیں۔ علامہ عثمانی نے کئی بار اس چیز کو ان لوگوں سے پوچھا مگر ادھر سے کوئی شافی جواب ہاتھ نہ آیا۔ اس کے بعد جمعیۃ العلمائے ہند کے وفد کی طرف سے کہا گیا کہ اچھا اگر پاکستان بن

جائے، تو تین کروڑ کی مسلم اقلیت ہندوصوبوں میں رہے گی۔ اس کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا؟ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ ان کے لیے معاہدات کے ماتحت مسلم اقلیت ان کے ہاں اور ہندو اقلیت ہمارے یہاں رہے گی اور ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کے تلے دبا رہے گا۔ آخر اکھنڈ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمانوں کی حفاظت کس طرح ہوگی۔ اس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا احمد سعید نے موضع گفتگو بدل کر کہا۔

''اجی حضرت یہ علی گڑھ کے نیچری علما کے وقار کے دشمن ہیں۔ یہ لوگ اگر مسلمانوں کے راہنما بن گئے، تو دین کو برباد کردیں گے۔ علما کو مٹادیں گے۔ اسی سلسلہ میں اِن بدتمیزیوں کا بھی ذکر کیا گیا جو بعض مقامات میں مولانا حسین احمد کے ساتھ کی گئی تھیں۔ اسی سلسلہ میں بھی کہا کہ مسلم لیگ راجاؤں، نوابوں، خطاب یافتہ لوگوں کی جماعت ہے۔ سر فیروز خان نون کے متعلق فرمایا کہ وہ حکومت کے اشارے سے مستعفی ہوکر مسلم لیگ میں شامل ہوئے ہیں اور وہ کھلے طور پر سرکاری آدمی ہیں۔''

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ سر فیروز خان نون کے متعلق میں بحث نہیں کرتا۔ آپ جو چاہیں کہیں لیکن مسٹر جناح کے متعلق کبھی میرا یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ وہ سرکاری آدمی ہیں یا وہ کسی دباؤ یا لالچ میں آسکتے یا کسی قیمت پر خریدے جاسکتے ہیں۔

مولانا سعید احمد کے اس کہنے پر کہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور دوسرے بعض فرقے علما کا اقتدار مٹانا اور دین کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ عثمانی نے ارشاد فرمایا یہ جو مشکلات ہوئیں ان کا حل آپ کے ذہن میں کیا ہے؟ کچھ آپ بھی تو فرمائیے! اس پر سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اور کچھ دیر خاموشی سی طاری ہوگئی۔ پھر وفد کی طرف سے کہا گیا کہ حضرت آپ ہی فرمائیں کیا حل ہے؟ حضرت علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ خوب رہی مشکلات تو بیان فرمائیں آپ اور حل بتاؤں میں؟ آخر آپ نے بھی تو کچھ اس کا حل سوچا ہوگا؟

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اچھا لیجیے میں ہی اس کا حل عرض کرتا ہوں میرے نزدیک اس کا حل صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ آپ سب حضرات مل کر مسلم لیگ میں شامل ہوکر اس پر قبضہ کریں۔ ایک دو مہینے دورہ کرکے تین چار لاکھ آنے والے ممبر مسلم لیگ کے بھرتی کرائیں۔ جب ہمارے ہم خیال ممبران کی اتنی بھاری تعداد مسلم لیگ میں شامل ہوجائے گی، تو پھر ہم عوام کے ذریعے جو مفید صورت مسلمانوں کے لیے ہوگی باآسانی بروئے کار لاسکیں گے۔ کیا ہمارا اثر عوام پر اتنا بھی نہیں کہ ہم دو چار لاکھ ممبران بھرتی کراسکیں۔ میں اِس کے لیے تیار ہوں کہ آپ حضرات کے ساتھ مل کر اس کام میں حصہ لوں۔ میرے نزدیک تو اصلاح کی یہی بہترین شکل ہے۔ اس پر مولانا احمد سعید نے فرمایا کہ یہ تو صحیح ہے لیکن جب ہم لوگ ایسا کریں گے، تو یہ راجے، مہاراجے، نواب اور سر، مسلم لیگ سے علیحدہ ہوکر دوسری جماعت بنالیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اگر وہ نئی مسلم لیگ بنالیں گے، تو اس سے کیا ہوگا۔ عوام کی طاقت تو ہمارے ہی ساتھ رہے گی۔ سر شفیع مرحوم نے بھی تو ایک زمانے میں شفیع لیگ بنائی تھی لیکن اس کا حشر کیا ہوا۔ جب شفیع صاحب رحلت کر گئے، تو ان کے ساتھ ہی ان کی لیگ بھی ختم ہوگئی اور

رابطہ عوام وہ کبھی پیدا نہ کر سکے۔

رہا ان بدتمیزیوں کا قصہ جو آپ کے ساتھ ہوئیں۔ اس کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ میں نے جو پیغام جمعیت العلما اسلام کے اجلاس کلکتہ کے موقع پر بھیجا تھا اس میں صاف طور پر لکھ دیا کہ پرلے درجے کی شقاوت وحماقت ہے کہ قائداعظم کو کافر اعظم کہا جائے یا مولانا حسین احمد وغیرہ کے ساتھ کوئی ناشائستہ سلوک کیا جائے۔

اس موقع پر مجھے ایک بات کہنی پڑتی ہے وہ یہ کہ جن انگریزی خواں طلبا کے رویہ کی آپ شکایت فرما رہے ہیں وہ نہ تو آپ کے مرید ہیں نہ شاگرد۔ نہ انھوں نے کسی دینی ماحول میں تربیت پائی ہے۔ (اور سمجھتے یہ ہیں کہ آپ مسلم قوم کو ہندوؤں کی دائمی غلامی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں)، اس کے بالمقابل جو عربی مدارس کے طلبا آپ کے شاگرد آپ کے مرید اور دینی ماحول بلکہ مرکز دین واخلاق میں تربیت پانے والے ہیں۔ ذرا ادھر بھی تو دیکھیے کہ انھوں نے اس کا بھی کوئی تدارک کیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے تمام مدرسین، مہتمم اور مفتی سمیت (باستثنا ایک دو کے) بالواسطہ یا بلا واسطہ مجھ سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے طلبا نے میرے قتل تک کے حلف اٹھائے اور وہ، وہ فحش اور گندے مضامین میرے دروازے میں پھینکے کہ اگر ہماری ماں بہنوں کی نظر پڑ جاتی، تو ہماری آنکھیں شرم سے جھک جاتیں۔ کیا آپ میں سے کسی نے بھی اس پر ملامت کا کوئی جملہ کہا۔ بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے لوگ ان کمینہ حرکات پر خوش ہوتے تھے۔ ''حریت'' اخبار دہلی آج کل میری ذاتیات پر نہایت رکیک مضامین لکھ رہا ہے کیا آپ حضرات میں سے کسی نے اس پر بیزاری کا اظہار کیا؟ اس پر سب کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔ مولانا سعید نے اتنا فرمایا کہ اجی حضرت عزیز حسن بقائی تو ہمیشہ اسی قسم کی بے ہودہ بکواس کیا کرتا ہے کیا آپ کو معلوم نہیں؟ علامہ عثمانی نے فرمایا اس وقت تو وہ آپ کی حمایت اور ہمنوائی میں سب کچھ کہہ رہا ہے۔ گو مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک زمانہ میں اس نے آپ صاحبان کو بھی بری طرح مجروح کیا تھا۔ لیکن دکھلانا صرف یہ ہے کہ آپ حضرات نے کبھی اس قسم کی چیزوں سے جو ہمارے متعلق کہی گئیں اظہار بیزاری نہیں کیا نہ کسی پر ملامت کی۔ ہم نے تو یہ کیا کہ موقع ملنے پر ایسے امور سے پوری قوت کے ساتھ اظہار بیزاری کرتے رہے۔

محلہ کسرول مراد آباد کے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ مولانا حسین احمد اور مفتی کفایت اللّٰہ آپ کے نزدیک محض ذاتی مفاد کے لیے ہندوؤں کا ساتھ دے رہے ہیں یا ان کا اجتماع بے دینی اور کفر ہے، یا وہ اپنے استاد کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ میرے حاشیہ خیال ہی میں یہ نہیں آ سکتا کہ یہ حضرات کسی ذاتی مفاد کے لیے ایسا کریں گے۔ وہ اپنے نزدیک جو حق سمجھتے ہیں کر رہے ہیں اور اسی کو اپنے استاد کا مسلک سمجھتے ہیں۔ باقی یہ لازم نہیں کہ جو ان کا خیال ہے وہ واقعی میں صحیح ہو۔ نہ ان کی تقلید دوسروں پر واجب ہے۔ امور مذکورہ کا تذکرہ میں نے اس لیے نہیں کیا کہ مجھے کوئی انتقام لینا مقصود ہے۔ میں بہر طور ایسے امور کو بُرا سمجھتا ہوں۔ دکھلانا صرف یہ ہے کہ ہم نے اپنی بساط کے موافق اس قسم کے امور کو روکنے کی ہمیشہ سعی کی۔

مولانا مدنی کا ایک استدلال اور اس کا مسکت جواب

آخر گفتگو میں مولانا حسین احمد نے اپنی جیب سے دو تین کالم کا ایک مضمون نکال کر تقریباً دس منٹ تک پڑھ کر سنایا۔ یہ مضمون ایک انگریز کی تجویز اور رائے پر مشتمل تھا جس میں اس نے ہندوستان کی سیاسیات پر بحث کرتے ہوئے حکومت برطانیہ کو اس کا ایک حل بتلایا تھا۔ اس مضمون میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور بمبئی کے بجائے کراچی کو تجارت کا مرکز بنایا جائے۔ گویا اس مضمون کو سنانے کی غرض یہ تھی کہ مسلم لیگ نے جو نظریہ پاکستان پیش کیا ہے وہ اس انگریز کی تجویز پر مبنی ہے اور مسلم لیگ انگریزوں کے اشاروں پر چلنے والی جماعت ہے۔

مولانا احمد سعید نے سوال کیا کہ انگریز کی پالیسی ٹکڑے کرنے کی ہے یا جمع کرنے کی۔ یعنی اس کا فائدہ کس جانب میں ہے؟ مطلب یہ تھا کہ ہم جو وفاقی حکومت چاہتے ہیں انگریز کے لیے مہلک ہے اور آپ جو تقسیم ہند چاہتے ہیں یہ صورت حکومت کے لیے مفید و معین ہے۔ علامہ عثمانی نے ارشاد فرمایا کہ میرے نزدیک آپ کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔ یعنی آپ کے سوال کے جواب میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انگریز کا فائدہ ہمیشہ ٹکڑے کرنے میں ہے یا نہیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ کبھی انگریز کا فائدہ ٹکڑے کرنے میں اور کبھی جمع کرنے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک حالیہ نظیر ملاحظہ فرمائیے۔ برطانیہ نے ترکی اور عرب کے ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ عراق، شام، لبنان، نجد، یمن سب کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک وقت میں پالیسی یہ تھی اب جو عرب لیگ قائم ہو رہی ہے جس میں تمام عربوں کو روس کے خطرہ سے انگریز متحد کرنا اور ان سب کا ایک بلاک بنانا چاہتا ہے۔ کیا یہ بھی آپ کے نزدیک انگریز کے اشارے سے نہیں ہو رہا جس کا منشا یہ ہے کہ تمام عرب ممالک کی ایک آہنی دیوار بنا دی جائے۔ اس کو وفد نے تسلیم کیا کہ بیشک علامہ عثمانی نے فرمایا کہ پھر یہ کہنا صحیح نہیں کہ انگریز کی پالیسی ہمیشہ ٹکڑے کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ کبھی اس کی پالیسی جمع کرنے کی بھی ہوتی ہے۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارا فائدہ کس صورت میں ہے خواہ اس میں حکومت کا فائدہ ہو یا نقصان ظاہر ہے کہ ہندو یا مسلمان کسی کے مقابلے میں بھی گورنمنٹ اپنے مفاد کو بااختیار خود نظرانداز نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ مولانا حسین احمد نے جو ایک انگریز کا مضمون پڑھ کر سنایا یہ ایک انگریز کی شخصی رائے اور تجویز ہے۔ جو آج سے چودہ برس پہلے اسے پیش کی گئی تھی لیکن حکومت برطانیہ کا سب سے بڑا نمایندہ وائسرائے ہند لارڈ ویول جو ہندوستان پر اس وقت حکمران ہے اس نے اپنی تقریروں میں برملا یہ کہا کہ اس ملک کا مرکز اور اس کی حکومت ایک ہی رہنی چاہیے اس ملک پر کوئی بڑا عمل جراحی نہیں ہو سکتا۔ پہلی مرتبہ یہ تقریر کلکتہ کے کامرس چیمبر میں کی۔ دوسری مرتبہ لیمپس لیچر میں یہی مضمون ادا کیا اور ابھی دو تین ماہ ہوئے کہ راولپنڈی کے دربار میں لارڈ ویول نے یہی کہا کہ اس ملک کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس سے پہلے سابق وائسرائے لارڈ لنتھگو نے بھی 42ء میں اس قسم کی تقریر کی تھی۔ اب آپ حضرات غور فرمائیں کہ آج وائسرائے ہند کے نظریے کی حمایت کانگریس کر رہی ہے یا مسلم لیگ۔

مولانا احمد سعید نے فرمایا کہ اجی حضرت یہ تو انگریزوں کی چالیں ہیں۔ کہتے تو کچھ ہیں کرتے کچھ

ہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس انگریز کی تجویز میں بھی تو یہی احتمال ہو سکتا ہے۔ لیکن حجت کے درجہ میں تو سب سے بڑے ذمہ دار ہی کا قول ہم پیش کر سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا حسین احمد نے فرمایا کہ اچھا اگر پاکستان قائم ہو گیا، تو ہندوستان کا دفاع کیسے ہو سکے گا؟ روس نے اگر حملہ کر دیا، تو سرحد کے مسلمان بے چارے پس جائیں گے۔ سارا بوجھ ان پر پڑ جائے گا۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ تو آپ مان چکے ہیں کہ انگریز ابھی یہاں موجود ہے۔ سرِدست اگر پاکستان بنائے گا، تو وہی بنائے گا۔ سرحدوں کی حفاظت کی بھی کوئی صورت ضرور نکالے گا اور اس کے چلے جانے کی صورت میں بیرونی قوت ہندوستان پر چڑھائی کرے گی، تو دونوں طبقے مل کر اس کی حفاظت کریں گے اور ہر ایک دوسرے کی آدمی، سامان اسلحہ اور روپے سے مدد کرے گا کیوں کہ یہ سب کا مشترکہ مفاد ہو گا۔ ایسا نہیں کریں گے، تو سب کا نقصان ہو گا۔ اس قسم کے دفاع کے کام باہمی معاہدوں سے انجام پائیں گے۔ مولانا احمد سعید نے فرمایا کہ حضرت معاہدوں کو آج کل کون پوچھتا ہے؟ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ جب بلا معاہدہ آپ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں، تو معاہدہ کی صورت، تو بہرحال اس سے قوی تر ہونی چاہیے۔

پھر آپ کی تقریر کا حال، تو یہ ہوا کہ ہم کسی حالت اور کسی وقت بھی ہندوؤں کی احتیاج سے باہر نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے بدون کبھی کوئی کام کر سکتے ہیں۔ (یہ بات کم از کم شیر دل بہادروں کو زیب نہیں دیتی جو کہتے ہیں ذرا انگریز سے آزادی مل جائے پھر ہم نہرو وغیرہ کسی سے نہیں ڈرتے۔)

نیز آپ دیکھتے ہیں کہ معاہدات ہی کی طاقت تھی کہ روس اور برطانیہ نے مل کر جرمن اور جاپان کو کس طرح پیس ڈالا۔ کیونکہ تینوں کی غرض مشترک تھی۔ پاکستان اور ہندوستان کا مفاد جب مشترکہ ہو گا، تو دونوں بذریعہ معاہدات عملی اتحاد کیوں نہیں کر سکتے۔ (گو قومی اتحاد نہ ہو نہ سہی)

اس موقع پر مفتی عتیق الرحمٰن نے علامہ عثمانی سے کہا کہ آپ تو ہمیشہ سیاسیات سے یکسو رہا کرتے تھے۔ اس الیکشن میں کیا داعیہ ایسا پیش آیا جس کی وجہ سے آپ نے شرکت فرمائی؟

حضرت علامہ نے ارشاد فرمایا کہ اس الیکشن کی نوعیت پچھلے الیکشنوں سے بالکل مختلف ہے۔ حکومت نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ اس مرتبہ منتخب ہونے والی اسمبلیاں ہی آیندہ ہندوستان کا مستقل دستور بنائیں گی۔ چونکہ اس الیکشن سے قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ وابستہ تھا اس بنا پر میں نے ضروری سمجھا کہ اس بنیادی موقع پر ان مسلمانوں کی مدد کی جائے جو استقلال ملت اور مسلم حق خودارادیت کے حامی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ آپ نے یہ کہا کہ میں سیاسیات سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہوں۔ گزشتہ چند سالوں کو چھوڑ دیجیے اس سے بیشتر جمعیۃ العلما ہند میں ہماری بھی تو کچھ ناچیز خدمات رہی ہیں۔ ہم نے بھی تو کچھ معرکے سر کیے ہیں اور آپ حضرات طوفانی دورہ کر رہے تھے جس سے میرے نزدیک مسلمانوں کا نقصان تھا، تو ظاہر تھا کہ ایسے موقع پر میں سکوت کیسے باقی رکھ سکتا تھا۔

اگر بینم کہ نابینا و چاہ ہست
اگر خاموش بہ نشینم گناہ است

(جب میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک نابینا کنویں کی طرف بڑھ رہا ہے، تو اس موقع پر خاموش بیٹھنا میرے لیے گناہ کا کام ہے۔)

ان وجوہ سے میں نے مسلم لیگ کی تائید وحمایت کی۔ (پھر علامہ عثمانی نے یکایک کوئی اعلان نہیں فرمایا، بلکہ مہینوں پاکستان کے نظریہ پر شرعی و سیاسی حیثیت سے انتہائی غور و تعمق کیا، جب کلکتہ کے اجلاس کل ہند جمعیۃ العلمائے اسلام میں اپنا پیغام بھیجا، تو استخارہ بھی فرمایا۔ مکمل شرح صدر کے بعد یہ اقدام فرمایا گیا۔ (مرتب) اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ پھر میرا اثر ہی کیا ہے۔ ہندوستان میں اگر میری اپیل پر بیچارے نوابزادہ لیاقت علی خان کو دس بیس ووٹ مل ہی گئے، تو کیا اثر ہوا۔ آپ تو ماشاء اللہ بااثر ہیں۔ (موجودہ پروپیگنڈے کی طاقتیں آپ کے ساتھ ہیں)۔ میں تو اب آپ میں ایک اچھوت کی حیثیت رکھتا ہوں۔ کسی نے کہا، نہیں یہ بات نہیں آپ کے اعلانات نے ملک میں ہلچل مچا دی ہے۔

علامہ عثمانی سے سکوت کی درخواست

مولانا احمد سعید نے فرمایا کہ بہرحال یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ اس میں احتمالِ خطا دونوں طرف ہے۔ مگر آپ تو اس قوت سے بیان دے رہے ہیں کہ اپنے مخالفوں کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے۔ ذرا کچھ تو نرمی اختیار کریں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ سب حضرات ماشاء اللہ اہلِ علم ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب احناف و شوافع وغیرہ کے باہمی اختلافی مسائل کی تقریریں آپ اور ہم کرتے ہیں تو باوجودیکہ سب آئمہ ہُدیٰ ہیں لیکن ہم میں سے کون اپنے مذہب کی تصویب و تائید میں کسر اٹھا رکھتا ہے؟ اور حنفی مذہب کو ترجیح دیتے ہوئے شافعی یا مالک یا احمد کے لیے اپنے زعم میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا ہے۔ اس پر سب ہنسنے لگے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں میرا تو وہی خیال ہے جو فقہا کرام نے مسئلہ کے عقیدے کی نسبت لکھا ہے کہ اپنا امام جو مسئلہ بیان کرے اس کی نسبت یہ رائے رکھے کہ صواب محتمل الخطا۔ یعنی جو ہمارے امام نے مسئلہ بیان کیا وہ صحیح اور درست ہے۔ ہاں اس میں خطا کا بھی احتمال ہے۔ اور دوسرے امام نے جو کہا (خطاءً احتمل الصواب) یعنی وہ خطا ہے گو اس میں احتمال صواب کا بھی قائم ہے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی نہیں۔ آخر میں مولوی حفظ الرحمٰن نے فرمایا کہ جمعیۃ العلما اسلام محض ہماری جماعت کے مقابلے میں اس کو توڑنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔ مناسب ہو گا کہ آپ کم از کم اس کی صدارت قبول نہ فرمائیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے ابھی صدارت کے قبول و عدم قبول کی نسبت کوئی باضابطہ فیصلہ نہیں کیا ہے لیکن کل کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا کروں گا۔

(نوٹ: لیکن اس کے بعد علامہ عثمانی نے کل ہند جمعیۃ العلما اسلام کے ناظم کے تار کے جواب میں باضابطہ صدارت کی...... کا تار روانہ فرما دیا ہے۔ فللہ الحمد مرتب)

جب یہ حضرات علامہ عثمانی سے رخصت ہونے لگے۔ مولانا احمد سعید نے دریافت فرمایا کہ حضور نظام نے حیدر آباد بھی تو بلایا تھا آپ کب تشریف لے جائیں گے؟ علامہ عثمانی نے فرمایا میں نے حضور نظام کو لکھا ہے کہ ابھی تو تین ماہ تک مجھے یہاں بغرض علاج قیام کرنا ہے۔ سردی کم ہونے پر اگر اجازت ہو تو حیدر آباد آؤں۔ اب حضور نظام پر موقوف ہے کہ

اگر اس کے باوجود انھوں نے مجھے طلب فرمایا، تو مجھ کو بہر حال جانا پڑے گا اور اگر اجازت دے دی تو ٹھہر جاؤں گا۔

(الحمدللہ اس تحریر کے مرتب کرتے وقت ہی حضور نظام کے چیف سیکرٹری کا تار بنام علامہ عثمانی پہنچ گیا کہ آپ کو فرد حق تک قیام کی اجازت ہے۔ مرتب)

چلتے چلتے وفد کا منشا یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو تحریرات آپ کی شائع ہو چکی ہیں وہ بیان مسئلہ کے لیے کافی ہیں۔ اب اگر یکسوئی اختیار کی جائے، تو کیا بہتر نہ ہو گا؟ لیکن علامہ عثمانی نے فرمایا کہ جس چیز کو میں حق سمجھتا ہوں ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں میرے لیے سکوت کیسے مناسب ہے؟

اس کے بعد وفد رخصت ہو گیا۔ یہ تمام گفتگو نہایت خوشگوار فضا میں ہوئی۔ کسی موقع پر بھی الحمدللہ ادنیٰ سی تلخی پیدا نہ ہوئی۔ جب یہ تاریخی مجلس برخاست ہونے لگی، تو علامہ عثمانی نے اپنے یہاں آنے والے علما کے احترام میں اتنا فرمایا کہ یہ سلسلہ گفتگو آخری نہیں ہے۔ پھر جب چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔ جانبین کو موقع غور و فکر کا حاصل ہے۔ اب تک کی صورت حال یہ ہے کہ آپ اپنی جگہ قائم ہیں اور میں اپنی جگہ پر رہا۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہوگئی۔ شرعی حیثیت سے مسائل حاضرہ پر ہند کے وفد کی طرف سے کوئی کلام نہیں ہوا۔

(غالباً یہ حضرات یہ سمجھ کر آئے تھے کہ علامہ عثمانی کی سیاسی معلومات کم ہوں گی، تو ہم اپنے بیان کردہ واقعات سے علامہ موصوف کی رائے کو متاثر کر دیں گے۔ شرعی حیثیت سے گفتگو تو مولانا حفظ الرحمن سے پہلے کر چکے تھے کہ اس پر ہم آپ سے کیا بحث کرتے۔ لیکن اس مکالمہ سے غالباً ان پر یہ حقیقت بھی روشن ہوگئی کہ علامہ عثمانیؒ کی معلومات شرعیہ جہاں بے پناہ ہیں وہاں سیاسی مذاق بھی کچھ اس سے کم نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ عثمانی نے مسئلہ پاکستان کو اپنی گفتگو میں اس طرح سے منقح کیا کہ جو لوگ سیاسی ہیں جب اس مکالمہ کو سنتے ہیں۔ تو وہ خود بھی تنقیح مسئلہ کے انداز پر عش عش کرتے ہیں)

ضروری گزارش

جو مکالمہ اوپر درج ہوا اس پر گفتگو کے سب اجزا آگئے۔ کوئی ایک آدھا جز چھوٹ گیا ہو، تو جدا بات ہے۔ ترتیب کلام میں تقدیم و تاخیر بھی ممکن ہے کیونکہ جس وقت مکالمہ ہو رہا تھا، بروقت منضبط نہیں ہوا۔ لیکن گفتگو کا ملخص اور ضروری لب لباب جہاں تک ممکن تھا لے لیا گیا۔ علامہ عثمانی نے جس طرح گفتگو نقل فرمائی اسی طرح قلمبند کر لی گئی اور مزید احتیاط یہ کی گئی کہ مسودہ صاف کر کے حضرت علامہ کو دکھلا لیا گیا۔ حضرت علامہ نے کہیں کہیں اس میں ترمیم و اصلاح بھی فرمائی۔ لہٰذا یہ مکالمہ اب حضرت علامہ کا مصدقہ مکالمہ ہے۔ جو بغرض افادۂ عوام شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مکالمہ سے اہل بصیرت اور مہذب دنیا کو یہ واضح ہو گا کہ اختلافات میں حزم و احتیاط اور عدل و توازن سے کیا لطافت پیدا ہوتی ہے اور کس طرح مسئلہ کے تمام پہلو سامنے آسکتے ہیں۔ اور بے اعتدالیوں یا بدتہذیبیوں سے اختلاف کس طرح خلاف اور شقاق کی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ کہ ہر دو جماعتوں کا رخ کیا ہے۔ کون اصول کو مقدم کرنا چاہتی ہے اور کون ذاتیات پر اتری ہوئی ہے؟

ooo

اگر مولانا آزاد قائد اعظم کا ساتھ دیتے؟

نماز کے لیے اذان دے کر سو جانے والے ایک مسلم راہنما کا تذکرہ علامہ اقبال انھیں بخوبی جانتے تھے

رضی الدین سید

ایک ٹی وی چینل پر گزشتہ سال ایک دانستہ شرارت کی گئی تھی کہ عین 23 مارچ کے دن ماضی کے ایک پاکستان مخالف مسلم قائد، مولانا ابوالکلام آزاد کی پاکستان سے متعلق پیشین گوئیوں پر مشتمل ایک طویل پروگرام بلا وجہ نشر کرو دیا گیا جس نے ملک کے مخالف طبقوں کے جذبات کو تو خوب مہمیز دی لیکن پاکستان کے باقی کروڑوں محب وطن عوام کے دل چھلنی کر دیے۔ چنانچہ وطن عزیز میں اب ایک بار پھر اس بحث کے دروازے کھول دیے گئے ہیں کہ آیا پاکستان کی تخلیق درست ہوئی تھی یا غلط! اور یہ کہ مولانا آزاد کی پیش گوئیاں آج کس قدر درست یا نادرست ثابت ہو رہی ہیں؟ یہ ایک بلا وجہ کی شرارت تھی جس کا مقصد قوم کو، جو پہلے ہی کئی قسم کے ذہنی و دینی انتشار کا شکار ہے، دانستہ طور پر ایک نئے فکری انتشار میں مبتلا کرنا تھا۔ حالانکہ یہ وہی مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جن کے خیالات وافکار کو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں نے، جن میں کراچی کی اردو داں آبادی کے آبا و اجداد بھی شامل ہیں، تحریک پاکستان کے دنوں میں یک زبان ہو کر مسترد کر دیا تھا اور اپنی وابستگی محض اور محض قائداعظم ہی سے رکھی تھی۔ کون نہیں جانتا کہ اس دور کا مقبول ترین نعرہ ہی یہ بن گیا تھا کہ

"مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"

(یعنی تو اگر مسلم ہے تو کہیں او[ر] نہ جا بلکہ صرف مسلم لیگ میں آ) کس ا

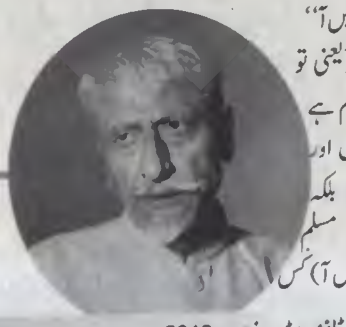

قدر حیرت کی بات ہے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران مسلمانانِ ہند نے قائدِ اعظم کے مقابلے میں مولانا آزاد کو پرِکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس وقت بھی اس بات کا دھیلے کے برابر برا نہیں منایا تھا جب قائدِ اعظم نے مولانا آزاد کو علی الاعلان ''کانگریس کا شوبوائے'' کہہ کر پکارا تھا۔ مطلب اس طنز کا یہ تھا کہ ہندوؤں کے اندوہ محض دکھاوے کے مسلمان صدر ہیں! لیکن افسوس کہ اپنے درپردہ مقاصد کی خاطر انہی بانیان و کارکنانِ پاکستان کی بعض اولادیں آج قائدِ اعظم کو مسترد کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کی مالا جپ رہی ہیں۔ تجزیے کے قابل ٹی وی کی جانب سے مولانا آزاد کی بیان کردہ وہ پیشگوئی بھی شامل ہے جو 1946 میں ان کی جانب سے پاکستان کے بارے میں کی گئی تھی۔ بقول مذکورہ ٹی وی چینل، انہوں نے کہا تھا کہ ''اس ملک میں فوج بھی کبھی قبضہ (ٹیک اوور) کر لے گی''۔ سوچنے کی بات ہے کہ اس زمانے میں جبکہ پاکستان کے پاس نہ تو مکمل فوج تھی اور نہ بھارت نے اسے اس کے حصے کا مکمل اسلحہ فراہم کیا تھا، مولانا آزاد کیسے پیشین گوئی کر سکتے تھے کہ پاکستان میں فوج کبھی اقتدار پر قبضہ کر لے گی؟ وہاں تو معاملہ یہ تھا کہ خوف سر پہ سوار تھا کہ اگر کبھی بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تو سازو سامان اور افواج کی حد درجہ کمی کے باعث کیا پاکستان بھارت کا مقابلہ بھی کر سکے گا؟ راقم کا خیال ہے کہ مذکورہ کتاب سے بہت سارے خیالات ٹی وی میزبان نے ان کے نام سے زبردستی منسوب کر دیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ویسے تو ایک بہت بڑے عالمِ دین تھے اور دین کی انقلابی دعوت کا آغاز اس دور کے بھارت میں سب سے پہلے انہی نے کیا تھا۔ لیکن محض ایک ڈیڑھ سال کے عرصے کے بعد ہی صدا لگا کر وہ نہ جانے کیوں اچانک 'چانکیہ سیاست' کے گلی کوچے میں جا نکلے اور اس طرح جا نکلے کہ اسلام کا تمام بوریا بستر بھی لپیٹ کر اپنے ساتھ لے گئے! اسی باعث مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک دور میں ان کے بارے میں بہت خوبصورت اور جامع تبصرہ کیا تھا کہ '' مولانا نے نماز کے لیے اذان تو دی، مگر اس کے بعد جا کر خود گہری نیند سو گئے''۔ (مفہوم)۔ ملک کے عوام سے راقم کا سادہ سا سوال ہے کہ آخر کوئی وجہ تو ایسی ہوگی کہ اس دور کے مسلم سوادِ اعظم، قائدِ اعظم کے سوا دوسرے کسی بھی رہنما کی بات سننے کو تیار نہیں تھا؟ بلکہ سننا تو درکنار پاکستان مخالف شخصیات کو وہ مسلمانوں کے مستقبل کا دشمن گردانتا تھا، خواہ اس شخصیت کا قد و قامت کتنا ہی بلند کیوں نہ پایا جاتا تھا!

حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا نے مسلمانانِ ہند کے لیے سوادِ اعظم سے ہٹ کر 'وطن کی بنیاد' کو اسلام سے ہٹ کر ''سرزمین'' کو قرار دیا تھا۔

ذیل کی سطور قارئین کے سامنے ہم ان کے انہی خیالات و احساسات کو واضح کرنے کی خاطر رکھ رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی شخصیت کے کچھ دیگر پہلو بھی ہم علامہ اقبال کی زبانِ مبارک سے پیش کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ خیالات علامہ اقبال کی اس حالت کے دوران (جنوری 1938) کے ہیں جب کہ وہ بستر مرگ پر زندگی و موت کے دوراہے

لیٹے ہوئے تھے۔ آج تو ہم مولانا آزاد سے کم از کم ساٹھ سال کی دوری پر کھڑے ہیں، لیکن علامہ اقبال تب مولانا ابوالکلام آزاد کے بالکل ہم عصر تھے اور ان کے خیالات و افکار سے ہم سے کہیں زیادہ واقف تھے۔ کتاب ہے۔ ''علامہ اقبال کے حضور'' حصہ اول۔ اور راوی ہیں ان کے تیماردار معروف مصنف پروفیسر سید نذیر نیازی جو خود بھی ایک عظیم اسکالر تھے۔ علامہ کے حضور ان دنوں وہ تقریباً روز ہی موجود رہا کرتے تھے اور تبرک سمجھتے ہوئے ان کی گفتگو کو اسی وقت ڈائری کی شکل میں نوٹ بھی کر لیا کرتے تھے۔ پروفیسر نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد کے نظریات کے بارے میں علامہ اقبال گاہے گاہے یوں تبصرہ کیا کرتے تھے۔

1۔ اس (مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریے) سے زیادہ مہلک روش اور کیا ہوگی کہ مسلمانوں کی حیثیت (محض) ایک مذہبی برادری کی رہ جائے۔ ایسی آزادی تو غلامی سے بھی بدتر ہوگی۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی تو پہلے ہی سے یہ خواہش رہی ہے کہ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، مسلمان مذہب کو خیرباد کہہ دیں۔ (صفحہ:262)

2۔ کیا اسلام کی اس تعبیر کے پیش نظر جو انہوں نے ''الدین'' اور ''الاسلام'' کی شکل میں پیش کی ہے، مسلمان سیاست کو مذہب سے الگ رکھیں؟ اپنے لیے جداگانہ قومیت کا مطالبہ نہ کریں؟ (اور) اس گروہ میں شامل ہو جائیں جس کی بنیاد اشتراکِ وطن پر ہے؟

3۔ میں نہیں جانتا کہ مولانا (آزاد) کا مافی الضمیر کیا ہے؟ لیکن اگر وہی کچھ ہے جو میں سمجھا ہوں تو ان کے غور و فکر میں ایک تو وہی دلیل کام کر رہی ہے جس کا تعلق لادینی سیاست سے ہے اور جس کا تقاضا یہ ہے کہ ریاست اور کلیسا میں تفریق کی جائے۔ دوسری (دلیل) مذہبی ہے کہ ''ادیان سب ایک سے ہیں۔'' اور یہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ دین فی الحقیقت کوئی اصولِ اجتماع نہیں ہے بلکہ (محض) ایک اخلاقی نصب العین (ہے) جس کی آرزو ہے کہ دنیا میں ہر کہیں (بس) خیر و صداقت کی تحریک ہو (اور) شرافت اور نیکوکاری کا دور دورہ رہے۔ (صفحہ:327)

4۔ دین میں تفرقے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ (یعنی مذہب کو سیاست سے الگ کر دو۔ سید) (ص:331)

5۔ یہ امر بڑا افسوسناک ہے کہ کسی شخص کا علم و فضل، یا احترامِ ذات، ہمیں حق گوئی سے باز رکھے۔ اور وہ بھی ان مسائل میں جن کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہے۔ (ص۔53)

6۔ یہ بہت بڑی غلطی ہوگی کہ جب ہم حق و صداقت پر زور دیں، یا اسلام کے حوالے سے اسے سمجھانے کی کوشش کریں، تو اس طرح کہ بجائے اسکے کہ لوگ اسلام کی طرف آئیں، ہمارا اپنا ایمان و یقین (بھی) اس میں مضمحل ہو جائے۔ حتیٰ کہ بطور ایک ہیئتِ اجتماعیہ اور نظامِ مدنیت کے، ہم اس کی جامعیت اور کلیت (کی خصوصیات) کو نظر انداز کر دیں۔ یہ سمجھ لیں کہ یہ انسانی روابط ہوں یا تہذیب و تمدن کی دنیا، ہم اس میں اسلام کے پہلو بہ پہلو دوسری گروہ

بندیاں بھی قائم کر سکتے ہیں اور اس کے باوجود اپنا سا مخصوص نصب العین اور جداگانہ تشخص (بھی) برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو چھوڑ کر کبھی ایک اصولِ حیات کا رخ کریں (اور) کبھی دوسرے کا! یہ امر تو دین کے منافی ہے۔ دین کا ایک ہی اصل الاصول ہے۔ اور وہ اسلام ہے۔ (ص:33-332)

7۔ ارضِ بلقان میں جذبۂ وطنیت کو (اسی لیے) ابھارا گیا کہ یہ خطہ اول تو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ جائے اور پھر یہ ریاستیں دولتِ عثمانیہ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں تاکہ یورپ میں اس دولتِ عثمانیہ کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے (ص336)۔

8۔ پروفیسر سید نذیر نیازی کی مرتب کردہ مذکورہ کتاب میں ایک تاریخی واقعہ یہ بھی دیا ہوا ہے کہ اسی دور میں اوقاف اور مساجد کے تحفظ کے لیے جو مسودہ اسمبلی میں مسلمان رہنماؤں کی جانب سے پیش کیا گیا تھا، اسے برطانوی حکومت کے مسلم وزیر سر سکندر نے مسترد کر دیا تھا جس کی مبارکباد مولانا ابوالکلام آزاد نے خود بھی سر سکندر کو دی تھی۔

کتاب کے مرتب کنندہ اس بات پر حیرت و تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس معاملے میں مہاتما گاندھی تو سر سکندر کو مبارکباد دینے میں حق بجانب تھے، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ مبارکباد انہیں کس لیے دی تھی؟ یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ (صفحہ:432)

9۔ تحریکِ پاکستان کے ایک اور کارکن اور مورخ قاضی عبدالحنان مرحوم (کراچی) نے بھی اپنی کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں کچھ تبصرے کیے ہیں اور وہ بھی اس لائق ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے، تجزیہ کیا جائے، اور غور و فکر کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں۔

10۔ قائدِ اعظم نے مولانا ابوالکلام آزاد سے کہا

''میں آپ سے خط و کتابت یا کسی اور ذریعے سے گفتگو کے لیے تیار نہیں ہوں کیونکہ آپ نے مسلمانوں کا اعتماد بالکل کھو دیا ہے۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ آپ کو ایک ''شو بوائے'' صدر بنا کر رکھا گیا ہے؟ آپ نہ ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں اور نہ مسلمانوں کی۔ اگر آپ کے اندر عزتِ نفس کی ایک رمق بھی باقی ہے، تو آپ (کانگریس کی صدارت سے۔سید) مستعفی ہو جاتے''۔

(کتاب ''میر کارواں''۔ رہبر پبلشرز کراچی۔ قاضی عبدالحنان۔صفحہ:239)

مرحوم قاضی عبدالحنان نے تبصرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ (قاضی صاحب کے اپنے الفاظ میں) ''مولانا آزاد وہ بزرگ ذات ہیں جس نے مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے کٹ کر ''بت خانے'' (ہندوستان۔سید) کی راہ لی۔ ان کے دلِ شوریدہ کو بیت اللہ سے پیدائشی تعلق ہونے کے باوجود گاندھی کے چرنوں میں سکون ملتا تھا۔'' وہ مزید وضاحت کرتے ہیں کہ ''یاد رہے کہ انہوں (آزاد) نے اپنے ''رام گرو'' (یعنی گاندھی۔سید) کے تحریری خطبۂ صدارت میں گاندھی جی کے لیے ''عظیم و جلیل روح'' کے الفاظ استعمال لیے تھے''۔ (ایضاً۔ص:237)

راقم الحروف کا کہنا ہے کہ کون نہیں جانتا کہ عالم دین اور مفسر قرآن مولانا ابو الکلام آزاد نے تحریک آزادیٔ ہند کی اپنی ساری زندگی منافقت سے پر گاندھی

اور نہرو جیسی شخصیات کے ساتھ گزاری تھی اور خود کو مسلمانوں کی عظیم اکثریت سے دانستہ کاٹ لیا تھا۔ پھر یہ غلط فہمی بھی ہمیں یہاں دور کر لینی چاہیے کہ چونکہ تقسیم کے وقت بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کی اکثریت نے ہندوستان کے حق میں ووٹ دیے تھے، تو وہاں آج اسی لیے مسلمانوں کی اکثریت پائی جاتی ہے۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان بھارتی مسلمانوں نے بھی پاکستان کی خاطر ہی دل و جان سے حمایت کے ووٹ دیے تھے اور اس امر سے خوب واقف ہو کر دیے تھے کہ ان کے صوبے (یو پی، سی پی، حیدرآباد اور بہار وغیرہ) کسی بھی حال میں پاکستان میں شامل نہیں ہو سکیں گے کیونکہ وہاں بھاری اکثریت ہندوؤں ہی کی پائی جاتی ہے۔ دل ان کے پاکستان کے ساتھ تھے مگر جغرافیائی لحاظ سے وہ مجبور تھے! کسی کو اس امر میں شبہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس دور کی تحریک پاکستان کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کرے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے تب اتفاق رائے کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد جیسی جلیل القدر ہستیوں دونوں ہی کو مکمل طور پر مسترد کر دیا تھا اور ان کی عظمت و جلال سے وہ مطلق مرعوب نہیں ہوئے تھے۔ تب شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی ''ان بیچاروں کی''۔ لوگوں کو ہم یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ستر کے عشرے تک پاکستان میں کوئی ایک بھی فرد مولانا ابوالکلام آزاد کو پسند کرنے والا نہیں تھا کیونکہ وہ انہیں قائد اعظم کا مخالف گردانتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ 1951ء میں جب لیاقت علی خان کو راولپنڈی میں گولی مار کر شہید کیا گیا تھا تو عوام کو اس خبر سے خوشی نہیں بلکہ صدمہ ہوا تھا اور انہوں نے سرعام یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا کہ

''ہائے لیاقت علی۔ تم پر گولی چلی
ہندو ہنسنے لگے۔ مسلم رونے لگے''

ہمیں یاد ہے کہ بچپن میں بچوں کی ٹولیوں کے ساتھ ہم بھی سڑکوں پر جوش و جذبے کے ساتھ یہ کورَس گاتے پھرتے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں پاکستان کی محبت ان دنوں اتنی زیادہ اُبلا کرتی تھی کہ مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ نے جب وزارت عظمیٰ سنبھالی تھی تو پاکستان میں لوگوں نے انہیں ناراضی کے عالم میں ''غدار'' کا لقب دے دیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ نہرو کا ساتھ دے کر شیخ عبداللہ نے قائد اعظم اور عوام کے ساتھ غداری کی ہے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ شیخ عبداللہ کو نہرو کا نہیں بلکہ پاکستان کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وہ مسلم رہنما جو اس تحریک کے دوران پاکستان کے بدلے نہرو اور ہندوستان کا ساتھ دیتا تھا، مسلم ملت اسے متفقہ طور پر نظروں سے گرا دیتی تھی۔

اس موقعہ پر اس حقیقت کی بھی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت ہے کہ اتنی بڑی علمی، مذہبی و تحریکی شخصیت کی حیثیت رکھنے کے باوجود مولانا آزاد نے کانگریس میں شامل ہونے کے بعد شاید ہی کوئی علمی و تحریکی کام کیا ہو۔ جو کچھ بھی انہیں کرنا تھا، وہ بس تحریک آزادیٔ ہند، و مخالفتِ پاکستان سے قبل ہی انہوں نے کیا اس کے مقابلے میں دوسرے بڑے عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پاکستان میں نہ صرف یہ کہ سیاست میں بھی بھر

پورحصہ لیا، بلکہ اقامتِ دین کی مضبوط تحریک بھی ساتھ ساتھ چلائی اور قیمتی موضوعات پر لاتعداد کتابیں بھی تصنیف کیں۔

اب اس بات کی وضاحت کون کرے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم نے دینی وتحریکی موضوعات پر مزید قیمتی مواد دنیا کو دینا اچانک کیوں چھوڑ دیا؟ اور راستے میں انہیں تھکان نے کیوں آدبوچا؟ کسی نے اگر ان کی ابتدائی دور کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہوتو محسوس ہوگا کہ ان میں حد درجہ زور بیان اور اسلام کی ہمہ گیریت پر انتہائی اعتماد موجود ہے!

اب اس بات کی وضاحت کون کرے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم نے دینی وتحریکی موضوعات پر مزید قیمتی مواد دنیا کو دینا اچانک کیوں چھوڑ دیا؟ اور راستے میں انہیں تھکان نے کیوں آدبوچا؟ کسی نے اگر ان کی ابتدائی دور کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہوتو محسوس ہوگا کہ ان میں حد درجہ زور بیان اور اسلام کی ہمہ گیریت پر انتہائی اعتماد موجود ہے!

مولانا آزاد کے چاہنے والوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ تحریک کے دنوں میں ان محترم شخصیات کو مسترد کردینے والے بزرگ آخر تھے تو ''تمہارے ہی آباء؟ وہ تم ہی میں سے کسی کے باپ، چچا، دادا اور نانا اور خالو تھے۔ انہی لوگوں نے اس وقت ان دونوں شخصیات کے پیچھے چلنے سے انکار کیا تھا تو پھر کس بنیاد پر وہ اب ان حضرات کے گن گاتے ہیں؟ انہیں تو اس دور کے حالات، واقعات، سیاسیات، مذہبیات اور پس منظر کا ذرہ برابر بھی علم نہیں ہے۔ لہٰذا پاکستان کے بننے کا سوال انھیں اب صرف اپنے مرحوم بزرگوں ہی سے پوچھنا چاہیے کیونکہ وہی اس بڑی تقسیم کے ذمے دار ہیں۔ افسوس اس قوم کے ان چند ناداں اور ناشکرے لوگوں پر جو پیدا یہاں ہوئے تعلیم، عزت اور پہچان یہاں سے پائی اور اب جو چھیاسٹھ برسوں کی طویل و آزاد زندگی گزار کر اب بابائے قوم اور خود اپنے ہی والدین کے فیصلوں او قربانیوں کو کھلے عام غلط قرار دے رہی ہے اور ا شخصیت کو اپنا ہیرو اور سر کا تاج قرار دے رہی ہے جس کو اس وقت کی تمام مسلم اکثریت نے متفقہ طور پر مسترد کردیا تھا۔

آزادیٔ ہند کے بعد ت وہ کل بھارت کے صدر بھی رہے۔ لیکن افسوس کہ ان کے دو میں بھی بھارتی ہندو اپنی مسلم اقلیت کو بڑے پیمانے پر گ کاٹتے رہے اور ان کے کھیت اور کھلیان نذر آتش کرتے رہے۔ مولانا آزاد نے ملک کی صدارت پا کر بھی بھارتی مسلمانوں کی کون سی بڑی خدمت کرلی تھی؟ اس کے بدلے اگر وہ قائد اعظم کے ساتھ رہ کر پاکستان آجاتے تو ان کا شم بانیٔ پاکستان کے دائیں ہاتھ کے طور پر ہوتا او قائداعظم کی رحلت کے بعد وہ از خود ملک کی سب سے کلیدی شخصیت قرار پاتے۔ یوں وہ پاکستان کے اس عظیم مقصد کو پالیتے جس مقصد کی خاطر یہ تمام تحریک چلائی گئی تھی۔ ممکن تھا وہ اس ملک ایک عظیم اسلامی مملکت میں تبدیل کر لینے میں با آسانی کامیاب ہوجاتے۔ ○○○

باتیں دانش کی

رفیعہ کلیم فاروقی

شیخ فخرالدین عراقی (1289-1213)

فارسی کے عظیم شاعر اور مصنف فخرالدین ابراہیم عراقی 10 جون 1213ء کو ہمدان میں پیدا ہوئے۔ زندگی کے کئی سال ملتان اور قونیہ طوقت (حال میں ترکی) میں گزارے۔ آپ تبصرہ نگار، فارسی شاعری اور مصوری کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ آپ کو روحانیات میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ آپ ایک زبردست عالمِ دین تھے۔ قرآن وحدیث، تفسیر، علم الکلام، عربی اور فارسی لٹریچر میں بہت درک حاصل تھا۔ صرف 17 سال کی عمر میں تمام علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد تدریس شروع کرچکے تھے۔ اسی دوران میں آپ درویشوں کے ایک گروہ میں شامل ہوگئے۔ یہ گروہ ملتان میں سہروردیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ملتان آمد کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ کی شادی حضرت شیخ بہاؤالدین ملتانی کی صاحبزادی سے ہوگئی اور آپ کے فرزند کبیرالدین تولد ہوئے۔ عراقی اپنے شیخ کے پاس 25 سال مقیم رہے۔ شیخ بہاؤالدین نے اپنی وفات کے وقت آپ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ لیکن حاسدین نے آپ کے خلاف سلطان کو شکایت کی جس نے آپ کی گرفتاری کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ کچھ قریبی ساتھیوں کے ساتھ مکہ مدینہ کی طرف فرار ہوگئے اور وہاں سے آج کے ترکی چلے گئے۔ قونیہ میں آپ کی ملاقات حضرت صدرالدین القونوی اور مولانا جلال الدین رومی جیسے عظیم صوفیا سے ہوئی۔ رومی سے آپ کی دوستی بہت گہری تھی لیکن شیخ قونوی نے آپ کی ذہنی تربیت کی۔ رومی کی وفات کے بعد عراقی طوقت چلے گئے۔ آپ کے دورِ ضعیفی میں طوقت کے لوگ آپ کا بہت ادب واحترام کرتے تھے۔ بازنطینی شہزادہ کنگرتے آپ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے آپ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تو آپ قاہرہ چلے گئے۔ پھر دمشق میں سکونت اختیار کی۔ صوفیانہ شاعری کے ساتھ آپ کو عربی اسکول آف صوفی ازم سے تعلق خاطر رہا۔ سری، باطنی علوم (Gnostic knowledge) پر آپ کی کتاب لمعات (Divine flashes) کو صوفیانہ واردات کی منظرکشی (Genre of Sufi writings) کا مرقع سمجھا جاتا ہے۔ جو محبت کی زبان میں محسوسات کی ترجمان ہے۔

شیخ قونوی عظیم صوفی ابن عربی کے داماد تھے۔ اور مولانا رومی سے زیادہ شہرت کے حامل تھے۔ قونیہ میں آپ نے لمعات جیسا شاہکار ابنِ عربی سے متاثر ہوکر تصنیف کیا۔ عراقی نے دنیا کو ایسے آئینے کے طور پر دیکھا جس میں اللہ کی صفات کا پرتو ہو۔ روایت ہے کہ جب عراقی'' اپنے شیخ حضرت بہاؤالدین کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے آپ کو چلہ کاٹنے کا حکم دیا۔ چونکہ عراقی اپنے مرشد کے بہت محبوب مرید تھے، دوسرے مرید آپ سے حسد کرنے لگے۔ کسی نے

شیخؒ سے شکایت کی کہ آپ کا نیا عراقی مرید چلے میں آیات کے بجائے اپنے اشعار پڑھتا ہے۔ چنانچہ شیخ بہاؤالدین نے عراقی کو طلب فرمایا اور استفسار کیا کہ وہ کیا پڑھتے ہیں۔ عراقی نے اپنی غزل سنادی جس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے:

مطلع
مئے اول کاندر جام کردند ۔۔۔ زچشمِ مستِ ساقی وام کردند
(ترجمہ: وہ پہلی شراب جو پیالے میں انڈیلی گئی، وہ ساقی کی مست آنکھوں سے قرض لی گئی تھی)

مقطع:
چوخود کردند رازِ خویشتن فاش ۔۔۔ عراقیؔ راچرا بدنام کردند
(جب انھوں (اللّٰہ تعالیٰ) نے خود ہی اپنا راز فاش کردیا تو عراقی کو کیوں بدنام کرتے ہیں (کہ اللّٰہ تعالیٰ کے راز فاش کرتا ہے)

حضرت بہاؤالدین ذکریا نے یہ اشعار سنے تو عراقی سے مخاطب ہوکر کہا کہ تمھیں چلہ کاٹنے کی ضرورت نہیں اور خرقۂ خلافت عطا کردیا۔ فارسی زبان کے بھارتی اسکالر ڈاکٹر بلجیت سنگھ جنھوں نے امام غزالیؒ کی سوانح اور عراقی کی لمعات (جھلکیاں) کا ترجمہ کیا ہے، کہتے ہیں کہ لمعات کا انداز سادہ، باوقار، رواں اور قرآنی آیات اور عربی کے خوبصورت جملوں سے مزین ہے۔ یہ کتاب غزالیؒ کی سوانح کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ اور یہی رائے ڈاکٹر نصر اللہ پورجوادی کی ہے کہ امام غزالیؒ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے محبت کے صوفیانہ مابعدالطبیعات کی بنیاد رکھی۔ لمعات کا انگریزی، فرانسیسی اور سویڈش زبان میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ یہ کتاب ان لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے جو اسلام کو نفرت کا دین سمجھتے ہیں۔ عراقی کا دور اسلامی صوفی ازم کے احیا کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں مشہور و معروف صوفیا جیسے ابنِ عربی، جلال الدین رومی، شمس تبریزی، صدرالدین قونوی، نجم الدین کبریٰ اور کرمانیؒ جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں موجود تھیں جنھیں فارسی صوفی ازم کا 'Fideli d'Amore' کہا جاسکتا ہے۔ عراقی محبت کو منصور حلاج، احمد غزالی، عین القدحت ہمدانی، رزبحان باقلی، اور خواجہ شہاب الدین سہروردی کی طرح ماورا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

آپ نے 1289ء میں 78 سال کی عمر میں وفات پائی۔ چونکہ عراقی ابنِ عربی سے بہت زیادہ متاثر تھے اس لئے ان کی وصیت کے مطابق دمشق میں ابن عربی کے مزار کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ لمعات کا بعد کے شعرا پر بہت زیادہ اثر ہوا۔

اقوال:

۱۔ وہ ہر جگہ موجود ہے، جو کل ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کل کا جزو ہے۔
۲۔ ذرے کی حقیقت کو سمجھنا دراصل کل کی حقیقت کو سمجھنے کے مترادف ہے۔ کرن سورج تک رہنمائی کرتی ہے۔
۳۔ محبوب ہر جگہ موجود ہے۔ وہ اتنا قریب ہے کہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ اسے پانا ہے تو غور کرنا ترک کردو۔
۴۔ عقل مجھے سکھلاتی ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں، جبکہ محبت سکھلاتی ہے کہ میں سب کچھ ہوں۔
۵۔ میں ہر ذرے کے رخسار کو روشن کرتی ہوں لیکن میری نشان دہی ناممکن ہے۔ میں اتنی آشکار ہوں۔
۶۔ محبت ایک پردے پیچھے نغمہ سرا ہے۔ اس کے سُر کو سننے والا کہاں ہے؟
۷۔ خود کو حواس سے منقطع کرلو اور اپنی یگانگت کے سورج کو دیکھ لو۔

OOO

دل کو صحت مند رکھنے والے 35 گُر

سیکڑوں برس پر محیط تحقیق و جستجو کا نچوڑ
35 گُر جو آپ کے دل کو لمبی عمر دے سکتے ہیں

جنید اکرم

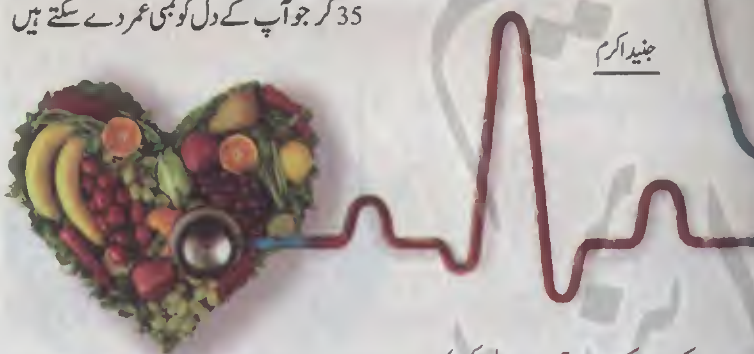

دھک دھک، دھک ..... جی ہاں، دل کی یہی دھڑکن انسان کے زندہ ہونے کا ثبوت ہے۔ یہ رُک جائے، تو بشر بھی خاک میں جا لیٹتا ہے۔ انسانی جسم میں دل و دماغ، یہی دو عضو سب سے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ دل صحت مند رہے، تو بدن جبکہ دماغ تندرست رہے، تو روح توانا رہتی ہے۔ لہٰذا ہر ذی حس کا فرض ہے کہ وہ اپنے دل کی خوب حفاظت کرے۔

ذیل میں قلب کی دیکھ بھال کرنے والے ایسے 35 نسخے پیش خدمت ہیں جو سیکڑوں برس پر محیط ماہرین کی تحقیق و تجربات کا نچوڑ ہیں۔ اگر ان پر صدق دل سے عمل کیا جائے، تو آپ اتنی طویل عمر ضرور پاسکتے ہیں کہ پاکستانی معاشرے کو کرپٹ حکمران طبقے سے پاک اور دنیا کا ترقی یافتہ اور خوشحال ملک دیکھ سکیں۔

(1) سگریٹ کے دھوئیں سے بھی بچیے......

امریکی ڈاکٹروں نے دریافت کیا ہے کہ جو مرد و زن ہفتے میں تین بار 30 منٹ تک سگریٹ کے دھوئیں کی زد میں رہیں، ان میں امراضِ قلب میں مبتلا ہونے کا خدشہ 26 فیصد تک بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا کبھی سگریٹ کے دھوئیں والے ماحول میں نہ بیٹھیں۔

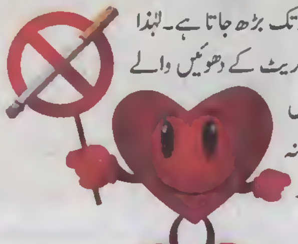

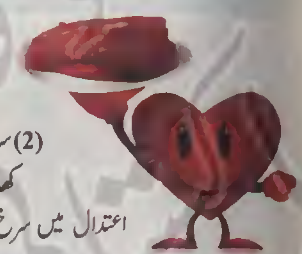

(2) سرخ گوشت کھائیے......

اعتدال میں سرخ گوشت کھانا مفید ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سرخ گوشت مامون نظام کو تقویت پہنچانے والا معدن سلینیم رکھتا ہے اور حیاتین بی کی اقسام بھی جو انسانی جسم میں ہوموسیسٹین کی سطح کم رکھتا ہے۔ اس پروٹین کی بڑھتی شرح دل کے لیے خطرناک ہے۔ مزید برآں سرخ گوشت کی 50 فیصد چکنائی قلب دوست مونو ان سیچو ریٹڈ قسم سے تعلق رکھتی ہے۔

(3) ڈراؤنی فلم دیکھیے......

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جو شے بھی دل کی دھڑکن بڑھا دے وہ اُسے طاقت ور بناتی ہے۔ مثلاً ڈراؤنی فلم دیکھنا، اچھی کتاب پڑھنا، کرکٹ کھیلنا یا عشق میں مبتلا ہونا۔ دراصل جب بھی دل کی دھڑکن تیز ہو، تو یہ اس کی دھڑکن کو ازسرنو شروع (Reset) کرنے کے مترادف ہے۔ یوں اس کی کارکردگی بہتر ہو جاتی ہے۔

(4) گردو غبار میں ورزش نہ کیجیے......

آلودہ ماحول میں ورزش کرنے سے خون میں آکسیجن کم ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں دل کی نالیوں میں لوتھڑے بننے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

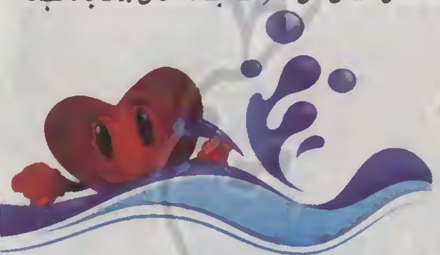

(5) تالاب میں غوطہ لگائیے......

برطانوی ماہرین نے بعداز تجربات دریافت کیا ہے کہ جو مردوزن شدید جسمانی سرگرمی مثلاً تیرنے یا پہاڑ پر چڑھنے (ہائکنگ) سے محض 50 حرارے بھی جلائیں، ان میں امراض قلب سے مرنے کا خطرہ 62 فیصد کم ہو جاتا ہے۔ تاہم ہلکی ورزش مثلاً چلنے یا گالف کھیلنے سے یہ فائدہ نہیں ہوتا۔

(6) کولیسٹرول کا مقابلہ چکنائی سے کیجیے......

ایک تجربے میں آسٹریلوی ماہرین نے تین ماہ تک سترہ مردوزن کو گری دار میوے کھلائے۔ جب چوتھے ماہ ان کا معاینہ ہوا، تو مردوزن میں 3 تا 5 فیصد کولیسٹرول کم پایا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ گری دار میوے مونو ان سیچو ریٹڈ چکنائی کثیر مقدار میں رکھتے ہیں۔

(7) سائیکل چلا کر ڈپریشن بھگائیے

طبی سائنس دریافت کر چکی کہ جو انسان ڈپریشن کا شکار ہوں، وہ دوسروں کی نسبت جلد امراضِ قلب کا نشانہ بن جاتے

ہیں۔ کئی مردوزن ادویہ کھا کر ڈپریشن بھگانے کی سعی کرتے ہیں۔ مگر جدید تحقیق نے انکشاف کیا ہے کہ بہترین طریقہ کوئی بھی ورزش کرنا مثلاً سائیکل چلانا یا بیڈمنٹن کھیلنا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تجربے میں ڈپریشن زدہ مردوزن پر تین ماہ بعد ادویہ اور ورزش کے ایک جیسے اثرات پائے گئے۔

(8) روزانہ 20 منٹ مراقبہ کریں......

امراضِ قلب میں مبتلا افراد خاص طور پر روزانہ صرف20 منٹ مراقبہ کرنے کے لیے نکالیں۔ یہ روحانی عمل گھبراہٹ اور بے چینی سے نجات دلا کر انسان کو پرسکون کرتا ہے۔ ماہرین امراضِ قلب کا کہنا ہے کہ دل کے جو مریض ڈپریشن کا شکار ہوں، وہ دوسروں کی نسبت جلد چل بستے ہیں۔

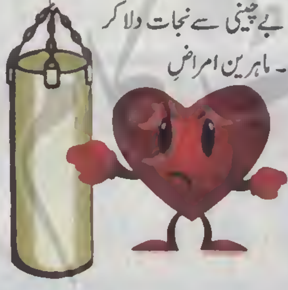

(9) ہوا بھرا تھیلا (Punching bag) خرید لیجیے

ہارورڈ یونیورسٹی کے محققوں نے دریافت کیا ہے کہ جو مردوزن اپنا غصہ باہر نکال دیں، امراضِ قلب میں بہت کم مبتلا ہوتے ہیں۔ جبکہ دبا ہوا غصہ دل کو لے بیٹھتا ہے۔

(10) اُسپرین لیجیے......

امریکی و برطانوی ماہرین نے امراضِ قلب دور کرنے میں اُسپرین کو مفید پایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ خون کا دباؤ کم کرتی ہے۔ تجربات سے پتا چلا ہے کہ جو مردوزن یہ دوا باقاعدگی سے کھائیں، ان کا قلب صحت مند رہتا ہے۔ مؤثر فائدہ اٹھانے کے لیے رات کو سونے سے قبل اسپرین لیجیے۔

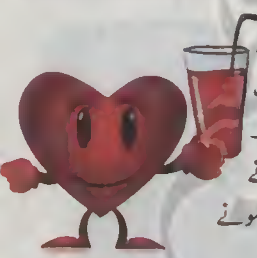

(11) کرین بیری (Cranberry) رس پیجیے......

امریکی ماہرین نے ایک تجربے میں فربہ مردوزن کو ایک ماہ تک کرین بیری کا رس پلایا۔ ان میں بُرا (HDL) کولیسٹرول 10 فیصد تک ختم ہوگیا۔ یہ کمی دل کا دورہ پڑنے کا امکان 40 فیصد تک ختم کردیتی ہے۔ لہٰذا جیب اجازت دے، تو رس ضرور استعمال کیجیے۔ امریکا میں اسے ''سُپر فوڈ'' کی حیثیت حاصل ہے۔

(12) صبح ناشتا ضرور کیجیے......

جدید تحقیق نے افشا کیا ہے کہ جو لوگ صبح ناشتا کریں، عموماً ان کا وزن نہیں بڑھتا۔ نیز ان میں انسولین مزاحمت بھی جنم نہیں لیتی۔ دو خرابیاں دل کی بیماریاں پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لہٰذا صبح ناشتا کرنا معمول بنالیجیے۔

(13) غذا میں فولک ایسڈ شامل رکھیے......

فولک ایسڈ وٹامن بی کی ایک قسم ہے۔ یہ حیاتین نئے خلیے بنانے میں کام آتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے جو

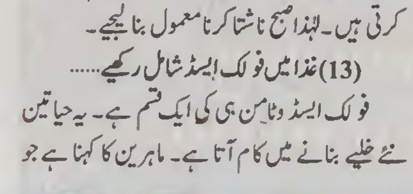

مردوزن اس کی مطلوبہ مقدار لیں، وہ امراضِ قلب میں کم ہی مبتلا ہوتے ہیں۔ لہٰذا فولک ایسڈ رکھنے والی غذائیں روزمرہ خوراک میں شامل

رکھیے۔ یہ حیاتین گائے کے جگر، ساگ، چاول، شاخ گوبھی اور پھلیوں میں ملتا ہے۔ بچوں کی روزانہ ضرورت 200 جبکہ بالغوں کی 400 ایم سی جی (مائکروگرام) ہے۔

(14) سیڑھیاں چڑھیے......

ایک تجربے سے افشا ہوا ہے کہ جو لوگ روزانہ چار پانچ ہزار قدم پیدل چلیں، ان میں خون کا دباؤ معمول پر رہتا ہے۔ یوں وہ امراضِ قلب کا شکار نہیں ہوتے۔

(15) پتوں والی سبزیاں کھائیے......

سبزیاں اور انڈے کی زردی اپنے اندر ایک صحت بخش کیمیائی مادہ، لوتین(Lutein) رکھتی ہیں۔ یہ مادہ قلب کو بیماریوں سے بچانے والے ضِد تکسیدی مادے خلیوں اور بافتوں تک پہنچاتا ہے۔

(16) ثابت اناج استعمال کیجیے......

امریکی محققوں نے دریافت کیا ہے کہ ثابت اناج کھانے والوں میں دل کی بیماریاں جنم لینے کا خطرہ 20 فیصد تک کم ہوجاتا ہے۔

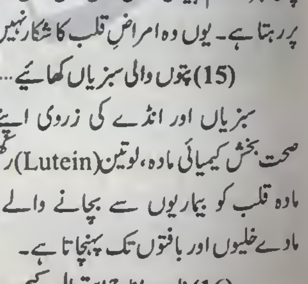

(17) زیادہ چائے لیجیے......

امریکی ہارٹ ایسوسی ایشن کا مشورہ ہے کہ دن میں دو پیالی چائے ضرور لیجیے۔ یوں امراضِ قلب نہیں چمٹتے۔ وجہ، چائے میں فلاوونوئیڈ(Flavonoids) مرکبات پائے جاتے ہیں۔ یہ مرکب نہ صرف نالیوں میں تناؤ دور کرتے ہیں بلکہ خون کو بھی پتلا کر دیتے ہیں۔ یوں نالیوں میں لوتھڑے پیدا نہیں ہوتے۔

(18) ورزش کے بعد بی پی (بلڈ پریشر) چیک کیجیے......

اس عالم میں چیک کرنے پر نمبر بلند (ہائی) ہوں گے۔ لیکن یوں صحت کی مجموعی حالت بھی پتا چل جاتی ہے۔ اگر یہ چیک ڈاکٹر کے ذریعے کرایا جائے، تو زیادہ بہتر ہے۔

(19) کیفین سے پرہیز ضروری ہے......

اس مادے کے حامل مشروبات انسان میں خون کا دباؤ بڑھاتے ہیں۔ عموماً فی منٹ دل کی دھڑکن دو بار

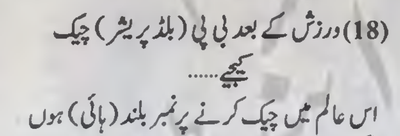

بڑھ جاتی ہے۔ یہ حالت امراضِ قلب میں مبتلا انسان کو ''ڈینجرزون'' میں پہنچانے کے لیے کافی ہے۔

(20) دوست بنیے اور بنائیے......

دوستی قدرت کی عظیم نعمت ہے۔ اب یہ طبی لحاظ سے بھی مفید ثابت ہوگئی ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ تنہا انسان ''ڈپریشن'' کا صحیح طرح مقابلہ نہیں کر پاتا اور بہت جلد امراضِ قلب میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ مگر دوست

احباب رکھنے والے مردوزن پریشانی اور بے چینی سے چھٹکارا پانے میں کامیاب رہتے ہیں۔

(21) گہرے رنگ کی چاکلیٹ منتخب کیجیے......

چائے کی طرح کوکا بھی خون پتلا کرنے والے فلاوونوئیڈ مادے رکھتا ہے۔ نیز چاکلیٹ کی ایک تہائی مقدار اولیک تیزاب رکھتی ہے۔ یہی مفید مونوان سیچوریٹڈ چکنائی زیتون کے تیل میں ملتی ہے۔ تاہم یاد رکھیے، فلاوونوئیڈ گہری رنگت والی چاکلیٹ میں ملتی ہے۔

(22) نمک کو نکال باہر کریں......

اگر آپ کا وزن زیادہ ہے، تو نمک ہرگز استعمال نہ کریں۔ ورنہ دل کی کسی بیماری سے جاں بحق ہونے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔

(23) بیگم سے تعلقات خوشگوار رکھیے......

امریکی یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا کے محققوں

نے تجربات سے جانا ہے کہ پریشان کن لمحات میں اگر میاں یا بیوی محض دس منٹ تک اپنے ساتھی کا ہاتھ تھامیں، تو بلڈ پریشر اور نبض کی رفتار کم ہونے میں مدد ملتی ہے۔

(24) ٹماٹر کی چٹنی معتدل مقدار میں کھائیے......

ٹماٹر میں لائکوپین مادہ ملتا ہے۔ یہ خون کی نالیوں میں کولیسٹرول جمع نہیں ہونے دیتا۔ لہٰذا ٹماٹر کی خالص چٹنی معتدل مقدار میں استعمال کیجیے۔

(25) وٹامن بی کی روزانہ مطلوبہ مقدار لیجیے......

جدید طب نے دریافت کیا ہے کہ جن لوگوں کی غذا میں وٹامن بی کی مقدار کم ہو، وہ امراضِ قلب کا شکار ہوجاتے ہیں۔

(26) مچھلیوں سے رغبت رکھیے......

مچھلیوں میں ایک مادہ، اومیگا تھری ملتا ہے۔ یہ دل کے عضلات کو قوی کرتا، فشارِ خون کم کرتا اور خون میں لوتھڑے بننے سے روکتا ہے۔ نیز جسم میں جان لیوا سوزش بھی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ مزید برآں مچھلی پروٹین بھی فراہم کرتی ہے۔

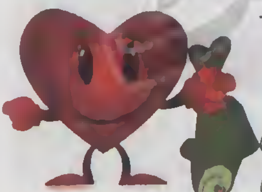

(27) السی کے بیج کھائیے......

جو مردوزن مچھلی نہیں کھاتے، وہ السی کے بیج غذا میں شامل رکھیں۔ یہ اومیگا تھری مادوں کا عمدہ ذریعہ ہیں۔

(28) دوڑتے ہوئے تنوع رکھیے......

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انسان کا 10 تا 15 فیصد وزن بھی کم ہوجائے، تو انسانی جسم میں ذخیرہ شدہ چربی 25 تا 40 فیصد کم ہوجاتی ہے اور وزن کم کرنے کا ایک طریقہ دوڑنا ہے۔ اب تجربات سے افشا ہوا ہے کہ انسان بھاگتے ہوئے تیز اور کبھی آہستہ دوڑے، تو یوں وزن یکساں رفتار سے بھاگنے کی نسبت جلد کم ہوتا ہے۔

(29) کشتی رانی کیجیے......

ڈاکٹر دل کی بیماریوں میں مبتلا افراد کو مشورہ دیتے ہیں کہ کشتی رانی کیجیے۔ یہ بھاگنے سے بہتر ہے۔ وجہ یہ

ہے کہ کشتی چلاتے ہوئے زیادہ عضلات استعمال ہوتے ہیں۔ دل پورے جسم میں زیادہ خون پمپ کرتا ہے۔جس کے باعث یوں قلب کو مجموعی صحت حاصل ہوتی ہے۔

(30) فلو کا ٹیکا لگوایئے......

برطانوی ڈاکٹروں نے بعداز تحقیق جانا ہے کہ جو مردوزن فلو کا ٹیکا لگوائیں، وہ نہ لگوانے والوں کی نسبت امراضِ قلب میں مبتلا ہوتے ہیں۔

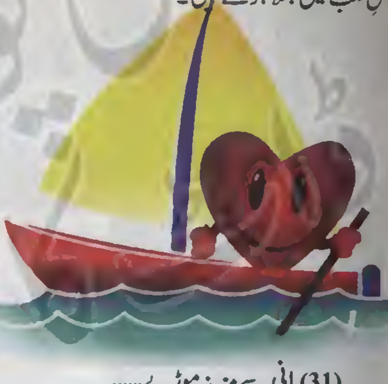

(31) پانی سے منہ نہ موڑیے......

امریکی لوما نڈا یونیورسٹی کے محقق زوردار انداز میں سبھی کو مشورہ دیتے ہیں کہ روزانہ پانچ چھ گلاس پانی ضرور پیجیے۔ یوں دل کی بیماریاں چمٹنے کا خطرہ 60 فیصد تک کم ہو جاتا ہے......سگریٹ نوشی ترک کرنے، بُرا (ایل ڈی ایل) کولیسٹرول کم کرنے اور وزن گھٹانے سے بھی انسان کو یہی فائدہ ملتا ہے۔

(32) گریپ فروٹ کھایئے......

یہ بڑے کام کا پھل ہے۔ صرف ایک گریپ فروٹ روزانہ کھانے سے خون کی نالیوں میں رکاوٹیں دور ہوتی ہیں، بُرے کولیسٹرول کی مقدار 10 فیصد تک کم ہوتی اور بلڈ پریشر نارمل رہتا ہے۔

(33) ادرک غذا میں شامل رکھیے......

یہ قدرتی جڑی بوٹی کولیسٹرول کم کرتی اور چھوت (الرجی) کو دور بھگاتی ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہارٹ اٹیک یا آپریشن کے بعد دل کو صحت مند بناتی ہے۔ ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ جن جانوروں کو روزانہ ادرک کھلائی جائے، وہ دوسروں کی نسبت دل کی حفاظت کرنے والے ضِد تکسیدی مادے زیادہ رکھتے ہیں۔

(34) کرومیم لیجیے......

جن مردوزن کی غذا میں کرومیم کم ہو، وہ دوسروں کی نسبت جلد امراضِ قلب کا نشانہ بنتے ہیں۔ بالغ کو روزانہ 200 تا 400 مائیکروگرام کرومیم درکار ہوتا ہے اور عموماً غذا سے یہ مقدار حاصل نہیں ہو پاتی۔ لہٰذا جو دل کے مریض ہوں وہ بذریعہ دوا یہ معدن لیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ ملٹی وٹامن لیں جس میں کرومیم پائکولائنیٹ (Picolinate) موجود ہو۔ کرومیم کی یہ مصنوعی قسم انسانی بدن میں با آسانی جذب ہوتی ہے۔

(35) اُٹھک بیٹھک کام آئے گی......

جی ہاں! کینیڈین ماہرین نے آٹھ ہزار مردوزن پر تجربہ کرنے کے بعد جانا ہے کہ جو ایک منٹ میں زیادہ سے زیادہ اُٹھک بیٹھک کرے۔ وہ دوسروں کی نسبت ''13 سال'' زیادہ جیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ پیٹ کے عضلات مضبوط رکھتا ہے اور وہاں چربی کا نام و نشان نہیں ہوتا اور پیٹ پر چربی جتنی کم ہو، دل کی بیماریاں بھی اتنی ہی کم چمٹتی ہیں۔

اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

● 600 روپے کی غیر معمولی بچت پایئے ● اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے

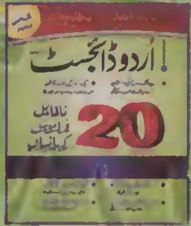

اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے
معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دِلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُرلطف بنایئے

قیمت فی پرچہ -/100 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1250 روپے	200 روپے	1450 روپے	850 روپے	600 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ____________ فون نمبر ____________

پتا ____________ ای میل ____________

میں ماہ ________ 20ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم -/850 روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے -/850 روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر 110-800380 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔ یا

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا

5۔ ہمیں 0301-8431886 پر ایس ایم ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ ____________ دستخط ____________

سرکولیشن منیجر۔ سمن آباد۔ لاہور 54500۔ پاکستان۔ فون نمبر: 35290738-42-92+ 37589957-42-92+
ای میل: subscription@urdu-digest.com ویب سائٹ: urdudigest.pk فیکس: 35290731-42-92+

ہم اُردو ڈائجسٹ کے لیے کیا کریں؟

یہ ہے وہ سوال! جو ہر دوسرا قاری ہم سے کرتا ہے کہ

"وہ اُردو ڈائجسٹ کے 53 سالہ سفر کے ابتدائی سالوں سے اس قافلے میں شامل ہوا تھا اور آج تک شریک سفر ہے۔"

اُردو ڈائجسٹ کبھی بھی ایک کاروبار نہیں تھا۔ یہ اب بھی ایک مشن اور مقصد ہے۔ یہی اس کی خوب صورتی ہے، یہی اس کی مضبوطی ہے۔

اُردو ڈائجسٹ کا معیار اس کے عمدہ کاغذ، بہترین چھپائی اور کٹائی سے نہیں بنتا، یہ پاکستان، عالم اسلام سے جڑی، پختہ سوچ، اچھی روایات اور اپنی نئی نسل سے محبت سے عبارت ہے۔ یہی فکر اس کے لفظوں میں خون بن کر دوڑتی ہے اور اسے زندہ رکھتی ہے۔

لوگ اسے ایک کلو سبزی یا پھل کا ہم وزن اور ہم قیمت سمجھ کر اس سے محبت نہیں کرتے۔ کچھ اور ہے جو انھیں اُردو ڈائجسٹ سے جوڑے رکھتا ہے اور پھر مجبور کرتا ہے کہ وہ پوچھیں

آخر ہم اُردو ڈائجسٹ کے لیے کیا کریں؟

ہم نے بھی بہت غور کیا، سوچا، پھر لگا آپ ہی سے بات کی جائے۔ آپ ہی کے دل کی تاروں سے آتی آواز کے ساتھ آواز ملائی جائے۔

آپ اپنے پرانے اسکول، کالج کے ذہین ترین طلبہ کے لیے اپنی طرف سے اُردو ڈائجسٹ کا تحفہ بھجوا سکتے ہیں۔ وہاں پڑھانے والے تمام اساتذہ کے نام سالانہ خریداری کروا سکتے ہیں۔ یہ تعداد 10 شماروں سے 100 شماروں تک ہوسکتی ہے۔ یا اس زیادہ جتنا آپ چاہیں!

ہم انھیں آپ کی طرف سے ایک خوبصورت خط اور کارڈ لکھ کر آپ کے محبت سے بھرے اس تحفے کو ان تک پورا سال پہنچائیں گے۔

اس تحفے کی مالیت کم سے کم 5 سے 10 ہزار روپے ہوسکتی ہے۔

یہ اس ادارے کے اساتذہ اور طلبہ کو پورے ایک سال تک آپ کی یاد دلاتا رہے گا۔

اپنا تحفہ بھجوانے کیلئے اپنے پرانے اسکول کا نام اور پتا بنائیے، فون کیجیے، ڈرافٹ بھجوایئے یا آن لائن فنڈز ٹرانسفر کرائیے۔

یہ فیصلہ آپ کو خوشی دے گا اور آپ کی وجہ سے نئی نسل کو علم و عافیت کا پیغام پہنچے گا۔

اختر عباس (ایڈیٹر اُردو ڈائجسٹ) 0300 9468746

دکھ بھری کہانی

کسی اور ملک میں یہ سانحہ ہوتا' تو سمیعہ نذیر کا کارنامہ نصاب کا حصہ ہوتا اور وہ قومی ہیرو قرار پاتی

سانحے فراموش کرنے میں ہم کس پر چلے گئے ہیں

گجرات سے 25 کلومیٹر دور منگوال میں جلنے والے بچوں کی یادیں انھیں بھولنے نہیں دیتیں

حنا انور

تحقیق نہ تفتیش نہ قانون سازی
18 بچے زندہ جل کر مر گئے
اس دردناک سانحے کا
راستہ اب تک بند نہیں کیا گیا

زندہ جل جانے والے بچوں کے والدین سے ملنے کے بعد حنا انور بتاتی ہیں کہ ایک دکھ بھری کہانی یہ بھی ہے کہ جس بہادر ٹیچر نے جلتی وین سے اپنی جان پر کھیل کر بچوں کو بچایا، اس پر کسی نے پروگرام کیا، نہ حکومت نے بہادری اور فرض شناسی کا ایوارڈ دیا۔

اعتراف خدمت کے لیے ہمیں فلمی ستاروں ہی کی ضرورت کیوں رہتی ہے؟

باجی

میں گاڑی چلا رہا ہوں ہاتھ خالی نہیں۔ آپ ذرا پٹرول پمپ آنے تک یہ بوتل پکڑ لیں۔ ارے بھائی یہ کیا ہے؟ میں نے حیرانی سے پوچھا' تو ڈرائیور کہنے لگا۔

باجی! پٹرول کی بوتل ہے اور کیا ہے اس میں۔ گاڑی میں گیس ختم ہوگئی ہے اب جب تک کوئی سی این جی اسٹیشن نہیں آتا گاڑی پٹرول ہی پر چلاؤں گا نا۔ میں نے کہا بھائی' ٹینکی میں پٹرول نہیں ہے جو یوں پٹرول سے بھری بوتل ہاتھ میں پکڑنا پڑ رہی ہے۔ کہنے لگا ٹینکی' تو جب سی این جی کٹ لگوائی تھی تب ہی نکلوا دی تھی اب کون اتنا مہنگا پٹرول ڈلوائے۔ میں جہاں سے گاڑی ٹھیک کرواتا ہوں اس ورکشاپ والے نے مشورہ دیا تھا کہ ٹینکی بیچ دو' سی این جی کٹ لگوانے کے بعد کیا فائدہ خالی پڑی رہے گی۔ میں نے سوچا چلو چار پیسے ہاتھ آ جائیں گے۔ اور اِن چار پیسوں کے لیے آپ نے اتنا بڑا خطرہ مول لے لیا...... میں نے پوچھا۔ کہنے لگا اوہ باجی آپ تو ایسے ہی ڈر گئیں خطرے والی کیا بات ہے پٹرول کون سا باہر گر رہا ہے' وہ دیکھو پائپ سے سیدھا کاربوریٹر کے اندر ہی جا رہا ہے اور ہم نے کون سا آگ میں گاڑی کی بازیاں لگوانی ہیں۔ میں نے ابھی مزید کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے سگریٹ سلگا لیا جو کہ کسی طرح آگ میں گاڑی کی بازیاں لگوانے سے کم نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میں تو خوفزدہ ہوگئی جبکہ ڈرائیور کہنے لگا باجی بڑا چھوٹا دل ہے آپ کا! دے دیں بوتل میں آگے ہی کہیں رکھ لیتا ہوں' نہیں لگتی آگ ویسے بھی وہ دیکھیں سی این جی اسٹیشن آ گیا! اور میں حیرت زدہ سوچ رہی تھی کہ اگر آگ لگ گئی' تو یہ خود بھی مرے گا ساتھ گاڑی میں موجود ہم 25-30 لوگوں کو بھی مروائے گا اور دل سے یہ دعا نکلی کہ اللہ ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھے ورنہ اس ڈرائیور نے تو حادثے کے تمام لوازمات تیار کر رکھے ہیں۔ میں روزانہ لاہور آتے ہوئے اسی تجربے اور مشاہدے سے گزرنے کی عادی ہوگئی تھی۔ ایک روز محترم ایڈیٹر صاحب سے ذکر کر بیٹھی۔ انھوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ آپ جانتی ہو گجرات میں کیا ہوا تھا؟ میرا جواب نفی میں سُن کر انھوں نے اگلے ہی روز مجھے گجرات جانے کا حکم سنا

عبداللہ اشتیاق

جب آگ لگی' تو ثقلین اشتیاق نے عبداللہ کو اپنے بازوؤں میں لیا ہوا تھا۔ اس کے بازو بعد میں بھی اسی طرح مڑے ہوئے ملے۔ سوچ رہا ہوگا کسی طرح اپنے بھائی کو بچالے۔

ثقلین اشتیاق

دیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ جس سانحے میں بچے زندہ جل گئے اور کئی گھروں کے چراغ بجھ گئے۔ اس کی وجہ میری جانی پہچانی تھی۔

گجرات کے نواح میں قائم دی جناح اسکول کی وین میں آگ بھی پٹرول کی لیکج کے باعث لگی تھی۔ راجے کی گاڑی کے پاس گاڑی کی تاروں سے چنگاری نکلی' تو گاڑی میں موجود پٹرول سے بھرے دو کنستروں نے فوراً آگ پکڑ لی اور آناً فاناً پوری وین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ابتدائی آنے والی خبروں میں یہی کہا جاتا رہا کہ وین میں آگ سلنڈر پھٹنے سے لگی ہے۔ لیکن بعد میں آل پاکستان سی این جی ایسوسی ایشن کی جانب سے یہ بیان آیا کہ وین میں آگ لگنے کی وجہ گیس سلنڈر نہیں بلکہ پٹرول تھا، جب ڈرائیور نے گاڑی کو سی این جی سے پٹرول پر لانا چاہا' تو شارٹ سرکٹ سے گاڑی میں آگ لگ گئی۔

حقیقت تو اللہ بہتر جانتا ہے کیونکہ اس سانحے کے بعد نہ تو کوئی تحقیقی کمیٹی تشکیل دی گئی اور نہ ہی مستقبل میں ایسے حادثات سے بچنے کے لیے کسی قسم کی منصوبہ بندی کی گئی۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسے سانحات کو بہت جلد فراموش کر دیا جاتا ہے۔ حادثہ چند دنوں کے لیے اخبارات کی شہ سرخیوں میں رہتا ہے پھر نہ صرف اخبارات سے بلکہ ہمارے ذہنوں سے بھی معدوم ہو جاتا ہے۔

اس سانحے کا سب سے اندوہناک المیہ یہ بھی تھا کہ جاں بحق ہونے والے بچوں میں ایک ہی خاندان کے تین تین چار چار بچے شامل تھے۔ قابل فخر اور بہادر ٹیچر سمیعہ نذیر کے چار بھتیجے، بھتیجیاں بھی اس وین میں سوار تھے جن میں سے تین بچے جاں بحق ہوئے جبکہ ایک بچی صفعہ CMH کھاریاں میں زیر علاج ہے۔ اسی طرح 10 سالہ حسنات احمد، عبیرہ حفیظ اور حمدان آپس میں کزن تھے ان میں حسنات موقع ہی پر جاں بحق ہوگیا جبکہ حمدان اور عبیرہ ہسپتال میں ہیں۔ آفتاب، احمد اور طاہر تین ہی بھائی تھے اور یہ تینوں موقع ہی پر جاں بحق ہوئے۔ بارہ سالہ ثقلین اشتیاق اور 6 سالہ عبداللہ اشتیاق بھی موقع پر جاں بحق ہوئے جبکہ اسی دن عبداللہ کی سالگرہ بھی تھی جو اس نے اسکول سے واپسی پر منانی تھی' لیکن قدرت کی طرف سے موقع ہی نہیں ملا۔ اسی طرح

حسنات احمد

آپ تو میری امی ہیں۔ جب میں پاپا کے پاس باہر جاؤں گا' تو آپ کو ساتھ لے جاؤں گا اور جب میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا' تو آپ کو حج کرواؤں گا: حسنات احمد

ہاشم

ریحان سجاد اور سلیمان سجاد دونوں بھائی تھے ان میں سے ریحان موقع ہی پر جاں بحق ہوا جبکہ سلیمان 11 دن CMH کھاریاں میں زیر علاج رہنے کے بعد خالقِ حقیقی سے جاملا۔ محمد حارث تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ وین میں اس کی دو بہنیں بھی موجود تھیں لیکن وہ دونوں کھڑکی سے کود گئی تھیں اس لیے زندہ بچ گئیں۔ ان دونوں کے ساتھ آٹھ سالہ آمنہ نے بھی کھڑکی سے کودنا چاہا لیکن اس کے سارے کپڑوں کو آگ لگ چکی تھی، وہ بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور موت کی وادی میں جا پہنچی۔ بے حس ڈرائیور موقع سے فرار ہو گیا۔ ہو سکتا ہے اگر وہ ذرا کوشش کرتا، تو اتنا جانی نقصان نہ ہوتا۔ اس سانحے سے پورا ملک سوگ میں ڈوب گیا، پورے میڈیا میں ہلچل مچ گئی۔ ماؤں کے جگر گوشے کوئلے بن کر منوں مٹی تلے جا سوئے۔ ان کے غم کا کیا عالم ہوگا، گاؤں کی سیدھی سادھی عورتیں کیمروں کے سامنے واویلا کرنے سے گریزاں تھیں۔ لیکن کون ہے جو ان کی آواز سنے اور آئندہ ایسے دلخراش، افسوسناک واقعات سے بچنے کی منصوبہ بندی کر سکے۔ ان ڈیڑھ درجن بچوں کی ماؤں کے کٹے پھٹے دلوں کا حال پڑھ کر شاید کوئی ایسا حفاظتی انتظام سوچنے کی ترغیب ملے جس سے ایسے سانحات کی روک تھام ہو سکے۔ یہی سوچ کر میں گجرات روانہ ہوئی تھی۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ ان بچوں کے گھروں تک کیسے پہنچا جائے۔ اس کے لیے جناب ضیغم مغیرہ اور ڈاکٹر طارق سلیم کا تہِ دل سے شکریہ جنھوں نے ایڈیٹر صاحب کے ایک فون کے بعد سارے انتظامات کروائے اور ہمیں ان بچوں کے گھروں میں جا کر ان کی ماؤں سے ملنے کا موقع ملا۔ جو اپنے کمسن بچوں کی موت پر بھی صابر و شاکر روزہ دار کی طرح حوصلے سے کہہ رہی تھیں اللہ کی یہی مرضی تھی، لیکن کیا تھا جو اس تکلیف کے ساتھ وہ اس دنیا سے نہ جاتے۔

کتنا بڑا دل ہے ان ماؤں کا جنھوں نے اپنی گودوں کے اجڑنے کے باوجود اللہ پر اپنے ایمان اور اعتماد کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔

سجاد صاحب 105 حلقہ میں جماعت اسلامی کی طرف سے حالیہ الیکشن 2013ء میں MPA کی نشست کے امیدوار تھے، کا بھی شکریہ سمیعہ نذیر جیسی فدا ہو جانے والی بہادر اور باہمت ٹیچر ان کی بہن تھیں۔ ان کے تین بھتیجے بھتیجیاں بھی اس حادثے میں جاں بحق ہوئے تھے۔ گھر میں موت کی اداسی چھائی ہونے کے باوجود انہوں نے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

گجرات سے 25 کلو میٹر دور منگووال کی جانب بڑھتے ہوئے دل میں یہی خیال تھا کہ وہاں جا کر بات کیسے کروں گی۔ یہ بھی خیال آیا

محمد ریحان   محمد سلیمان

کہ خواتین اپنے پیاروں کی موت پر سینہ کوبی کر رہی ہوں گی اونچی اونچی رونے کی آوازوں میں کیسے میری بات سن پائیں گی اور کس طرح میرے سوالوں کا جواب دیں گی۔ لیکن وہاں جا کر جو دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ سب کی سب مائیں صبر والی اور سلجھی ہوئیں۔ سب سلیقے اور تحمل سے بات کرتی ہوئی ملیں۔ اپنے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے وہ سامنے اپنے بچوں کو دیکھ رہی ہوں۔ یوں اُس سانحے کے دن اپنے بچوں سے آخری ملاقات کا ذکر انھوں نے سنایا وہ کسی بھی صاحب دل کو رُلا سکتا ہے......

کیا تھا جو ہمارے بچے اس تکلیف کے ساتھ
اس دنیا سے نہ جاتے

12 سالہ ثقلین اشتیاق اور 8 سالہ عبداللہ اشتیاق کی والدہ شاہدہ پروین نے بتایا، اُس دن اسکول جانے کے لیے تیار ہوئے تو بالکل ضد نہیں کی کہ نہیں جانا۔ عبداللہ کو اسکول میں Birth Certificate چاہیے تھا۔ لیکن وہ ابھی ہم نے کارپوریشن کے دفتر سے نکلوانا تھا۔ وہ جاتے ہوئے خوفزدہ تھا کہ اُس کے ٹیچر اُسے ماریں گے۔ میں اسے بہلاتی رہی کہ اسکول پہنچنے سے پہلے ٹیچر کو فون کر دوں گی۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ میں نے اسی وقت فون ملایا لیکن وہ اُٹھا نہیں رہے تھے، تو میں نے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تاکہ اسے یقین آجائے کہ فون ملا رہی ہوں۔ عبداللہ کی اسی دن سالگرہ تھی۔ میں نے دونوں بھائیوں سے کہا کہ آپ اسکول جاؤ شام کو جب واپس آؤ گے، تو پاپا کیک لے کر آئیں گے۔ پھر ہم سب مل کر عبداللہ کا برتھ ڈے منائیں گے۔ لیکن اب یہ کیک عمر بھر نہ کاٹا جا سکے گا۔

اس دن صبح جب میں اُٹھی، تو عبداللہ میرے پاس روتا ہوا آیا کہ مجھے ثقلین نے مارا ہے۔ میں نے آہستہ سے ثقلین کو تھپڑ لگایا، تو وہ آگے سے ہنسنے لگا۔ اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ مجھ سے اُس کا وہ روشن چہرہ دیکھا نہیں گیا۔ میں نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا کہ کہیں میری نظر ہی نہ لگ جائے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اُسے نظر پہلے ہی لگ چکی ہے۔

کئی دفعہ اسکول والوں سے کہا تھا کہ گاڑی کا کچھ کریں، لیکن پرنسپل کہتے کہ بی بی یہ ہمارا کام ہے۔ آپ بے فکر رہیں...... اب اُن کا کیا گیا ہے جگر کے ٹکڑے تو ہمارے اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ جب آگ لگی تو ڈرائیور اُتر کر بھاگ گیا۔ اپنی جان، تو اس نے بچالی اور بھاگ گیا۔ جبکہ ٹیچر نے اپنی جان کی قربانی دی ہے وہ ایک دفعہ نکل کر پھر واپس گئی۔ اس سے بچوں کی چیخ پکار برداشت نہیں ہوئی۔ وین کے

کسی کو لگتا ہی نہیں تھا کہ ان تمیزدار بچوں کے والدین ان پڑھ ہوں گے

دروازے تو پہلے ہی سے خراب تھے میں جب کبھی بچوں کو وین میں بٹھانے جاتی تھی تو دروازے ہاتھ سے بند ہی نہیں ہوتے تھے۔ ڈرائیور تار سے باندھ کر بند کرتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا تار سے بند دروازہ کھل نہ سکا اور بچے جل کر کوئلہ ہوگئے۔

میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میں ایک ہفتے سے اپنے تیسرے بیٹے احتشام کو اسکول نہیں بھیج رہی تھی۔ میں نے اس کا بھی ایڈمشن کروایا تھا لیکن وہ بہت چھوٹا ہے۔ میں نے سوچا گرمی کی چھٹیوں کے بعد بھیجوں گی۔ حالانکہ اس کے پاپا کہتے تھے کہ اسے بھی بھیجو، لیکن میرا دل ہی نہیں مانتا تھا کہ اسے اسکول بھیجوں۔ میں ہسپتال میں جو بچے زخمی تھے اُن سے ملنے گئی، تو ایک بچے نے مجھے بتایا کہ ثقلین آگے بیٹھا ہوا تھا اور عبداللہ پیچھے تھا لیکن جب آگ لگی، تو بڑے بیٹے ثقلین نے عبداللہ کو اپنے بازوؤں میں لیا ہوا تھا۔ اس کے بازو بعد میں بھی اسی طرح مڑے ہوئے ملے۔ سوچ رہا ہوگا کسی طرح اپنے بھائی کو بچالے۔ اس دن 6:45 پر گھر سے گئے تھے اور 7 بج کر 5 منٹ پر لوگوں نے ہمیں آکر بتایا ہے کہ وین میں آگ لگ گئی۔ دونوں بھائی موقع ہی پر جاں بحق ہوگئے۔ کبھی سوچتی ہوں کاش اس دن انھوں نے ضد کرلی ہوتی، میں انھیں اسکول نہ بھیجتی۔ میرے سے ہی غلطی ہوگئی، اس دن کئی بہانے اور کرلیتی۔

میرے بچے اب بہت اچھی اچھی باتیں سیکھ کر آتے تھے، ہر وقت صاف ستھرے رہتے۔ اسکول میں بچوں سے کہا گیا کہ نہا کر اور دانت صاف کرکے آنا ہے، تو وہ سردیوں میں بھی منہ اندھیرے نہاتے اور ایسا بھی کبھی نہ ہوا کہ دانت صاف نہ کریں۔ چھوٹے کے تو ابھی دودھ کے دانت تھے، تو میں اُسے منع کرتی تھی لیکن وہ کہتا کہ اماں! ٹیچر نے کہا ہے اس لیے بہت ضروری ہے دانت صاف کرنا۔ ان کا ابا آٹھ جماعتیں پڑھا ہے لیکن وہ بھی کہتا کہ یہ دونوں بہت مشکل اور اچھی باتیں کرتے ہیں مجھے، تو سمجھ ہی نہیں آتی۔

وہ سکول میں بچوں کو مار کھاتے نہیں دیکھ سکتا تھا

☆ آفتاب، احمد اور طاہر کی والدہ نے بتایا میرے بچے بہت پیارے تھے۔ چھوٹا آفتاب ابھی چار سال کا تھا اور مجھے کہتا تھا کہ اماں میں بڑا ہو کر گاؤں میں اسکول کھولوں گا اور خود ٹیچر بنوں گا۔ جبکہ بڑا کہتا تھا کہ میں ڈاکٹر بنوں گا۔ کہتا تھا کہ اماں آپ کو پتا ہے باہر کے ملک جا کر بھی پڑھائی ہوتی ہے، میں بھی وہیں سے بڑا ڈاکٹر بنوں گا۔ میں اسے کہتی کہ بیٹا ہماری اتنی حیثیت کہاں! جبکہ وہ کہتا ہمارے اسکول میں بھی ٹیچر بچوں کو مارتے ہیں، تو مجھے ان پر بہت ترس آتا ہے۔ ہم گاؤں میں بہت خوبصورت کوٹھی بنائیں گے اور ہمارا اسکول بھی بہت پیارا اور صاف ستھرا ہوگا۔ اُسے اپنی ٹیچر سمیعہ سے بہت پیار تھا، ہر وقت اسی کی باتیں کرتا تھا۔ ٹیچر بھی اسے بہت پیار کرتی تھی۔ کیا پتا تھا دونوں ایک ساتھ ہی چل بسیں گے۔ کہتا تھا کہ میں اپنے اسکول میں اپنی ٹیچر جیسی اچھی اچھی ٹیچرز رکھوں

محمد سجاد

مجھے سمجھ نہیں آتی اب کس اُمید پر زندگی گزرے گی

گا۔ میں روز انھیں لنچ دینے اسکول جاتی تھی۔ باہر ہی سے چوکیدار کو پکڑا کر آجاتی تھی اور کبھی بھی ٹیچر سے نہیں ملی۔ ایک دفعہ ٹیچر نے پیغام بھیجا کہ اپنی امی کو لے کر آنا، تو میں نے فون ہی پر بات کرلی اور کہا کہ ہم غریب لوگ ہیں، ہمیں تو بات کرنا بھی نہیں آتی۔ آپ سے کس طرح ملیں؟ تو ٹیچر نے کہا ' آپ کے بچے تو اس قدر تمیز والے ہیں کہ لگتا ہی نہیں آپ لوگ اَن پڑھ ہوں گے۔

اماں آپ کو پتا ہے باہر کے ملک جاکر بھی پڑھائی ہوتی ہے، میں بھی وہیں سے بڑا ڈاکٹر بنوں گا: احمد
☆......☆
اماں! میں بڑا ہو کر گاؤں میں اسکول کھولوں گا اور خود ٹیچر بنوں گا...... اماں! اگر آپ کو پڑھنا آتا ہوتا، تو میں آپ کو دکھاتا کہ مجھے کتنے گڈ اور سٹار ملتے ہیں: آفتاب

میرے بچے اب بہت اچھی اچھی باتیں سیکھ کر آتے تھے، ہر وقت صاف ستھرے رہتے۔ اسکول میں بچوں سے کہا گیا کہ نہا کر اور دانت صاف کر کے آنا ہے، تو وہ سردیوں میں بھی منہ اندھیرے نہاتے اور ایسا بھی کبھی نہ ہوا کہ دانت صاف نہ کریں۔ چھوٹے کے تو ابھی دودھ کے دانت تھے، تو میں اُسے منع کرتی تھی لیکن وہ کہتا کہ اماں ٹیچر نے کہا ہے اس لیے بہت ضروری ہے دانت صاف کرنا۔ ان کا ابا آٹھ جماعتیں پڑھا ہے لیکن وہ بھی کہتا کہ یہ دونوں بہت مشکل اور اچھی باتیں کرتے ہیں مجھے، تو سمجھ ہی نہیں آتی۔

چھوٹا آفتاب کہتا تھا کہ اماں اگر آپ کو پڑھنا آتا ہوتا، تو میں آپ کو دکھاتا کہ مجھے کتنے گڈ اور سٹار ملتے ہیں۔

ہر کوئی میرے بچوں کی تعریف کرتا تھا۔ وہ بہت دھیان سے پڑھتے تھے۔ میرا دل بہت خوش ہوتا تھا کہ اگرچہ ہم مشکلیں جھیل کر ان پر خرچ کر رہے ہیں لیکن کوئی بات نہیں ایک دن یہ پڑھائی ان کے کام آجائے گی۔ لیکن انھوں نے دنیا میں رہنا ہی نہیں تھا، شاید اس لیے بہت اچھے تھے۔ جب کسی کو بتاتے کہ ہم ان کے والدین ہیں، تو لوگ حیران رہ جاتے۔ اس دن تینوں تیار ہو رہے تھے، میں نے ان کے جوتے پالش کرکے دیے۔ دونوں چھوٹوں کو لاسٹک والی ٹائیاں لگائیں جبکہ بڑا اب خود ٹائی باندھنے لگا تھا ہمیں تو باندھنی نہیں آتی تھی لیکن اُس نے خود کہیں سے سیکھا تھا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے اسے ٹائی باندھ کر جاتے ہوئے۔

اب کس اُمید پر زندگی گزرے گی، مجھے سمجھ نہیں آتی۔ میرے تینوں بیٹے نہیں رہے لوگوں کو شاید امید ہو اُن کے اور بچے ہو جائیں گے، لیکن مجھے تو ایسی بھی کوئی اُمید نہیں۔ خدا کرے جیسے ہمارا گھر اُجڑا ہے ویسے کسی اور کا گھر نہ اُجڑے۔ اتنا کہتے ہوئے اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اس دن سب کچھ جلدی جلدی ہوگیا

☆ حسنات کی والدہ اس کی بہن کے پاس

ہسپتال میں تھی' تو اس کی نانی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا اللہ کرے میری نواسی اور پوتا جو ہسپتال میں ہیں وہ ٹھیک ہوجائیں۔ہمیں چھوڑ کر جانے والا میرا حسنات مجھے بہت پیارا تھا۔ میری بیٹی کا شوہر ملک سے باہر رہتا ہے' اس لیے یہ لوگ ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ 10 سالہ حسنات دو بہنوں کا ایک ہی بھائی تھا۔

حسنات ہمیشہ فرسٹ آتا تھا۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ آپ تو میری امی ہیں۔ جب میں پاپا کے پاس باہر جاؤں گا' تو آپ کو ساتھ لے جاؤں گا اور جب میں بڑا ہوکر پائلٹ بنوں گا' تو آپ کو حج کرواؤں گا۔ جب بھی جمعے کا دن ہوتا وہ شلوار قمیص پہن کر سب سے پہلے مسجد چلا جاتا۔ اس دن صبح اُٹھا' خود ہی تیار ہوا۔ میں نے ناشتا بنا کر دیا' تو مجھے کہتا ہے امی مجھے لسی چھان کر دیں میں نے چھان کر دی' تو ابھی پوری پی بھی نہیں تھی کہ وین آگئی۔ جلدی سے جوتے پہنے اور اُنھیں دیکھ کر کہتا ہے کہ آپ نے جوتے چمکائے نہیں ہیں۔

ہاشم دو تین دن سے مرنے کی باتیں کرتا تھا

پتا نہیں کیا بات تھی کہ ہاشم دو تین دن سے مرنے کی باتیں ہی کرتا رہتا تھا۔ کبھی کہتا ماما اگر آپ مرگئیں' تو میں بہت روؤں گا اور اگر میں مرگیا' تو کیا آپ بھی روئیں گی؟ میں اسے ڈانٹ کے چپ کراتی اور کہتی کہ بیٹا اللہ سے زندگی مانگتے ہیں، ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اب مجھے سمجھ آیا کہ کیوں اُسے پہلے ہی سے ایسے خیالات آرہے تھے۔ بہت شرارتی اور ذہین بھی تھا۔ ایک دفعہ موسم بہت خراب تھا اور یہ کھیلتا ہوا کہیں دور نکل گیا۔ میں اُسے ادھر اُدھر ڈھونڈتی رہی، آخر گھر سے تھوڑے فاصلے پر وہ مل تو گیا لیکن جب جب بادل گرجتا تھا، یہ سوچ کر میری جان نکلتی جاتی تھی کہ کہیں بادلوں کی گھن گرج سے ہاشم ڈر نہ جائے۔ مجھے ہمیشہ اس کی فکر رہتی تھی۔ کچھ دن پہلے اسکول میں ٹیچر نے اسے مارا بھی کہ یہ گاڑی کے نیچے آنے لگا تھا۔ میں جب بھی ٹیچر سے جاکر کہتی کہ اسے نہ مارا کریں' تو وہ کہتے بی بی یہ اسکول کے مسئلے ہیں آپ بار بار آکر تنگ نہ کیا کریں۔ لیکن ٹیچر کیا جانیں کہ ہماری جان بچے میں ہوتی ہے۔ کیسے نہ جاکر کہیں کہ انھیں مت مارو۔

پتا نہیں حکومت کہاں سوئی رہتی ہے قانون تو بنا دیا کہ بچوں کو مارو نہیں مگر مارنے والے کا ہاتھ بھی تو کوئی نہیں پکڑتا۔

ہاشم کو ڈرائنگ کا بہت شوق تھا۔ نہ صرف گھر بلکہ محلے میں بھی یہ ہر کسی کا پیارا تھا جو اس کے بابا کے دوست تھے وہ اس کے بھی دوست تھے۔

حادثے سے ایک دن پہلے میں نے اس کے بالوں میں منہدی لگائی تھی۔ وہ مجھے کہتا رہا کہ میرے ہاتھ پر بھی لگائیں' لیکن میں نے کہا کہ لڑکے ہاتھوں پر منہدی نہیں لگاتے۔ ویسے بھی یونیفارم کی شرٹ پر منہدی کا رنگ لگ جائے گا۔ وہ اتنا جل گیا تھا کہ پہچاننا مشکل تھا۔ سوچتی ہوں تو دل دہل جاتا ہے کہ پہلے اس کی کیا چیز جلی ہوگی۔ اس دن اتنی ضد کررہا تھا کہ چھٹی کرنی ہے لیکن میں نے نہیں کرنے دی۔ پہلے بھی جب کبھی چھٹی کرتا تھا' تو ہفتے کو کرتا تھا۔ میں کہا کرتی تھی کہ ہفتہ بہت اہم ہے۔ ہماری زندگی میں اس دن ہاشم نے ضرور ہی چھٹی کی ضد کرنی ہوتی ہے۔ کیا پتا تھا کہ یہ دن ہی اسے ساتھ لے جائے گا۔ اس کے بابا باہر ہوتے تھے' ان سے ویڈیو پر بات کرتا رہتا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے جب اس کے پاپا باہر

میں نے کہا لاؤ میں کپڑے سے صاف کردوں' تو وہ جلدی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے آواز دی کہ پیسے تو لے' تو کہتا ہے کہ وہ آپ عبیرہ کے ہاتھ بھجوا دیں۔ بس یہ آخری بات کی اُس نے۔ اُس دن سب جلدی جلدی ہوگیا۔ وین بھی بہت جلدی آگئی۔ عبیرہ نے چائے پی اور کہنے لگی امی آپ میری چُٹیا بہت زور سے کرتی ہیں سر دکھنے لگتا ہے۔ اس کے اتنے لمبے بال تھے سارے ہی جل گئے جو رہ گئے تھے وہ ڈاکٹروں نے کاٹ دیے۔

حسنات ہمیشہ اگلی سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ اُس دن پتا نہیں کیوں پیچھے بیٹھ گیا۔ وہ ہمیں نہ بھولتا ہے اور نہ زندگی میں کبھی بھولے گا، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ باقی دو بچ گئے ہیں اللہ انھیں جلد صحت اور تندرستی دے۔

☆7 سالہ ہاشم کی والدہ نے بتایا کہ میرے تین بچے اس وین میں تھے، دو بچیاں اور ایک بیٹا ہاشم۔ اللہ کا شکر ہے کہ دونوں بچیوں کو معمولی خراشیں آئیں یہ دونوں بتاتی ہیں کہ ہم نے ہاشم کو بہت آوازیں دیں لیکن جو بچے ایک دم باہر نکل گئے بس وہی محفوظ رہے۔ ان کے علاوہ کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا۔ بڑی بیٹی بتاتی ہے کہ جب آگ لگی' تو سب سے پہلے ایک بچے کا جلا ہوا ہاتھ آدھا باہر اور آدھا کھڑکی کے اندر تھا۔ اُسے دیکھ

جانے لگے تو ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگ گیا۔ میرے بھائی نے کہا کیا تم پاپا کے ساتھ بیٹھ گئے ہو؟ ان کو کھانے دو تو کہتا ہے کہ ماموں مجھے کھانے دیں کیا پتا پھر نصیب ہو کہ نہیں وہ اپنے سے بڑی باتیں کرتا تھا۔

کچھ دن پہلے میرے ساتھ مارکیٹ گیا۔ وہ جو جو کچھ کہتا رہا مثلاً کلر پنسلیں، کلر بکس وغیرہ وغیرہ میں سب لے کر دیتی رہی۔ نجانے کیوں میں نے بھی انکار نہیں کیا۔ اب سوچتی ہوں شاید آخری دفعہ اسے شاپنگ کروا رہی تھی اسی لیے اسے انکار نہیں کرسکی۔ اس نے بارہواں سپارہ ختم کرنا تھا۔ صرف ایک صفحہ رہ گیا تھا اور بہت خوش تھا۔ وہ دیکھیں ابھی بھی سپارے کا آخری صفحہ مڑا ہوا ہے۔ موت تو اٹل ہے بس دل میں یہ افسوس رہے گا کہ میرا بچہ اتنی تکلیف میں، یوں زندہ نہ جلتا۔ نہ اسکول کا کچھ گیا ہے اور نہ ڈرائیور کا۔ ہمارا گھر تو خالی ہوگیا ہے۔ بیٹے اتنی آسانی سے کہاں ملتے ہیں۔ ترس ترس کے اللہ سے دعائیں مانگ مانگ کے ایک بیٹا لیا تھا، وہی نہیں رہا۔

☆ اس کی والدہ نے بتایا 8 سالہ آمنہ بہت باتیں کرتی تھی یوں کہہ لیں کہ پورے گھر کی رونق تھی۔ اس کے دادا ابو کہتے تھے۔ آمنہ! تمھارا باتیں کرکر کے منہ نہیں تھکتا، تو آگے سے بس ہنستی رہتی تھی۔ شام کو 5 بجے وہ اسکول ٹیوشن وغیرہ سے فارغ ہوکر گھر آتی تھی۔ اب بھی جب شام کے 5 بجتے ہیں، تو مجھے لگتا ہے کہ دروازہ کھولے گی اور آکر مجھے کہے گی امی میں بہت تھک گئی ہوں۔ رات کو ہمیشہ مجھے کہتی تھی امی میری طرف منہ کرکے سویا کریں ویسے سوتیں ہیں تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں اگر کروٹ لے بھی لیتی تو سوئی اُٹھ جایا کرتی تھی۔ سونے سے پہلے باقاعدگی سے میرا منہ چوم کر سوتی تھی۔ اس دن صبح اسکول جا ہی نہیں رہی تھی مجھے کہتی تھی کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آج میں نے نہیں جانا' لیکن میں نے کہا کہ تھوڑے دنوں میں چھٹیاں ہوجائیں گی، آج چلی جاؤ۔ میں نے زبردستی بھجوایا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں اپنی بیٹی کو موت کے منہ میں بھیج رہی ہوں۔ اس دن نہ جانے کی ضد میں وہ لیٹ بھی ہوگئی۔ وین آئی، تو اس نے ابھی ناشتا کرنا تھا۔ میں نے وین والے سے کہا کہ وہ آگے سے بچوں کو لے آئے واپسی پر آمنہ کو لے جائے۔ اب مجھے لگتا ہے کہ شاید میں اُس دن نہ بھیجتی تو آمنہ بچ جاتی۔ ہمارے گھر میں تو اداسی چھا گئی ہے۔ یہاں رہنے کو دل ہی نہیں کرتا، آمنہ کے ابو سارا دن گھر پہ نہیں ہوتے۔ جب آتے ہیں، تو کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ بس اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں صبر دے۔

کر سب ڈر گئے اور کسی سے بھی گیٹ نہیں کھلا۔ اِن بچیوں کے بھی کپڑے جل گئے تھے۔ چھوٹی پاکیزہ تو وین کی کھڑکی میں پھنس گئی تھی لیکن اسے کسی نے دھکا دیا' تو یہ باہر گر گئی۔ پھر اسے CMH لے جایا گیا۔ اللہ کا شکر ہے اسے زیادہ چوٹ وغیرہ نہیں آئی تھی۔ یہ دونوں جب باہر نکلیں' تو ہاشم کو بھی آوازیں دیتی رہیں لیکن تب تک پوری وین آگ کی لپیٹ میں آ چکی تھی اور کھڑکیوں سے شعلے باہر نکل رہے تھے۔

کہتا تھا ماما، مجھے وین والے بچے سونے نہیں دیتے

آخری رات وہ بالکل نہیں سویا۔ میں کہتی تھی سلیمان آپ سو جاؤ' تو کہتا ماما وہ وین کے بچے مجھے سونے نہیں دیتے۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں، تو

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ پاپا پاپا کہہ کر رو رہی تھی

اس دن جیسے پہلے ہم وین میں جاتے تھے بالکل ویسے ہی جا رہے تھے لیکن جب ہم تھوڑا آگے گئے' تو ہمیں پٹرول کی بُو آنے لگی۔ میں نے حسنات اور ہاشم نے انکل کو کہا بھی کہ ڈرائیور انکل پٹرول کی بُو آ رہی ہے۔ لیکن انکل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گاڑی چلاتے رہے۔ جب آگ تھوڑی سی تھی' تو انکل نے وین روکی اور فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر فون کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ پھیل گئی۔ انھوں نے گیٹ نہیں کھولا۔ ہم سے بھی نہیں کھلا۔ میں نے ہوا کے لیے گاڑی کا شیشہ کھولا ہوا تھا، بس میں وہیں سے آدھی باہر نکل آئی۔ کسی نے پیچھے سے مجھے دھکا دیا' تو میں نیچے گر گئی۔ ہم چار لوگ پیچھے سیٹ پر بیٹھے تھے صرف تین باہر نکل سکے۔ میرے ساتھ آمنہ بھی تھی وہ بھی عجلت میں نکلنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے کپڑوں کو زیادہ آگ لگی ہوئی تھی تو وہ اندر ہی گر گئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر اسے آخری بار دیکھا' تو وہ پاپا پاپا چیخ رہی تھی۔

☆ محمد ریحان اور محمد سلیمان دونوں بھائی تھے، ان کی والدہ نے بتایا کہ ریحان، سلیمان سے چھوٹا تھا اور وہ اسی وقت جاں بحق ہو گیا تھا جب کہ سلیمان ہسپتال میں 11 دن گزارنے کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ ان کی والدہ صائمہ کا کہنا تھا کہ سلیمان کا چہرہ آدھے سے زیادہ جلا ہوا تھا اور جسم بھی کافی متاثر تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ زیادہ خطرے والی بات نہیں ہے۔ لیکن مرنے سے ایک دو دن پہلے انھیں تشویش ہوئی اور جب ٹیسٹ کروائے' تو پتا چلا کہ اس کے پھیپھڑوں میں دھواں چلا گیا تھا۔ پھر ڈاکٹروں نے بتایا کہ اب اس کا بچنا مشکل ہے' لیکن ہم لوگ اسی انتظار میں تھے کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے اور ہمارا ایک ہی بچہ بچ جائے۔ اسے دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی دنیا سے چلا جائے گا۔

☆ آخری گیارہ دن جو اس نے ہسپتال میں گزارے وہ ہمیں کسی صورت نہیں بھولتے، اتنی باتیں کرتا تھا، بار بار پوچھتا تھا ماما ریحان کدھر ہے اسے ہم نے ریحان کی Death کا نہیں بتایا تھا۔ اسے یہ بتایا تھا کہ ریحان کے پاؤں پر چوٹ آئی ہے اس لیے وہ گھر ہے۔ لیکن آگے سے کہتا تھا ماما آپ کہتی ہیں ریحان گھر ہے لیکن وہ دیکھیں وہ میرے پاس کھڑا ہوا ہے۔ ریحان منہ میں انگلی ڈالے رکھتا تھا، سلیمان کہتا دیکھیں ریحان میرے پاس کھڑا ہے اور منہ میں انگلی پھر ڈالی ہوئی ہے۔ شاید اسے وہ نظر آتا تھا۔ بس ہم اس کے سامنے ''خوش'' رہیں۔ ڈاکٹروں نے یہ بھی کہا تھا کہ اُسے حادثے کی یاد بھی نہ آئے۔ بار بار کہتا تھا کہ میرے سرہانے ریحان اور سارے بچے کھڑے ہیں، یہاں نظر آ رہے ہیں وہاں نظر آ رہے ہیں۔ ہسپتال میں جب تھا' تو کہتا میرے کھلونے مجھے چاہئیں۔ ہم گھر سے سارے کھلونے وہاں لے آئے۔ اس کے دونوں ہاتھوں اور بازوؤں پر پٹیاں بندھی تھیں، وہ کھلونے پکڑ تو نہیں سکتا تھا لیکن اپنے ساتھ جیسے بچوں کو لٹاتے ہیں ویسے اپنے کھلونے رکھوا لیتا تھا، کہتا تھا میں ابھی کھیل تو نہیں سکتا لیکن آپ رکھ دیں ٹھیک ہو کر کھیل لوں گا۔

میرے اوپر پانی پھینک دیتے ہیں۔ ہسپتال میں صرف ایک شخص ہی مریض کے ساتھ رُک سکتا ہے۔ بار بار کہتا تھا پاپا کو فون کرو وہ میرے پاس آئیں۔ صبح اس کے پاپا اس کے پاس ٹھہرے' تو میں باہر آ گئی لیکن میرے دل کو سکون نہیں ہوا میں پھر اندر گئی اسے سیب کاٹ کے کھلانے لگی۔ ابھی ایک ٹکڑا ہی منہ میں رکھا کہ اس کی حالت خراب ہو گئی میں نے جلدی سے ڈاکٹر کو بلایا بس پھر اس کی حالت نہیں سنبھلی۔ اسی دن صبح اس کی ڈیتھ ہو گئی۔

انھوں نے زندہ تو اتنی ہی دیر رہنا تھا۔ اللہ کی یہی مرضی تھی لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ دونوں بھائی شدید تکلیف میں اس دنیا سے گئے۔ مجھے جب اپنے بچے نظر نہیں آتے' تو دل پھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ پھر بھی اللہ کا شکر ہے میرا ایک بیٹا ہے جب سوچتی ہوں کہ جن کے تینوں بیٹے نہیں رہے' تو دل دہل جاتا ہے۔ میرے پاس تو پھر دل لگانے کو ایک بیٹا ہے لیکن ان کے پاس تو ایسی بھی کوئی اُمید نہیں۔

وین میں وہ اکیلی ٹیچر تھی

☆ سجاد صاحب نے بتایا سمیعہ کی عمر تقریباً 20 سال تھی۔ اس دن میں لاہور جا رہا تھا جماعت اسلامی کی طرف سے ہماری میٹنگ تھی۔ بچوں کو میں نے خود گاڑی میں بٹھایا تھا۔ کوئی دو منٹ کے بعد ہی مجھے کال موصول ہوئی کہ جو وین آپ کے گھر سے بچے لے کر گئی ہے اس میں آگ لگ گئی ہے۔ میں پانچ منٹ ہی میں وہاں پہنچ گیا۔ اتنی ہی دیر میں بچے کافی حد تک جل چکے تھے۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم وہاں پر اکٹھا ہو گیا تھا۔ مین روڈ ہونے کی وجہ سے کافی لوگ جمع تھے۔ بہت سے لوگ آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ بچوں کو وین سے نکال لیا گیا تھا۔

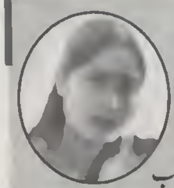

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ جس بہادر ٹیچر نے اپنی جان پر کھیل کر اتنا بڑا کام کیا، کارنامہ انجام دیا۔ اب تک اُس کے لیے حکومت کی طرف سے بہادری اور شجاعت کے کسی اعزاز یا ایوارڈ کا اعلان تک نہیں کیا گیا۔

کچھ خود شیشے توڑ کر نکل آئے تھے۔ کچھ بچوں کو میری بہن سمیعہ نکال چکی تھی۔ جو بچے وہاں بچ گئے تھے۔ میں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ کون ہیں' میرے بھتیجے ہیں یا نہیں میں نے تقریباً آٹھ جلے ہوئے زخمی بچوں کو اپنی گاڑی میں ڈالا اور تیزی سے انھیں عزیز بھٹی ڈسٹرکٹ ہسپتال گجرات لے گیا۔ وہاں پر ایمرجنسی میں ان کا علاج ہوا۔ اس کے بعد انھیں CMH کھاریاں میں شفٹ کر دیا۔ جب میں واپس آیا' تو پتا چلا کہ عزیز بھٹی ہسپتال کے پوسٹ مارٹم سیکشن میں تمام نعشیں پہنچائی جا چکی ہیں۔ وہاں پر میں نے سب کو دیکھا۔ جب میں وقوعہ پر پہنچا تھا' تو میں نے لوگوں سے کہا تھا کہ آگ پر مٹی یا پانی ڈالیں۔ مٹی اور پانی ڈالنے سے کچھ بچوں کے پاؤں میں جوتے جلنے سے بچ گئے تھے اور تھوڑے بہت پاؤں بھی سلامت تھے۔ اسی وجہ سے ان کی نعشوں کو پہچانا گیا۔

میں جب پہنچا تب تک سمیعہ بھی جل چکی تھی۔ لیکن عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ 4 بچے اور ٹیچر بالکل ٹھیک باہر نکل آئے تھے۔ لیکن سمیعہ پھر اندر گئی کیونکہ بچے اندر چیخ رہے تھے اور انھیں نکالنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ انھیں آگ لگی ہوئی تھی وہ یہ برداشت نہیں کر سکی اور جو بچے اس وقت زندہ بچ گئے تھے اور ہسپتال میں کچھ دن

رہنے کے بعد فوت ہوئے ہیں وہ بھی کسی راہ گیر یا ڈرائیور نے نہیں نکالے بلکہ سمیعہ نے ہی نکالے تھے۔

موٹر سائیکل پر ایک دودھ والا آرہا تھا اس نے بتایا کہ وین میں آگ لگی ہوئی ہے اور ڈرائیور نے وین روکی ہوئی ہے اور فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر مالکوں کو فون کر کے بتانے لگ گیا کہ گاڑی کو آگ لگ گئی ہے اب میں کیا کروں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس وقت گاڑی کے مالکوں نے کہا تھا کہ گاڑی چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ وہ بھاگ گیا جبکہ وہاں جو دودھ والا تھا وہ رکا اور آگ کو دودھ سے بجھانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ لیکن پٹرول کے سامنے دودھ کا کیا بس چلتا تھا۔ اس وقت ایک پولیس والا بھی وہاں سے گزر رہا تھا اس نے بھی دروازوں کے لاک وغیرہ کھولنے کی کوشش کی مگر اس کے ہاتھ جل گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی کے دروازے تار کے ساتھ اندر سے باندھے ہوئے تھے، باہر سے کھل نہیں سکتے تھے۔ پچھلی ڈکی کھول کر بچے نکل سکتے تھے یا پھر شیشے توڑ کر۔ ایک شخص کا کہنا ہے کہ سمیعہ ڈکی کھول کر ایک دفعہ نکل آئی تھی لیکن جب دوبارہ بچوں کو نکالنے کے لیے اندر گئی پھر وہ باہر نہیں نکل سکی۔

پہلے جو ڈرائیور آتا تھا اس کی والدہ فوت ہوگئی تھی۔ چند دنوں سے وہ اُدھر مصروف تھا' تو اس نے اپنی جگہ یہ ڈرائیور بھیج دیا۔ بچوں کا کہنا ہے کہ اس دن ڈرائیور ضرورت سے زیادہ گاڑی تیز چلا رہا تھا۔ اس نے پٹرول پمپ سے پٹرول ڈلوایا' تو وہاں کے ملازمین نے اِسے کہا ہے کہ اس طرح کین میں پٹرول رکھنا خطرناک نہیں ہے۔ لیکن اس نے دونوں کین بھروالیے اور کہا کہ تھوڑی دیر میں تو منگوال پہنچ جانا ہے۔ کون جانتا تھا اس پٹرول کے باعث اتنا بڑا حادثہ پیش آجائے گا۔ ظالم ڈرائیور نے اپنے سائیڈ والا گیٹ بھی نہیں کھولا جبکہ جو بچے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں وہ خود آگے والا گیٹ کھول کر باہر نکلے تھے۔ کیونکہ پیچھے والے گیٹ کو تو کھینچ ہی نہیں سکے۔ ایک کین اس کی سیٹ کے پیچھے رکھا ہوا تھا جس میں اسکول کا جنریٹر چلانے کے لیے پٹرول بھرا ہوا تھا۔ وہ خود غرض اور بزدل ڈرائیور کسی طرح سائیڈ والا دروازہ کھول دیتا' تو شاید اتنا جانی نقصان نہ ہوتا۔ کیونکہ کچھ بچے اگلی سیٹ سے نکل آئے تھے اور کچھ ڈکی سے نکلے تھے تو شاید درمیان والی سیٹوں کے بچے بھی نکل پاتے۔ ہر کام کے حوالے سے کچھ قوانین اور ضابطے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ٹرانسپورٹ کے بھی تو کچھ قانون ہیں۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ انتظامیہ اور سارے ذمہ داران ایسی چیزوں کا خیال نہیں رکھتے اور نتیجتاً ایسے سانحے پیش آجاتے ہیں۔ وہ رشوت لے کر گاڑیوں کو سرٹیفکیٹ جاری کر دیتے ہیں۔ اس حادثے کے بعد بھی کسی نے نہیں سوچا کہ ایسے حادثوں کی روک تھام کے لیے کوئی قانون سازی کی جائے۔

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ جس بہادر ٹیچر نے اپنی جان پر کھیل کر اتنا بڑا کام کیا، کارنامہ انجام دیا۔ اب تک حکومت کی طرف سے اُس کے لیے بہادری اور شجاعت کے کسی اعزاز یا ایوارڈ کا اعلان تک نہیں کیا گیا۔ ٹی وی پہ اس حوالے سے پروگرام آتے۔ اس پر ڈراما بنتا۔ یہ ایک رول ماڈل کی شہادت تھی۔ ہمیں اعتراف خدمت کے لیے کسی فلمی ستارے ہی کی کیوں ضرورت رہتی ہے؟ ارباب اختیار اس جانب بھی تھوڑی توجہ دیں۔ کسی اور ملک میں یہ حادثہ پیش آیا ہوتا' تو سمیعہ نذیر قومی ہیرو ہوتی۔ نصاب میں اس کا ذکر آتا' اس کے اندر اس سوچ کو پیدا کرنے والوں کو سلام پیش کیا جاتا، وہ بھی ڈرائیور کی طرح جان بچا کر کھڑی رہتی۔ معصوم بچوں کی چیخیں اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرا کر ضائع جاتیں' تو جو چند بچے زندہ بچ گئے وہ بھی تہِ خاک سو رہے ہوتے۔

ooo

اقبالؒ کے نظریۂ خودی اور تصوف کے حوالے سے ایک بے حد قیمتی تجزیاتی تحریر

مسلمانوں کی کم کوشی اور بے عملی کا ذمہ دار اسلام ہرگز نہیں

اقبال کے نزدیک رائج الوقت تصوف ایک سراب ہے

تصوف کا مزہ چکھ لینے کے بعد رہی سہی دینی حسن بھی باقی نہیں رہتی

پروفیسر محمد فاروق قریشی

علامہ اقبالؒ ایک دینی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اقبال کے والد عبادت گزار اور صوفی منش آدمی تھے۔ ان پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ اقبال بچپن ہی سے گھر میں صوفیانہ گفتگو سنتے رہے تھے۔ اس لیے ان کا اپنا میلان بھی تصوف کی طرف تھا۔ وہ اپنی اس خاندانی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے جاوید اقبال سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

جس گھر کا مگر چراغ تُو ہے
ہے اس کا مذاق عارفانہ

اقبال اولیاء اللہ سے بہت عقیدت رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ذکر اپنے اشعار میں عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اقبال عموی طور پر تصوف کے نظریۂ وحدت الوجود کے قائل نظر آتے ہیں اور کثرت میں وحدت کو تلاش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں

؎ حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں جو چٹک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے

یہ تصوف کی وہ مقبول عام صورت ہے جو انسان کو رہبانیت، گوشہ نشینی، نفیِ ذات، ذلت آمیز فقر و فاقہ، توکل کی تسکین، لاتعلقی اور بے عملی کا سبق دیتی ہے اور اسے زندگی کی جدوجہد اور خیر و شر کی کشمکش میں حصہ لینے سے روکتی ہے۔ دنیا میں انقلاب بپا کرنے کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ اقبال اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں یعنی 1905ء تک تصوف کے اسی تصور سے متاثر نظر آتے ہیں، جب ان کا مشاہدہ

اور مطالعہ محدود تھا اور قلب و نظر میں وسعت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ چلے گئے۔ ان کا زیادہ تر قیام کیمبرج اور لندن میں رہا۔1908ء میں انھوں نے لنکنز اِن سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران آپ میونخ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر بھی رجسٹر ہو چکے تھے۔ ان کی تحقیق کا موضوع تھا ''ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعات کا ارتقا۔'' چنانچہ 1907ء میں ان کے تحقیقی مقالے پر میونخ یونیورسٹی کی طرف سے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔

یورپ میں قیام کے دوران اقبال نے مغربی اقوام کی عملی سرگرمیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی کوشش و محنت کے بہترین نتائج کا بھی مشاہدہ کیا، تو مسلمانوں کی تن آسانی، بے عملی، غفلت اور بے حسی کے احساس سے ان کو بڑی روحانی تکلیف ہوئی۔ انھوں نے غور کرنا شروع کیا کہ آخر اس صورتحال کا ذمہ دار کون ہے؟ دوسری اقوام مسلمانوں کی اس کم ہمتی اور گراوٹ کا ذمہ دار خود اسلام کو قرار دیتی تھیں۔ اس لیے اقبال نے قرآن اور تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کم کوشی اور بے عملی کا ذمہ دار اسلام ہرگز نہیں۔ اسلام کی تعلیمات تو انسان میں مسلسل حرکت اور جدوجہد، فکر و عمل کی بلندی اور تخلیق و تسخیر کا لازوال جذبہ پیدا کر دیتی ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت اسلام سے دور ہٹ جانے اور غیر اسلامی نظریات کو اپنا لینے کا نتیجہ ہے اور اس میں بہت بڑا دخل غیر اسلامی تصوف کا ہے جو دراصل ایرانی تصوف ہے جس نے عیسائیت، ہندومت اور بدھ مت کے راہبانی تصورات کو اپنے اندر جذب کرلیا اور دشمن اقوام نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے مسلم دنیا میں اس کی ترویج و اشاعت کی۔ اقبال 30 دسمبر 1915ء کو خواجہ حسن نظامی مرحوم کے نام اپنے خط میں تحریر کرتے ہیں:

''میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا کیونکہ یورپین فلسفہ بحیثیت مجموعی ''وحدت الوجود'' کی طرف رخ کرتا ہے۔ مگر قرآن میں تدبیر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات سے ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔ میں اسی غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔''

جوں جوں اقبالؒ کا علمی مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہوتا گیا۔ تصوف کے بارے میں ان کی رائے واضح اور مستحکم ہوتی گئی بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ رائج الوقت تصوف ایک سراب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تصوف حقیقی اسلامی تصوف سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا اور اس کا مزہ چکھ لینے کے بعد تو رہی سہی دینی حس بھی باقی نہیں رہتی۔ ان کے نزدیک اسلامی تصوف کا صاف شفاف چشمہ ایرانی اور ہندی تصورات کی ملاوٹ سے گدلا ہو چکا تھا۔ یہی تصورات مسلمانوں کے قوائے عمل کو مفلوج کر رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے سب سے پہلے ان تصورات و عقائد کی بیخ کنی کو ضروری سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار 1915ء میں مثنوی اسرارِ خودی میں کیا۔ ان کا مقصد عجمی اور ہندی تصورات کی نفی کرنا تھا تا کہ لوگوں پر ان کی

ضرر رسانی واضح ہو جائے، لیکن جب انھوں نے حافظ شیرازی، شیخ محی الدین ابن عربی اور منصور حلاجؒ کے صوفیانہ عقائد کی مخالفت کی، تو اس پر بہت لے دے ہوئی اور اہل تصوف نے ان کے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا اور انھیں اسلامی تصوف کا مخالف قرار دے کر کفر کا فتویٰ بھی جڑ دیا۔

اقبال 11 جون 1918ء کو اکبرؔ الٰہ آبادی کے نام اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں ''میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ کون سا تصوف میرے نزدیک قابل اعتراض ہے اور میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

مجھ سے پہلے حضرت علاء الدولہ سنجانیؒ اور حضرت جنید بغدادی یہی بات لکھ چکے ہیں۔''

> **اقبال نے ابن عربی حافظ شیرازی اور منصور حِلاج کے صوفیانہ عقائد کی مخالفت کی ،تو بہت لے دے ہوئی اور اُن پر کفر کا فتویٰ جڑ دیا گیا۔**

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ تصوف کے بارے میں خود اہل اسلام کے خیالات میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ اس شدت سے مخالف ہے کہ وہ تصوف کو قطعاً غیر اسلامی چیز قرار دیتا ہے جب کہ دوسرا اتنا فریفتہ ہے کہ وہ اس کو شریعت کی قیود سے بھی آزاد سمجھتا ہے۔ اور جو باتیں لوگوں کی جہالت اور نادانی کی وجہ سے تصوف میں داخل ہو گئی ہیں ان کو بھی عین اسلام سمجھتا ہے۔ صوفیا علم کو دو اقسام میں تقسیم کرتے ہیں، ایک علم ظاہری یعنی شریعت اور دوسری علم باطنی یعنی طریقت۔ مقام حیرت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے اور اس کے ڈیڑھ سو سال بعد تک عبادات و احکام میں شریعت اور طریقت کی تقسیم موجود نہیں تھی۔ جو لوگ صحبتِ رسول ﷺ کے فیض یافتہ اور تزکیہ نفس کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے وہ صحابیؓ اور بعد کے ادوار میں تابعین اور تبع تابعین کہلاتے تھے۔ بعد میں جب مسلمان امت نے دین پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور دنیا کی محبت نے ان کو اپنی طرف مائل کر لیا، تو خدا کے نیک بندوں نے اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں لوگوں کو دین کی تعلیم اور تزکیۂ باطن کی تربیت کا کام شروع کر دیا۔ چونکہ ان بزرگوں کا مقصد دین کو بدعات اور لغویات سے پاک کرنا تھا اور دلوں کی اصلاح اور صفائی کرنا تھا اس لیے ان کا نام صوفی پڑ گیا اور اس باطنی تعلیم کو تصوف کہا جانے لگا۔ سلف صالحین بزرگانِ دین جو علم عمل کے آفتاب اور زہد و تصوف کے روشن منار تھے، کے احوال و اقوال میں مکمل اتفاق پایا جاتا تھا۔ وہ خود ظاہر و باطن، ہر لحاظ سے کتاب و سنت کا اتباع کرنے والے تھے۔ ان لوگوں نے پابندیٔ شریعت کا حق ادا کیا۔ احکام خدا کی تعمیل، ممنوعات سے نفرت اور قضائے الٰہی پر راضی رہنا ان کا شعار تھا۔ بدعت اور رسم پرستی کی گرد ان کے دامن کو نہیں چھو سکتی تھی۔ یہ لوگ تھے جو تصوف اسلامی کے علمبردار اور صوفیا کے ارفع مقام پر فائز تھے۔

اس کے مقابلے میں آج کل کے تصوف اور صوفیا کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا بیان پڑھنے کے قابل ہے، ''مشکل یہ ہے کہ ادھر تصوف کا نام لیا اور اُدھر ذہن کے سامنے آج کل کے ان مشائخ، شاہ صاحبان اور سجادہ نشین پیرزادوں کی اور ان کی محفلوں کی تصویریں آجاتی ہیں۔ غالی عقیدت مند چاروں طرف سے حلقے میں لیے ہوئے ہیں۔ درمیان میں شاہ صاحب گیروے کپڑوں یا صندلی لباس میں تشریف فرما ہیں، کوئی کام ہے نہ کاج، نہ دینی تذکرے، نہ پند و مواعظ، نہ نماز نہ قرآن، نہ ادائے

اقبالؒ اس کو بغداد کی تباہی سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں

حقوق العباد اور جائز کسب کی کوئی فکر و اہتمام۔ قوالی کی محفل گرم ہے۔ ستار اور ہارمونیم کے ساتھ گانا سنا جارہا ہے۔ فاسقوں کا مجمع ہے۔ عُرس کی تاریخیں آگئی ہیں، قبروں پر چادریں چڑھ رہی ہیں، منتیں مانی اور مُرادیں مانگی جارہی ہیں۔ مٹھائیاں، حلوے، توشے کے خوان پیش ہو رہے ہیں۔ نذر و نیاز، چڑھاوے کے نام سے روپیہ پیسہ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں......''

مذکورہ بالا بحث کا حاصل یہ ہے کہ اقبال اس صوفیا تصوف سے بیزار ہیں جو عُجمی تصورات کا معجون مرکب اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس اقبال اسلامی تصوف کے حد درجہ مداح ہیں کیونکہ یہ اخلاص فی العمل کا نام ہے۔ اور دل میں قوت اور تحریر و تقریر میں زور پیدا کرتا ہے۔ وہ اس بے خودی کے قائل ہیں جو خودی کے عرفان سے پیدا ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی مکمل تعمیل اور تسلیم و رضا کے جذبے سے جنم لیتی ہے۔ وہ اسی کو اسلامی تصورات کا 'فنا' کہتے ہیں۔ جن صوفیا نے ہندومت اور بدھ مت کی تعلیم سے متاثر ہو کر 'فنا' کی تفسیر پیش کی ہے اس کے مسلمانوں پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اقبال اس کو بغداد کی تباہی سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ عُجمی تصوف کی راہبانی تعلیم نے اسلام کے بنیادی اصولوں اور انسانی زندگی کی جڑوں پر وار کیا ہے۔ جب انسان دنیا کو خیر باد کہہ کر جنگلوں، غاروں یا خانقاہوں کے اندر ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جائے گا، تو وہ غیر معمولی صلاحتیں جو خدا نے اس کو عطا کی ہیں ضائع ہو جائیں گی اور ممکنات کی وہ دنیا جو اس کے اندر پوشیدہ ہے، کبھی حقیقت کا روپ اختیار نہیں کرے گی۔

> اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے ظاہر و باطن کے لیے واضح اور روشن ہدایات موجود ہیں۔ ایک متوازن زندگی کے دونوں پہلوؤں پر توجہ اور دونوں کی ترقی اور استحکام ضروری ہے۔ زندگی عمل پیہم کا نام ہے اور اس کی بقا کے لیے ارتقائی منازل کی طرف سفر جاری رہنا چاہیے۔ انسان کی اپنی ذات میں اور بیرونی ماحول میں انقلاب، عمل اور جدوجہد سے آتا ہے۔ مسلمان کے ذمے باطل کی تاریکی کو دور کر کے دنیا کو حق و انصاف کی روشنی سے منور کرنے کا فریضہ ہے۔

یہ ساری کائنات انسان کے عمل کی جولاں گاہ ہے۔ اگر حرکت چھوڑ کر جمود اور نفیٔ ذات کا راستہ اختیار کر لے گا اور گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر چند اوراد وظائف کر لینے ہی کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ لے گا اور کاروبارِ دنیا کو خدا کے سپرد کر دے گا، تو پھر وہی ہو گا جو اس وقت دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اسلام نے اپنے سنہری دور میں اگر دنیا کا نقشہ بدلا، نئی تہذیب کی بنیاد رکھی، عدل مساوات کے اصول وضع کیے، علوم و فنون سے دنیا کو آشنا کیا، تو یہ سب کچھ ان مومنین اور مصلحین کی

کوششوں کا نتیجہ تھا جو شریعت محمدی ﷺ کے پابند اور بے پناہ عملی قوتوں کے حامل تھے۔ جو جدھر سے گزرے انھوں نے باطل کے ایوانوں کو زمین بوس کر دیا اور آدھی سے زیادہ دنیا فتح کر لی اور ابھی ان کا سفر جاری تھا۔

اسی لیے اس مبارک دور میں ہمیں ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ تو ملتے ہیں کوئی حافظ شیرازی یا منصور حلاج نظر نہیں آتا۔

اقبالؒ قرآن کی تعلیم پر یقین رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنایا، قرآن کے ذریعے اس کو علم اور حکمت کا درس دیا تاکہ وہ دنیا کا انتظام سنبھالے اور کائنات کو تسخیر کرے۔ اس لیے نہیں کہ وہ عُجمی تصوف، خلوت گزینی اور توکل پر بھروسا کر کے بیٹھا رہے اور ترک دنیا سے تسکین حاصل کرے۔ اقبال نفیٔ ذات اور سکون، دونوں کو موت کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ اثباتِ خودی اور سعیٔ پیہم کو زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ معرفتِ خداوندی نفس کشی سے نہیں معرفت یعنی خودشناسی سے حاصل ہوتی ہے۔

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

اقبالؒ کا اسلامی تصوف خودی کے اثبات، اس کی معرفت، تربیت اور استحکام پر مبنی ہے۔ انھوں نے اپنا یہ تصور جرأت رندانہ کے ساتھ ''اسرارِ خودی'' میں پیش کیا۔

اقبالؒ جبر و تقدیر کے معاملے میں جبر کے بجائے اختیار کے قائل ہیں۔ اطاعتِ خدا کے عروج پر پہنچ کر بندہ، خدا کا ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور زبان بن جاتا ہے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

اقبالؒ کہتے ہیں کہ زندگی اور دنیا آرزو کی پیداوار ہے۔ زندگی اپنی تمام تر مشکلات اور مصائب کے باوجود ایک نعمت ہے اس میں سے نفیٔ ذات، ترکِ آرزو اور فنا کا تصور کیسے نکل سکتا ہے۔ جس طرح خدا کا کام تخلیق و آفرینش ہے، اس کے نائب اور خلیفہ کو بھی انہی صفات میں کمال پیدا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے تازہ بتازہ آرزوؤں کے ذریعے زندگی کو وسعتوں سے ہمکنار اور ترقی و تسخیر سے مالا مال کرنا چاہیے۔

اقبالؒ خودی کی نشوونما کے لیے عشق کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ عشق گوشہ نشینی، تنہائی اور محویت والا عشق نہیں بلکہ متحرک، فعال، ہمہ گیر، خارجی اور باطنی فطرت کا رمز آشنا اور فکر و نظر میں انقلاب برپا کرنے والا عشق ہے۔ عشق جو خدا کی اطاعت و بندگی سے شروع ہوتا ہے خدا تک پہنچ کر ختم ہوتا ہے اور یہ منزل صفاتِ خدا کو اپنے اندر جذب کر لینے سے حاصل ہوتی ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

اقبالؒ کا پیغام خودی ہمارے لیے آج بھی مشعل راہ ہے۔ کیونکہ دراصل یہ اقبال کا نہیں قرآن کا پیغام ہے، جس پر عمل کرنا محمد ﷺ کے شیدائیوں کا فرض ہے۔ ہم آج بھی اگر اپنے اندر آتشِ عمل کو بھڑکا لیں، تو وسائل کی کمی کے باوجود ہم اپنا وجود دنیا سے منوا سکتے ہیں اور علم و حکمت کے ہتھیار سے جہادِ زندگانی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ اخلاصِ نیت اور جذبۂ عمل تعداد اور ساز و سامان پر ہمیشہ سبقت لے جاتا ہے کیونکہ

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

شکاریات

شیر خان اور بیٹم اوگالم کا
آدم خور

اقبال فیروز

لینٹانا کے جنگل کے خونخوار شیر کا دل دہلا دینے والا واقعہ
اسے انسانی خون کی لت لگ گئی تھی

کینتھ

ایڈرسن Anderson Kenneth 1910ء میں بنگلور میں پیدا ہوا اس کی فیملی پچھلی چھ پشتوں سے ہندوستان میں مقیم تھی۔ Anderson سینٹ جوزف کالج بنگلور سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد برٹش ایئرکرافٹ بنگلور میں ملازم ہوگیا اور بعد میں فیکٹری منیجر کے عہدے پہ فائز ہوا۔ اسے جنگل کے ماحول سے ازحد دلچسپی تھی اور بنگلور کے اردگرد پھیلے ہوئے جنگل اس کی توجہ کے مرکز رہتے تھے۔

اگرچہ وہ ایک اچھا شکاری تھا، لیکن اس سے بڑھ کر وہ ایک بہت خوبصورت لکھاری تھا۔ اسے جنگلی حیات سے بے حد پیار تھا اور اپنی شکاری زندگی میں اس نے یہی کوشش کی کہ اس کی گولی کا نشانہ صرف اور صرف آدم خور شیر ہی بنیں۔ ایڈرسن کا 1974ء میں بنگلور ہی میں انتقال ہوا، لیکن مرنے سے

پہلے وہ دس سے زیادہ کتابیں لکھ چکا تھا جو صرف شکاریات کے موضوع پہ تھیں۔ درج ذیل کہانی Sher Khan and the Bettamugalam Maneater اس کی کتاب ''The Tiger Roars'' سے منتخب کی گئی ہے۔

شیر خان اور بیٹم اوگالم کا آدم خور

برطانوی راج کے ابتدائی دور میں ایک ریٹائرڈ انگریز افسر نے ضلع سالم کے گدریان رینج کے پہاڑی سلسلے کے جنگلوں میں تین سو ایکڑ زمین حاصل کی اور یہاں ایک قلعہ نما عمارت تعمیر کی۔ اس شخص کے بارے میں اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ کسی محکمے میں کلکٹر کے عہدے پہ فائز تھا جو اس زمانے میں ایک انتہائی اہم پوسٹ سمجھی جاتی تھی، عمارت سفید رنگ کے پتھروں سے تیار کی گئی تھی اور اس کے گرد تعمیر ہونے والی چار دیواری میں بھی ایسے ہی پتھر استعمال کیے گئے تھے۔ یہ ایک قلعہ نما پرسکون عمارت تھی جس کا نام Bettamugalam Palace رکھا گیا تھا جب کہ علاقے کے لوگ اسے ''جنگل محل'' کے نام سے پکارتے تھے۔ انگریز نے عمارت کی دیکھ بھال اور اس کے اندر انواع واقسام کے پودے اُگانے اور عمارت کے اردگرد سے جنگلی جھاڑیاں خصوصاً Lantana نامی پودے کی بیخ کنی کے لیے مزدوروں کی ایک فوج بھرتی کی جس کی تعداد لگ بھگ تین سو کے قریب تھی۔ عمارت کے اندر ہزاروں کی تعداد میں لینٹانا کی جھاڑیاں تھیں جو ان دنوں ساؤتھ انڈیا کے جنگلوں میں تیزی سے پھیل رہی تھیں۔ علاقے کے لوگوں کا خیال تھا کہ اگر اس کے پتوں کا مرہم بنا کر زخموں پہ رکھا جائے تو وہ بہت جلد مندمل ہوجاتے ہیں۔ لینٹانا کے پودے کو یہاں کی آب وہوا بے حد راس آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جھاڑیوں نے چند سالوں کے دوران سرکاری جنگل کا ایک وسیع رقبہ اپنی گرفت میں لے لیا اور یہاں سے گزرنے والے راستے بند ہونا شروع ہوگئے، گھاس پودوں کی لپیٹ میں آکر خشک ہوگیا اور عمارت کے اردگرد موجود جنگلی جانور جن میں زیادہ تعداد ہرن، بارہ سنگھے، نیل گائے، بھینسے اور ریچھ کی تھی، علاقے کو چھوڑ کر چلے گئے، شیر، جنگلی کتے اور کئی گوشت خور جانور بھی شکار کا تعاقب کرتے ہوئے اس علاقے سے دور چلے گئے، تاہم ایک محفوظ پناہ گاہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ جنگلی خرگوشوں اور مرغ نما پرندوں کی بہترین پناہ گاہ بن گئی تھی۔ لینٹانا کی بڑھتی ہوئی افزائش آس پاس کے گاؤں کے لیے وبال جان بن گئی تو محکمہ جنگلات کو اس صورت حال سے نپٹنے کا خیال آیا اور وہ اس خودرو پودے کو تلف کرنے کے منصوبوں پہ غور کرنے لگا، زہریلی ادویات کا سپرے کیا گیا مگر پودوں کی صحت پہ کوئی فرق نہ پڑا محکمہ جنگلات ابھی دوسرے منصوبوں پہ غور کر ہی رہا تھا کہ ایک عجیب سا واقعہ پیش آیا لینٹانا کے پودوں پہ ایک سفید رنگ کی مکھی نے حملہ کردیا جن کی تعداد ہزاروں میں تھی جو بڑھتے بڑھتے کروڑوں تک پہنچ گئی۔ لینٹانا کے پودے ٹنڈ منڈ ہوکر سیاہ رنگ میں تبدیل ہوگئے۔ اس کے بعد ایک اور واقعہ پیش آیا دیکھتے ہی دیکھتے سفید مکھیاں تیزی سے مرنا شروع ہوگئیں اور چند ہی دنوں میں ان کا خاتمہ ہوگیا یہ شاید اس زہریلی دوا کا اثر تھا جو لینٹانا کے پتوں میں جذب ہوگئی تھی۔ بعد میں محکمہ جنگلات نے لاکھوں پودوں کو آگ لگا کر انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کی جو بار آور نہ ہوئی۔ ایک دن انگریز مرگیا اور اس کی زمین اور عمارت ایک اینگلوانڈین نے خریدلی

قرین قیاس تھا کہ وہ یہاں کیٹل فارم بنانا چاہتا تھا اور ابھی ابتدائی تیاریوں ہی میں تھا کہ راکھ کے ڈھیروں سے لینٹانا کے نئے شگوفے پھوٹنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے تنومند جھاڑیوں میں تبدیل ہوگئے۔ یہ شخص اس صورت حال سے اس قدر پریشان ہوا کہ ایک رات دل کے دورے کے باعث وہ بھی مرگیا۔

لینٹانا ایک ایسا پودا ہے جس پہ سرخ، نارنجی اور پیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول لگتے ہیں۔ان میں خوبی یہ ہے کہ یہ اپنا رنگ بدلتے رہتے ہیں اور ایک ہی شاخ پہ کئی رنگ کے پھول کھلتے ہیں اس کے پتے تو زہریلے ہوتے ہیں لیکن اس کا پھل جو فالسہ کی طرح مگر نیلے رنگ کا ہوتا ہے پرندوں کو بہت مرغوب ہوتا ہے۔اس کے پتے اگر کوئی جانور کھالے تو وہ مرسکتا ہے۔جنگلی جانوروں کو قدرت نے اتنی عقل دے رکھی ہے کہ وہ ایسے کسی پودے کے قریب نہیں جاتے جس کے پھل یا پتے انہیں نقصان پہنچا سکتے ہوں جب کہ گھریلو جانوروں میں عام طور پہ یہ حس موجود نہیں ہوتی وہ کسی بھی زہریلے پودے کے پتے کھا کر بیمار ہوسکتے ہیں اور اگر زیادہ مقدار میں ہڑپ کرلیں تو مر بھی سکتے ہیں۔لینٹانا کی جھاڑیوں نے گھاس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس صورت حال کی وجہ سے اکثر سبزی خور جانور اس علاقے سے دور چلے گئے اور ان کا شکار کرنے والے گوشت خور درندے بھی ان کا تعاقب کرتے ہوئے جنگل سے روپوش ہوگئے، تاہم یہ جگہ جنگلی خرگوشوں اور مرغ نما پرندوں کے لیے بہترین اماجگاہ بن چکی تھی۔

اینگلو انڈین کی موت کے بعد عمارت کا کوئی وارث سامنے نہ آیا اور یہ پرشکوہ قلعہ نما عمارت جسے مقامی لوگوں نے ''جنگل محل'' کا نام دیا تھا بھوت بنگلے کی صورت اختیار کرگئی آس پاس کے گاؤں کے لوگوں نے رات کے اندھیرے میں اس کے پتھر چوری کرنا شروع کردیے اور چند سال بعد یہاں مٹی اور ریت کے ڈھیر کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

یہاں سے چار میل دور ''ایار'' نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا جہاں گراپا نام کا ایک چوبیس سالہ نوجوان رہتا تھا یہ بہت غریب شخص تھا جسے گاؤں کے نمبردار کے ہاں پورا سال کام کرنے کے بعد تین چار من دانے مل جایا کرتے تھے۔ گاؤں میں عام طور پر سترہ یا اٹھارہ سال کے لڑکے اور چودہ سے پندرہ سال کی لڑکی کی شادی کردی جاتی تھی چونکہ گراپا کی عمر بہت زیادہ ہوچکی تھی لہٰذا اس کے بوڑھے باپ کو اس کی شادی کی بہت فکر تھی رکاوٹ صرف یہ تھی کہ وہ غریب تھا اور اس کے پاس رہنے کو مکان بھی نہیں تھا۔ گاؤں کے ایک ادھیڑ عمر غریب شخص نے اپنی گونگی اور بہری لڑکی کا رشتہ اس شرط پہ دینے کا وعدہ کیا کہ وہ کسی طرح اپنا مکان تعمیر کرے اور اس کے بعد دلھن کو اپنے گھر لے آئے۔ گراپا کے لیے یہ کام ازحد کٹھن تھا لیکن ایک دن اسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ جنگل محل سے کچھ پتھر چوری کرکے اپنا مکان تعمیر کرے اور اس کے بعد دلھن کو اپنے گھر لے آئے۔اگرچہ محل سے سارے پتھر چوری ہوچکے تھے لیکن اس کی بنیادوں میں اب بھی بہت سے پتھر باقی تھے جنہیں وہ کھود کر مکان کی تعمیر کرسکتا تھا۔ اس نے نمبردار سے بات کی اور اس سے پتھر لانے کے لیے بیل گاڑی مانگی جو نمبردار نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد اسے دے دی۔ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے بیل گاڑی لے کر جنگل محل کی طرف روانہ ہوگیا اور رات گئے تک کدال کی مدد سے پتھر اکھٹے کرتا رہا یہ کام ازحد مشکل اور صبر آزما تھا لیکن گراپا ایک خاص جذبے سے کام کررہا تھا اور اس نے اچھی خاصی تعداد میں پتھر اکھٹے کرنے کے بعد بیل گاڑی پہ رکھے اور گھر کی راہ لی۔ جنگل کے ناہموار راستے پہ بیل گاڑی آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف رواں دواں تھی اور گراپا سوچ رہا تھا کہ وہ کل پھر اتنی ہی تعداد میں پتھروں کی ایک اور کھیپ لے کر جائے گا اور یوں اس کے مکان کا ایک بڑا حصہ مکمل ہوجائے گا۔ وہ ابھی گاؤں سے دو میل دور تھا کہ اسے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی، تو اس نے ہاتھ میں اٹھائی ہوئی بانس کی لاٹھی بیلوں کی کمر پہ برسانا شروع کردی۔شیر اگرچہ آدم خور نہیں تھا کیونکہ ایک عرصے سے اس علاقے میں ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی لیکن قرین قیاس یہی تھا کہ وہ بھوک یا بڑھاپے کا شکار ہوکر لینٹانا کی جھاڑیوں میں دبک کر کسی شکار کا انتظار کررہا تھا۔ گراپا کو اس وقت پتا چلا جب اسے کسی نے اچانک بائیں ٹانگ سے پکڑ کر گاڑی سے نیچے کھینچ لیا وہ چیختا اور مدد کے لیے لوگوں کو بلاتا رہا لیکن یہاں کون تھا جو اس کی مدد کو پہنچتا۔شیر اسے گھسیٹتا ہوا لینٹانا کی جھاڑیوں میں روپوش ہوگیا۔ بیلوں نے بدحواسی میں دوڑنا شروع کردیا اور گاڑی ایک گڑھے میں گرنے کے بعد ٹوٹ گئی خوش قسمتی سے بیلوں کو کوئی زخم نہ آئے اور وہ گاڑی سے آزاد ہوکر گاؤں پہنچ گئے۔ بیل بغیر گاڑی نمبردار کے گھر پہنچے، تو اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے چیخ چیخ کر سارے گاؤں والوں کو اکٹھا کرلیا سورج غروب ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ وقت ہوچکا تھا۔گاؤں والے رات کے اندھیرے میں جنگل کی طرف رخ کرتے ہوئے ڈر رہے تھے کیونکہ چندروز پہلے کسی بدمست ہاتھی نے ایک نوجوان کو کچل دیا تھا۔گاؤں والوں کو پورا یقین تھا کہ یہ کارستانی بھی اُسی ہاتھی کی ہے۔اُس نے بیل گاڑی پہ حملہ کرنے کے بعد گراپا کو بھی کچل ڈالا ہوگا۔علاقے کے رینج افسر سے رابطہ کیا گیا اور اس سے گراپا کو اپنی مدد آپ کے تحت ڈھونڈنے کی اجازت طلب کی گئی جو اس نے بخوشی دے دی۔ چھ نوجوان رضاکارانہ طور پر ہاتھوں میں ڈنڈے اور لالٹینیں اٹھا کر جنگل کی طرف روانہ ہوئے لیکن راستہ اس قدر دشوار گزار تھا کہ وہ اندھیری رات میں آگے بڑھنے سے قاصر تھے، چنانچہ فیصلہ ہوا کہ اس کام کو صبح پہ چھوڑ دیا جائے اور واپسی کی راہ اختیار کی جائے۔ گاؤں کا نمبردار رات بھر نہ سوسکا اسے گراپا سے زیادہ اپنی گاڑی کی فکر تھی جسے وہ جلد از جلد ڈھونڈنا چاہتا تھا۔

اگلے دن سرچ پارٹی جنگل کی طرف روانہ ہوگئی اور انہوں نے جلد ہی بیل گاڑی تلاش کرلی جو ایک کھڈے میں ٹوٹی پڑی تھی اس کے دونوں پہیے ایک طرف اور اوپر کا حصہ دوسری طرف پڑا تھا۔گراپا کا کوئی پتا نہیں تھا لیکن جلد ہی یہ عقدہ بھی کھل گیا۔ریت پر خون کے دھبے اور شیر کے پنجوں کے نشان اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ گراپا شیر کا لقمہ بن چکا ہے اور اب اس کی زندگی کے بارے میں سوچنا بیکار ہے۔گراپا کی تلاش میں آئے ہوئے جوانوں میں شدید خوف و ہراس پھیل گیا اگرچہ انہیں اس بات کا خوف کم تھا کہ ہاتھی اتنے زیادہ لوگوں کی موجودگی میں اس طرف آنے سے گریز کرے گا، لیکن شیر کا کوئی اعتبار نہیں وہ کسی وقت بھی جھاڑیوں سے نکل کر ان پہ حملہ کرسکتا تھا۔سوچ و بچار کے بعد طے ہوا کہ واپس گاؤں لوٹ جانا چاہیے کیونکہ گراپا اب اس دنیا میں نہیں اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر اسے تلاش کرنا لاحاصل ہے۔

اتفاق کی بات تھی کہ میں اس دن، سیوانا پالی، میں اپنے کیمپ میں آرام کررہا تھا یہ جگہ آیار گاؤں سے چار میل کے فاصلے پر تھی اور بنگلور سے پچاس میل دور تھی۔

میں اکثر اتوار کی چھٹی گزارنے یہاں آتا تھا اس کے علاوہ یہاں ایک بلیک پینتھر بھی موجود تھا۔ جسے دیکھنے کے شوق میں، میں کئی کئی گھنٹے جنگل میں مٹر گشت کرتا رہتا تھا۔ سیوانا پولی کے محکمہ جنگلات کا گارڈ رینج آفیسر کو لینے آیار گیا ہوا تھا۔ دوپہر کے بعد دونوں دفتر واپس آگئے اور مجھے اس واقعے کے بارے میں معلوم ہوا جو ایک دن پہلے وہاں پیش آیا تھا۔ میرے لیے اب یہاں مزید ٹھہرنا بہت مشکل اور صبر آزما تھا میں جلد از جلد سیوانا پالی سے آیار پہنچنا چاہتا تھا۔ جیب میں بسکٹوں کا ایک پیکٹ اور خشک گوشت کا ایک ڈبا ڈال کر میں نے اپنی ٹارچ اور بندوق سنبھالی اور منزل کی طرف چل دیا۔ گاؤں میں افواہوں کا بازار گرم تھا۔ فاریسٹ آفیسر اپنی رپورٹ تیار کر چکا تھا۔ ایک پولیس آفیسر کانسٹیبل کے ہمراہ موٹر سائیکل پہ سوار وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس وقت میرے ساتھ دو پولیس والے، رینج آفیسر اور دو گارڈ تھے جن کی معیت میں، میں گراپا کی تلاش میں لینٹانا کی جھاڑیوں سے لپٹے ہوئے دشوار گزار جنگل میں اس جگہ پہنچا جہاں ببول کے درخت کے قریب بدقسمت گراپا کی لاش پڑی تھی۔ بائیں ران پر گوشت کا نام و نشان نہیں تھا۔ سالم ہڈی صاف نظر آرہی تھی۔ انتڑیاں پیٹ سے باہر تھیں اور گراپا کے دونوں ہاتھ چبائے ہوئے تھے جو بدقسمت نے مزاحمت کی خاطر چلائے ہوں گے۔ یہ منظر خوف و دہشت سے لبریز تھا۔ اس کی لاش پہ کالی چیونٹیوں نے حملہ کیا تھا اور اس کے بعد اس پہ بھورے رنگ کی چیونٹیاں ٹوٹ پڑیں بعد میں دونوں کے درمیان جنگ ہوئی جس کا واضح ثبوت وہاں دونوں اقسام کی چیونٹیاں ہزاروں کی تعداد میں مری پڑی تھیں۔ گراپا کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اسکے دونوں ڈیلے چیونٹیوں نے چٹ کر لیے تھے۔ شیر اس کی بقایا لاش کھانے کے لیے کیوں واپس نہ آیا میں اس کی وجہ نہ جان سکا۔ شاید وہ واپس آیا ہو اور اس کی لاش کے گرد لاکھوں بھوری چیونٹیاں دیکھ کر واپس چلا گیا ہو لیکن یہ میرا خیال تھا۔ میں نے پتھر چوری کرنے کی ساری کہانی اپنے ساتھیوں کو سنائی جو مجھے جنگل کا رخ کرنے سے پہلے گاؤں کے ایک باشندے نے سنائی تھی۔ میرے ساتھ آنے والا پولیس انسپکٹر جو ایک برہمن تھا بار بار اس بات کو دُہرا رہا تھا کہ یہ سب اس انگریز کی روح کی شرارت ہے جس کی حویلی کے پتھر گراپا چرا کر لا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ ایسے تمام لوگوں کو سنگین سزا دے جو مردہ انسانوں کی چیزیں چرا کر گھروں میں لے آتے ہیں، گراپا کو اس کے کیے کی سزا ملی ہے اور ایسی سزا سب چوروں کو ملنی چاہیے میں نے برہمن انسپکٹر کی اس بات کو مذاق سمجھا لیکن وہ سنجیدہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ بے چارہ غریب گراپا جسے اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک محل کی نہیں ایک چھوٹی سی کٹیا کی ضرورت تھی اور اس کے لیے چند پتھر چرانے پہ وہ موت کی سزا کا مستحق کیسے ہو سکتا تھا۔

میں نے جلد ہی لینٹانا کی وہ جھاڑی ڈھونڈ لی جہاں بیٹھ کر شیر اپنے شکار کا انتظار کرتا رہا تھا جونہی گراپا وہاں سے گزرا شیر نے اس پہ چھلانگ لگا دی۔ اس جگہ خون کے نشان اب بھی واضح اور نمایاں تھے ہم شیر کے قدموں کے نشانات اور خون کے دھبوں پہ نگاہ رکھے مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔

پولیس انسپکٹر نے اپنے ساتھیوں کو گراپا کی لاش اُٹھانے کا حکم دیا اور خود رپورٹ لکھنے بیٹھ گیا اس نے ایک گواہ کی حیثیت سے میرے دستخط لیے اور ہم آیار کے ریسٹ ہاؤس میں واپس آگئے۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا رینج آفیسر نے رات گزارنے کے لیے مجھے ایک کمرے کی پیش کش کی مگر میں ہر قیمت پہ واپس سیوانا پولی جانا چاہتا تھا۔ وہاں میرے کیمپ میں خشک گوشت کا ایک ڈبا اور بسکٹ میرے منتظر تھے اور میں ان سے جلد از جلد دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا۔ رینج آفیسر اور گارڈ نے مجھے سختی سے منع کیا کہ رات کے وقت سیوانا پولی جانا ازحد خطرناک ہے راستے میں لینٹانا کی جھاڑیاں ہیں راستہ نشیبی ہے اور یہاں نوکیلے پتھروں کی بہتات ہے جب کہ بانس کے درخت اس قدر گھنے اور خطرناک ہیں کہ وہاں سے راستہ بنانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ ندیاں اور نالے بھی ہیں جنہیں رات کے اندھیرے میں عبور کرنا قدرے مشکل کام ہے۔ راستے میں آدم خور شیر سے بھی مڈھ بھیڑ ہو سکتی ہے۔ میں کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھا اور ہر قیمت پہ اپنے کیمپ میں جانا چاہتا تھا جب کہ مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ گراپا کو مارنے والا شیر واقعی آدم خور تھا۔

گارڈ جنگل کے شروع ہوتے ہی واپس چلا گیا اور جاتے ہوئے یہ کہہ گیا کہ تم کبھی بھی سیوانا پولی نہیں پہنچ سکو گے بھگوان تمہارا محافظ ہو۔ جنگل میں ہر طرف خاموشی تھی ہوا بند ہونے کی وجہ سے درختوں کے پتوں کو بھی جیسے نیند آگئی تھی۔ لینٹانا کے پودوں کے درمیان سے میں جگہ بناتا قطب نما کی مدد سے آگے بڑھ رہا تھا۔ جنگل میں اس قدر خاموشی تھی کہ کہیں سے کسی جھینگر کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اچانک میرے سامنے وہی جگہ آگئی جہاں گراپا کی لاش پڑی ہوئی تھی اور خوف کی لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی ہو سکتا ہے کہ شیر پھر اسی جگہ بیٹھا اپنے شکار کا انتظار کر رہا ہو۔ مجھ پہ اچانک چھلانگ لگا دے۔ اس خیال سے میرے خوف میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں نے رینج آفیسر کی بات کیوں نہیں مانی...... ٹارچ کی روشنی چند فٹ کے بعد دم توڑ دیتی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے درختوں کی ایک دیوار میرے سامنے کھڑی ہو جسے عبور کرنا میرے بس میں نہ ہو۔ لینٹانا کی جھاڑیاں بار بار میرا راستہ روک رہی تھیں اور چلتے چلتے مجھے بار بار گمان ہوتا جیسے شیر میرے سامنے کھڑا ہو، میری انگلیاں بندوق کے ٹریگر پہ آکر رک جاتیں مگر یہ میرا وہم تھا جس کی وجہ سے میرے اعصاب پر اس قدر خوف اور تناؤ تھا۔ اچانک مجھے جھاڑیوں میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی ٹارچ کی روشنی کا رخ اس طرف کیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ایک دفعہ پھر اسے اپنا وہم سمجھ کر آگے بڑھ گیا، لیکن نہیں اب بات کچھ اور تھی یہاں شیر موجود تھا کیونکہ جھاڑیوں میں سے ایک عجیب سی غراہٹ کی آواز سنائی دی تھی۔ میں وہیں رک گیا اور ٹارچ کی مدد سے آواز والی جگہ کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ اُف میرے خدا شیر میرے سامنے بڑے سکون سے بیٹھا مجھے گھور رہا تھا، کیا یہ بھی میرا وہم ہے یقیناً نہیں میں نے دل ہی دل میں سوچا اور شیر کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ شیر کا اس حالت میں بیٹھنا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ آدم خور نہیں ہے اور شاید بے ضرر بھی ہے۔ اس پہ گولی چلانی بے کار تھی، میرے سامنے ایک عمومی چٹان تھی اور دوسرے طرف بانس کے گھنے درخت۔ ایسی حالت میں چٹان پہ چڑھنا ہی بہتر تھا۔ بندوق کے ٹریگر پہ انگلی رکھے میں تیزی سے چٹان کی طرف بھاگا اور یہی وہ لمحہ تھا جب شیر جھاڑیوں سے نکل کر مجھ پہ چھلانگ لگانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ میرے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ یہ وہی شیر تھا جس نے گراپا کا شکار کیا تھا اور اب مجھے ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ میری بندوق سے اس وقت گولی نکلی جب شیر

چھلانگ لگا کر چٹان کے اوپر تک آچکا تھا وہ جس تیزی سے اوپر آیا گولی چلنے کے بعد اتنی ہی تیزی سے واپس مڑا اور لینٹانا کی جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ وہ یقیناً زخمی ہوچکا تھا اور اب اس کے لیے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا جب کہ رات کے اندھیرے میں میرے لیے اس کا تعاقب کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔

میں رات کو سیوانا پالی پہنچ گیا اور اپنے چھوٹے سے کیمپ میں بستر پہ لیٹ کر شیر کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے ذہن میں شیر خان کا نام آگیا جو چالیس سال کا ایک تنومند شخص تھا اور اس سے یوں ہی سر راہ میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ جنگل سے لکڑیاں چرانے اور اسی قسم کی دوسری چھوٹی چھوٹی وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ میں کیمپ کے باہر کھڑا تھا اور وہ تھانے میں ایک رات گزارنے کے بعد گھر واپس آرہا تھا کہ مجھے دیکھ کر اس نے پہلے سلام کیا اور پھر تھوڑی دیر میرے ساتھ بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی جو میں نے اسے بخوشی دے دی۔

صاحب جی پولیس والے بہت ظالم ہیں دیکھو انہوں نے مار مار کر میرا کیا حشر کیا ہے، اس نے اپنی پیٹھ سے کرتا اُٹھایا تو اس پہ ڈنڈوں کے نشانات تھے۔ لیکن تمہارا قصور کیا ہے میں نے اس سے ازراہ ہمدردی پوچھا۔ صاحب چور تو میں ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس علاقے میں ہونے والی ہر چوری میرے کھاتے ہی میں ڈال دی جائے اور ہر دفعہ مجھے تھانے بلا کر چھترول کی جائے۔

صاحب یہ میری مجبوری ہے لیکن میں نے آج تک پولیس کے سامنے کبھی بھی اپنی چوری تسلیم نہیں کی وہ مجھے مار مار کر تھک جاتے ہیں لیکن مجھ سے کوئی بات اگلوانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

میں شیر خان کی صاف گوئی اور دلیری سے بہت متاثر ہوا معلوم نہیں وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے اسے چوری کی طرف مائل کر دیا تھا ورنہ وہ دیکھنے میں اچھا خاصا بھلے مانس نظر آتا تھا بستی کے دوسرے لوگوں سے بالکل الگ تھلگ۔

صاحب کیا آپ میرے گھر ایک چائے کی پیالی پی سکتے ہیں اس نے بڑے خلوص سے دعوت دی جسے میں ٹھکرا نہ سکا اور اس کے ساتھ اس کے گھر تک آگیا۔ اس کا گھر عام لوگوں سے بہت مختلف اور بہتر بھی تھا۔ صاحب کے لیے فرسٹ کلاس چائے بناؤ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی اور مجھے چارپائی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ صاحب میری چار بیویاں ہیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا ان کے ساتھ برابر کا سلوک ہے آپس میں بہنوں کی طرح رہتی ہیں اور صاحب میرا رعب بھی تو بہت ہے ناں مجال ہے کوئی میرا حکم ماننے سے انکار کرے۔ مجھے اس کی بات پہ حیرت تو ہوئی لیکن مجھے معلوم تھا کہ ایک مسلمان چار شادیاں کرسکتا ہے، صاحب یہ سب پردہ کرتی ہیں آج تک گاؤں کے کسی بندے نے ان میں سے کسی کی شکل نہیں دیکھی۔ اس کے سینے میں بہت سی کہانیاں دفن تھیں اور میں چائے کے دوران کوئی ایک کہانی سننا چاہتا تھا۔ آخر اس نے میری یہ خواہش میرے کہے بغیر ہی پوری کردی۔

صاحب ہمارے علاقے میں سامان کی ترسیل کے لیے بیل گاڑیاں استعمال کی جاتی ہیں اور یہ عموماً وقت بچانے کے لیے رات کو ایک گروپ کی شکل میں آگے پیچھے سفر کرتی ہیں کیونکہ جنگل سے گزرتے ہوئے انہیں سب سے زیادہ ڈر ہاتھیوں کا رہتا ہے اس کے علاوہ اس بات سے بھی خوف زدہ رہتے ہیں کہ جنگل میں بدروحیں بھی موجود ہوتی ہیں جو اکیلے آدمی کو تنگ کرتی ہیں ڈاکے وغیرہ تو بہت کم پڑتے ہیں کیونکہ اس کے

لیے سرکار نے بہت سخت قانون بنایا ہوا ہے۔ غلے کی ایسی ہی پانچ گاڑیاں جنگل میں گھاٹ روڈ پہ سفر کررہی تھیں رات ایک بجے کا وقت تھا اور گاڑیوں کے نگہبان سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ بیل اپنے راستے پہ رواں دواں تھے کہ اچانک لینٹانا کی جھاڑیوں سے ایک بھاری آواز سے وہ چونک اٹھے، پانچوں کے پانچوں بیل گاڑیوں سے نیچے اتر آؤ ورنہ سب کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ ان لوگوں نے ادھر اُدھر دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا تاہم انہوں نے حکم کی تعمیل کی اور گاڑیوں سے نیچے اتر آئے، ایک قطار میں کھڑے ہو جاؤ اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک میل دور پیچھے کی طرف جنگل میں ببول کے درخت کے پاس پہنچ جاؤ۔ اب کے بار آواز زیادہ اونچی اور بارعب تھی، یہاں تم لوگوں نے اس وقت تک بیٹھنا ہے جب تک سورج طلوع نہ ہوجائے ہمارا ایک آدمی تمہارے پیچھے ہوگا اگر تم میں سے کسی نے ہماری بات نہ مانی یا ذرا بھی مزاحمت کی تو اس کو فوری طور پر گولی مار دی جائے گی۔ یاد رکھو تم بہت غریب آدمی ہو اور یہ غلہ ایک بہت بڑے سیٹھ کا ہے، ہمیں اس کی بہت سخت ضرورت ہے۔ جب تم واپس آؤ گے تو تمہاری بیل گاڑیاں اسی جگہ موجود ہوں گی۔ سب نے حکم کی تعمیل کی اور جب وہ واپس آئے تو ان کی بیل گاڑیاں وہاں موجود تھیں۔ تھوڑی مقدار میں غلہ لیا گیا تھا باقی سب وہاں موجود تھا۔ اس کے بعد مختلف جگہوں پہ تین ایسی ہی وارداتیں ہوئیں تو جنگل میں پولیس کی نگرانی میں سامان کی ترسیل شروع ہوگئی۔ بہت سے لوگ پکڑے گئے ان میں شیر خان بھی شامل تھا۔ رات بھر ہم پہ تشدد ہوتا رہا مگر ہم کہاں اقرار کرنے والے تھے صبح بے گناہ قرار دے کر چھوڑ دیے گئے۔ اس گینگ میں کتنے آدمی تھے میں نے شیر خان سے پوچھا۔

صرف ایک اور وہ میں تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

شیر خان ذرا وہ بندوق تو دکھاؤ جس کے زور پہ تم نے یہ واردات کی تھی۔

کہاں کی بندوق کیسی بندوق میرے پاس تو ایک چھوٹی سی لاٹھی تھی۔ یہ سب کچھ تو انہیں ڈرانے کے لیے کیا گیا تھا۔

تو اس کا مطلب ہے تمہارے پاس بندوق نہیں ہے؟

صاحب میرے پاس بندوق کہاں سے آئی ہاں ایک تلوار ہے جسے میں بہت کم ہاتھ میں رکھتا ہوں ابھی لے کر آتا ہوں وہ بھاگ کر دوسرے کمرے میں گیا اور میان میں رکھی تلوار اٹھا لایا۔ صاحب یہ تلوار میرے دادا کے دادا کی ہے وہ سلطان ٹیپو شہید کی فوج میں سپاہی تھا۔ وہ اس تلوار سے انگریزوں کے خلاف لڑا تھا آپ کو ٹیپو کے بارے میں پتا ہے وہ بہت بہادر انسان تھا، ہاں میں جانتا ہوں اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔

شیر خان ایک انتہائی قابل بھروسا انسان تھا اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا وہ جو کچھ کرتا مجھے صاف صاف بتا دیتا جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ اس کی چار بیویاں تھیں جو اس کے حکم کی پابند تھیں۔ اس نے سب کے کام تقسیم کر رکھے تھے، اس کے گھر میں بہت کم جھگڑے کی نوبت آتی تھی اور اگر کبھی ایسا ہو بھی جاتا تو شیر خان کا ڈنڈا حرکت میں آجاتا اور بات ختم ہوجاتی اس کے گھر کا ڈسپلن مجھے بہت متاثر کرتا تھا۔ اس کی دلیری اور جرأت قابل داد تھی یہی وجہ تھی کہ شیر خان سے میری دوستی مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ میں

اگلے دن کے وقت شیر خان کے ہاں پہنچا، تو وہ گھر کے کاموں میں اپنی سب سے چھوٹی بیوی کا ہاتھ بٹا رہا تھا، صاحب کیسے آنا ہوا آج آپ کی طبیعت کچھ بے چین سی ہے، تم نے درست کہا ہے شیر خان میں تمہیں ایک کام کے لیے اپنے ساتھ ایار لے کر جانا چاہتا ہوں اور جب میں نے اسے آدم خور کے بارے میں بتایا تو وہ میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔

ہم نے چائے کی ایک پیالی پی اور اپنے مشن پہ روانہ ہوگئے۔ شیر خان نے کہا کہ اِس کے پاس بندوق نہیں ہے اور وہ اپنے ساتھ تلوار لے جانا چاہتا ہے میں نے اس پہ کوئی اعتراض نہ کیا۔ میرے ساتھ روانہ ہونے سے پہلے اس نے کسی قسم کی کوئی تیاری نہ کی صرف تھوڑی دیر کے لیے دوسرے کمرے میں گیا اپنی بیگمات کو مقامی زبان میں کچھ ہدایت دی اور تلوار ہاتھ میں لہراتا ہوا میرے ساتھ ہولیا۔ یہ وہ تلوار تھی جو کئی پشتوں پہلے اس کے پرکھوں نے انگریزوں کے خلاف استعمال کی تھی زنگ آلود تلوار جس پہ شیر خان کو بہت فخر تھا۔ کیوں نہ ہوتا یہ شیر بنگال سلطان ٹیپو کی فوج کے ایک سپاہی کے استعمال میں رہی تھی اور اب شیر کے شکار کے لیے استعمال ہونے جا رہی تھی مجھے اپنے دوست کی خواہش کا بے حد احترام تھا اور میں اس کے چہرے پہ کھلتی مسکراہٹ دیکھ کر بے حد خوش ہو رہا تھا۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم عین اس جگہ کھڑے تھے جہاں شیر نے گراپا کا شکار کیا تھا۔ ریت سے خون کے دھبے مٹ چکے تھے۔ اس سے ذرا فاصلے پہ وہ چٹان تھی جہاں سے میں نے شیر پہ گولی چلائی تھی۔ میرا مسلمان دوست بڑے اعتماد سے میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میری نگاہیں ان جھاڑیوں پہ جمی ہوئی تھیں جہاں رات کے وقت شیر آرام کر رہا تھا۔ مجھے اچانک احساس ہوا جیسے ان جھاڑیوں سے کوئی بھاری بھرکم وجود گزر کر شمال کی طرف گیا ہو، میں اس جگہ کے قریب پہنچا، تو خون کی ایک لمبی سی لکیر اسی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی، شیر خان اس طرف آؤ، میں نے اسے آواز دی جو اس وقت مجھ سے دس قدم آگے تھا۔ ہم دونوں خون کے نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اس سے تھوڑا آگے خشک پتوں پہ پڑا ہوا خون کسی سرخ قالین کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چیک کیا تو یہ گاڑھا اور سخت تھا۔ میری گولی شیر کے جبڑے کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا اور یہ بات بھی درست نظر آتی تھی کہ شیر ابھی زندہ تھا۔ شیر خان اگرچہ شکاری نہیں تھا وہ انتہائی تندہی سے میرا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگتا دائیں بائیں نظریں دوڑاتا جھاڑیوں سے راستہ بناتا میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس سے ذرا آگے جھاڑیاں اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے انہیں کوئی جانور پاؤں کے نیچے چلتا رہا ہو بادی النظر میں یہ کسی ہاتھی کی شرارت دکھائی دیتی تھی لیکن قریب سے دیکھا، تو گھاس شیر کے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ زخم کے درد کی وجہ سے گھاس میں لوٹ پوٹ ہوتا رہا تھا۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا شیر کا زخم بہت گہرا ہے اور وہ اپنی خفت، درد اور پیاس مٹانے کے لیے ضرور کسی گھاٹ پہ پانی پینے کے لیے گیا ہوگا۔ میں نے شیر خان سے پوچھا یہاں سے دریا کتنی دور ہے اس نے بتایا کہ اس جگہ سے چار میل کے فاصلے پہ ہے لیکن ایک میل آگے ایک جھیل بھی ہے جس میں دریا کا پانی آتا ہے اور اس کا پانی ہمیشہ ساکن حالت ہی میں رہتا ہے، بہت اچھے مجھے

یقین ہے کہ شیر اسی جھیل کے کنارے آرام کر رہا ہوگا۔ جنگل کا کوئی جانور بیمار، بوڑھا یا زخمی ہو جائے تو وہ عموماً کسی پانی کے ذخیرے کے قریب بیٹھ کر بڑے صبر سے اپنی موت کا انتظار کرتا ہے۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ جنگل اب بے حد گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ ایک چھتری کی طرح ہم پہ سایہ فگن تھے اور سورج کی کرنوں کا جیسے یہاں سے کبھی گزر ہی نہیں ہوا تھا۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑی افقی چٹان تھی جس کے بارے میں شیر خان کو کچھ علم نہیں تھا لیکن اس کا اندازہ درست تھا۔ چٹان کے دامن میں ایک جھیل تھی جسے آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اٹھتی ہوئی چٹان نے آنکھوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ اس چٹان کے نیچے پانی ہے۔ شیر خان نے پیشن گوئی کی اور پھر اس نے ایک پتھر اٹھا کر نیچے پھینکا تو غڑاپ کی آواز سنائی دی۔ ہمیں بائیں جانب سے ہو کر نیچے جانا ہوگا اور وہ میری راہنمائی کرتا ہوا آگے کی طرف بڑھتا رہا۔ ہم ڈھلوان اتر کر نیچے آئے تو جھیل کا کنارہ شروع ہوگیا اور ہمارے سامنے سخت پتھروں پہ شیر کے خون کے دھبے ایک دفعہ پھر ہماری توجہ کا مرکز بن گئے اور ہم ان کی مدد سے آگے بڑھتے رہے۔ ’’اسٹاپ‘‘ میں نے شیر خان کو آواز دی جو مجھ سے چند قدم آگے تھا میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ شیر یقیناً یہیں موجود ہے۔ بہت احتیاط سے میرے ساتھ ساتھ چلو۔ شیر خان تھوڑا سا گھبرایا، لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور وہ اب بھی میرے آگے آگے ہی چل رہا تھا۔ تقریباً سو قدم چلنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں جھیل کے دونوں کنارے ایک دوسرے سے بہت قریب ہوگئے تھے۔ ’’ہش‘‘ شیر خان نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر سامنے کی طرف اشارہ کیا جہاں شیر اپنا منہ پانی میں ڈالے بظاہر بڑے سکون سے بیٹھا تھا۔ اُس کی دم ہل رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ زندہ ہے اور اپنا زخم پانی میں رکھ کر شدت کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے شیر کی حالت پہ ترس آیا، لیکن اس نے ایک انسان کا خون کیا تھا اس کا زندہ رہنا آیندہ کے لیے خطرناک ہوسکتا تھا۔ اسے انسانی گوشت کی لت پڑ چکی تھی۔ اس کے زخم سے اب بھی خون رس رہا تھا اور اس کے سامنے پانی کا رنگ سرخ ہو چکا تھا۔ شیر خان کی تلوار نیام سے باہر آگئی اور وہ تیزی سے شیر کی طرف لپکا، رُک جاؤ میں نے اسے آواز دی مگر وہ اتنی دیر میں شیر کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ اب اپنا کام دکھاؤ میں نے اسے آواز دی۔ میں نے کبھی زخمی شیر پہ گولی نہیں چلائی، اس کی تلوار ہوا میں بلند ہوئی، لیکن اس سے پہلے ہی شیر نے جست لگائی اور شیر خان کو نیچے گرا کر اس کی چھاتی پہ اپنے پنجے رکھ دیے میرے دوست کی جان خطرے میں تھی اور شیر پہ گولی چلانا ضروری ہوگیا تھا میں نے اس کے سر کا نشانہ لے کر گولی داغ دی شیر اچھل کر دور جا گرا اور شیر خان ایک دم کھڑا ہو کر اپنی تلوار کا جائزہ لینے لگا۔ زخمی شیر کو ٹھنڈا ہونے میں ذرا دیر نہ لگی۔ میرے دوست کے سینے پہ معمولی سی خراشیں آئی تھیں اور وہ کبھی مجھے اور کبھی شیر کو دیکھ رہا تھا۔ شیر خان اس شیر کی کھال تمہاری ہے......!

ہم شام تک اپنے کیمپ میں واپس آگئے تھے۔ جنگل کے قریب خیمے میں شیر خان میرے ساتھ چائے پی رہا تھا اور اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی کہانیاں بھی سنا رہا تھا جنگل خاموش تھا، لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں جانوروں کی ملی جلی آوازیں گونج رہی تھیں ہو ہو ہو، اے ہونگ، گا گا، ایہونگ، او، اور دور کہیں جیسے کوئی شیر بھی دھاڑ رہا تھا......!

OOO

طنز و مزاح

پھر خواب میں آئے باواجی

نوبیاہتا دُلھے کا قصہ
وہ مروتاً ایک ملنگنی بیاہ لایا تھا

اعتبار ساجد

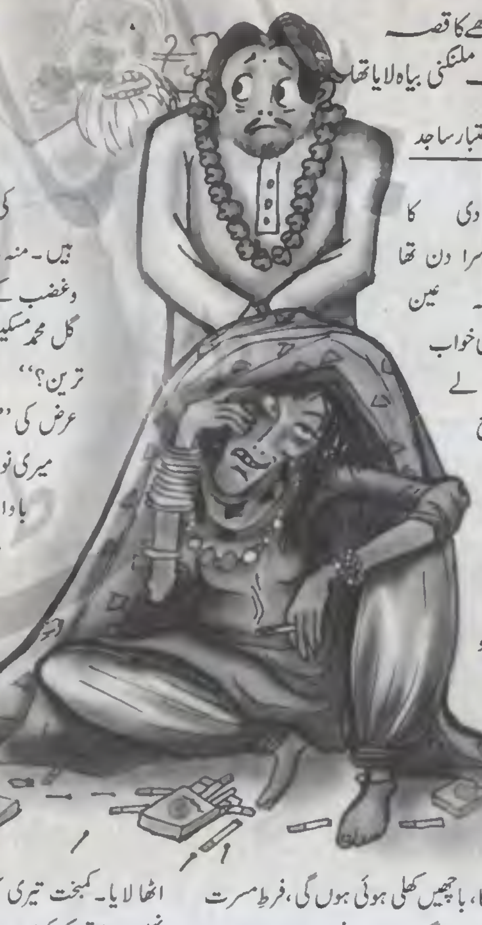

میری شادی کا دوسرا دن تھا کہ عین رات گئے باواجی خواب میں تشریف لے آئے۔ میں توقع کر رہا تھا کہ اس مرتبہ ان کے ہاتھ میں پتھر کی جگہ موتی چور کا لڈو ہوگا، گلے میں ہار پہن رکھا ہوگا، باچھیں کھلی ہوئی ہوں گی، فرطِ مسرت سے گنگنا رہے ہوں گے اور زبان شیریں سے یہ الفاظ رس کی طرح ٹپکیں گے۔ ''مبارکاں پتر! لکھ لکھ مبارکاں۔ شاباش ہے تجھ جیسی سعادت مند اولاد پر، باپ کی نصیحت پر عمل کر دکھایا۔''

مگر دیکھتا کیا ہوں کہ بدستور آپ کے ہاتھ میں پتھر ہے اور مبارک زبان سے نامبارک ناشائستہ جملے کلاشنکوف کی گولیوں کی طرح برس رہے ہیں۔ منہ سے جھاگ بہ رہی ہے اور غیظ وغضب کے عالم میں فرما رہے ہیں ''گل محمد مسکین! یہ کیا چیز اٹھا لایا احمق ترین؟''

عرض کی ''باوا جانی! غالباً آپ کی مراد میری نوبیاہتا دلھن سے ہے۔''

باوا جی بگڑ کر بولے ''یقیناً میری مراد اسی منحوس سے ہے جو پیرڈنڈے شاہ کے ڈیرے

اٹھا لایا۔ کمبخت تیری آنکھیں پھوٹ گئی تھیں۔ نہیں رہا تھا کہ کیا چیز اٹھا رہا ہے، نہ منہ نہ متھا،

پہاڑوں لتھا، دانت پیلے، رنگ کالا، اوپر سے ایک آنکھ بھینگی، عمر میں بھی تجھ سے سات آٹھ بلکہ نو دس سال بڑی۔ اس چڑی کا اگر شوربہ بنایا جائے تو ایک بوٹی بھی تیرے لقمے میں نہیں آئے گی۔ توبہ میرے اللہ توبہ..... اوپر سے سگریٹ کی عادی، خورے صاف سگریٹ پیتی رہی ہے یا بھرے ہوئے۔ میرا سو فیصد یقین ہے کہ ڈیرے پر بھرے ہوئے سگریٹ چلتے رہے ہیں اور اس ملنگنی نے بھی سگریٹ نوشی کی حد مُکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہوگی۔ کل رات تو میں اس شرمو شرمی میں تیرے خواب میں نہیں آیا کہ چلو رہنے دو، آج نہیں جاتے، نالائق پتر کی سہاگ رات ہے۔ آج اس لیے آیا ہوں کہ تجھے حقیقت سے باخبر کر دوں۔ اطلاعاً عرض ہے۔ اب تیری باری ہے۔ اللہ ہی خیر کرے۔''

''نہیں نہیں، باواجی! ہرگز نہیں۔'' میں خواب میں چیخا۔

''ایسی بدخبر بلکہ رسوا کن خبر مجھے نہ سنائیں۔ خدا کے لیے باواجی! یہ ظلم نہ کریں، اپنے الفاظ براہ کرم واپس لے لیں۔''

باواجی نے نخوت سے فرمایا ''بکواس بند کر جان پر..... اور غور سے میری بات سن، یہ خصماں نوں کھانی اس سے پہلے دو شادیاں رچا چکی ہے۔ پیرڈنڈے شاہ کی خاص مریدنی ہے۔ جتنے فراڈ تیرا یہ پیرڈنڈے شاہ کرتا رہا ہے یہ ان سب میں اس کی شریک کار ہوتی رہی ہے۔ طے شدہ پروگرام کے تحت پیر منظر سے غائب ہوا اور اسے معاملہ سنبھالنے کی ڈائریکشن دے کر ڈیرے پر بٹھا گیا۔ ادھر سے تُو قسمت کا مارا پہنچ گیا۔ بس پھر بج گئے تیرے باجے! اب صبر کر اور صبر شکر سے زندگی کے باقی دن اس مائی مُندریاں والی کے ساتھ گزار۔''

یہ کہہ کر جونہی آپ نے توقف فرمایا، میں نے جھٹ سوال کر دیا ''باواجی! میں تو سادگی اور لاعلمی میں لٹ گیا۔ اب آپ ارشاد فرمائیں کہ اگلا قدم کیا اٹھاؤں؟''

''اگلا قدم بھی بتاؤں گا۔'' باواجی خلاف معمول بڑے تحمل سے بولے۔ ''فی الحال اس ملنگنی کی اسٹوری جاری ہے، سٹوری کیا ہے، حقیقت ہے۔ مگر بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''خدا کا واسطہ باواجی! شرم نہ کھائیں، شرع میں کیا شرم۔ شروع رہیں ٹاپو ٹاپ چلتے جائیں۔''

باواجی ہنکارا بھر کر بولے ''تو پھر سن! یہ آفت کی پرکالا، مصیبتوں کی مالا، بابے تیرے کی وفات سے دو برس قبل بابے تیرے کی زندگی میں بلا بن کر داخل ہوئی اور لگی عشق ومحبت کے جال پھینکنے۔ بابے اپنے کی عمر پر غور کر اور سوچ کہ اگر بابا تیرا اس کلفتی کے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھ دیتا تو نہ دنیا کو منہ دکھانے جوگا ہوتا نہ آخرت میں کوئی ٹھکانہ ملتا۔ اگر میں اس سے شادی کی غلطی کر بیٹھتا تو آج تُو اس کا شوہر نہ ہوتا، بیٹا ہوتا اور یہ تیری بیوی نہ ہوتی تیری مترئی ماں ہوتی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں پتر؟''

میں کیا جواب دیتا۔ باواجی کی بریکنگ نیوز نے میرا فیوز اُڑا دیا تھا۔ ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھتا رہا۔ آخر کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے عرض کیا ''باواجی! آپ چنگے بھلے دادوں، نانوں والی عمر کے تھے۔ آپ نے اس بدبخت کو جھڑک کیوں نہیں دیا۔ ایک تھپڑ دینا

تھا اس کے منہ پر، ہوش ٹھکانے آ جاتے پھر کبھی آپ کے نزدیک نہ پھٹکتی۔'' دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ پہلے تو بوڑھے باپ پر ڈورے ڈالے وہاں کام نہ بنا، تو آگے چل کر ایک سازش کے تحت بیٹے کی بیوی بن جائے۔ کھلنے دو ذرا آنکھ! کر دیں گے اس کا بھی تیا پانچا۔''

خاصی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد باوا جی نے یوں گوہر افشانی فرمائی ''نالائق، نانہجار پتر! یہ تیرے مکان اور دکان پر قبضہ جمانے کی سازش ہے۔ تیری پراپرٹی اپنے نام الاٹ کرا کے اور فٹا فٹ اسے بیچ بوچ کے اس نے پیر ڈنڈے شاہ کے ساتھ فرار ہو جانا ہے اور تیرا ککھ نہیں چھوڑنا ہے۔ پتا ہے تجھے؟ جب بابا تیرا اس فتنی سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا تو یہ شور مچا کر کہتی: ابھی جا کر پورے پنڈ میں ڈھنڈورا پیٹتی ہوں کہ یہ اللہ اللہ کرنے کی عمر والا بڈھا پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اے جیالے گھبرؤو! ڈانگ سوٹے، بندوق اور پستول لے کر گھروں سے باہر نکل آؤ اور پل پڑو اس بڈھے پر...... خبر دار! بچ کے نہ جانے پائے۔ اس کے شور شرابے سے ڈر کر بابا تیرا کئی مرتبہ بکری بنا۔ ممیا ممیا کر پیسے دے دے کر اس کی زبان بمشکل بند کرائی۔ میرے پرانے کاغذات میں حساب کتاب والی ایک پرانی کاپی پڑی ہو گی، ذرا اس کا صفحہ نمبر چودہ کھول کر دیکھنا۔ لکھا ہو گا بہی کھاتہ اندر مد بلیک میلنگ۔'' میری وفات سے ذرا پہلے رقم کا کل ٹوٹل چار ہزار دو سو بتیس روپے تھا۔ نیچے میں نے خالی جگہ چھوڑ کر یہ شعر لکھا ہے۔ غالباً غالب وغیرہ کا ہے:

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا!

بہرحال، جو اللہ کو منظور تھا وہی ہوا۔ بابا تیرا عزت و آبرو سے فوت ہوا۔ سنا ہے میرے جنازے میں پیر ڈنڈے شاہ بھی شامل تھا اور کندھا بدلتے ہوئے لوگوں سے کانا پھوسیاں کرتا پھر رہا تھا کہ ذرا دھیان رکھنا بابے کا کچھ پتا نہیں کہ کفن پھاڑ کر اٹھ بیٹھے اور آنکھیں ملتے ہوئے اعلان کر دے ''مجھ کو مردہ نہ سمجھنا۔ میں ابھی زندہ ہوں۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''لعنت بھیجیں باوا جانی! بہت ہو چکی، یہ کہانی پرانی۔ اب اگلا آرڈیننس جاری فرمائیں۔''

باوا جی بولے ''آرڈیننس کیا جاری کرنا ہے بے ہوش پتر! ہدایت نامہ خاوند پیش کرتا ہوں۔ غور سے سن۔ نمبر ایک، صبح اٹھتے ہی سگریٹ نوش ملنگنی کی پٹائی کر۔ نمبر دو، اس کے گڑ بڑ گھٹالہ جعلی ماموں کا داخلہ بند کر۔ واضح ہو کہ یہ اس کا ماموں نہیں، پہلا شوہر ہے جس سے وہ طلاق لے چکی ہے۔ نمبر تین، واضح اور واشگاف الفاظ میں اعلان کر دے کہ بیوی کو روٹی، کپڑا، تیل، صابن، سرخی اور دھوبی سوڈا نیز سگریٹ باقاعدگی سے دے گا لیکن مکان اور دکان پر تیری ملکیت اور حاکمیت برقرار رہے گی۔ بطور شوہر تیری رٹ کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ آئی سمجھ؟''

میں نے عرض کی ''سمجھ تو آ گئی باوا جی مگر آج آپ کے ہاتھ میں پتھر کی وجہ سمجھ نہیں آئی؟''

بولے ''پتر نانہجار یہ پتھر اس لیے لایا ہوں کہ تیری کھوپڑی پر رسید کروں جس میں عقل نہیں بھس بھرا ہوا ہے۔ عقل ہوتی تو بغیر دیکھے بھالے تو اس ملنگنی سے شادی کرتا۔ ایں؟''

یہ کہہ کر آپ جناب نے پتھر کھینچ کر ناچیز کے متھے پر مارا۔ دو چار تھپڑ بھی رسید کیے، آنکھ کھلی، تو کیا دیکھتا ہوں بیوی صاحبہ منہ پر چانٹے مار مار کر جگا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ چیخ بھی رہی ہیں ''ہائے ہائے لوگو! میں لٹی گئی جے، میرے چنگے بھلے خاوند کو جن چمٹ گیا ہے۔ اول فول بک رہا ہے، ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، باوا جی، باوا جی کی رٹ لگا رکھی ہے۔''

اس چیخم دھاڑ اور دست درازی پر عقل چکرا گئی۔ آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگے، ایک ایک کی دو دو نظر آنے لگیں۔ وہ بھی فوری ضعفِ بصارت کی وجہ سے۔ ورنہ ایک ہی بھاری تھی۔''

باوا جی کی تمام نصیحتیں اور فضیحتیں ذہن سے نکل گئیں۔ خود اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ بظاہر سوکھی سڑی نظر آنے والی بیوی کے آہنی دست و بازو کا اندازہ پہلی مرتبہ ہوا۔ بمشکل تمام، بڑی کشمکش اور دھول دھپے کے بعد اس جن جپھے سے خود کو چھڑایا۔ ایک گلاس پانی پیا تو عقل ٹھکانے آئی اور سانس بحال ہوا۔ ورنہ اس شیر کی بچی نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

کہا ''سن ملکانی! کان کھول کے سن، تیرا تمام خرچہ پانی، پان، تمباکو، سگریٹ، نسوار، کپڑا لتا، روٹی، سالن میرے ذمے مگر......''

اس ''مگر'' کے بعد میں نے ایک ڈرامائی وقفہ ڈالا۔ اس کے بعد بولا ''مگر دکان اور مکان میرے مرحوم باپ کی نشانی ہے۔ اس پر نہ تیرا کوئی حق ہے، نہ کوئی استحقاق۔ لہٰذا آیندہ ان دونوں چیزوں کے نام اپنے منہ پر نہ لانا۔ لائے گی تو پکڑ کر تھانے لے جاؤں گا پھر وہیں فیصلہ ہو جائے گا کہ ہونا کیا ہے؟''

کہاں تو وہ بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی تھی اور کہاں تھانے کا نام سنتے ہی اس کی گھگی بندھ گئی۔ گھگیاتے ہوئے بولی ''اللہ دا تینوں واسطہ! آیندہ تھانے کچہری کا نام اپنی زبان پر نہ لانا۔ میری طرف سے کوئی ڈیمانڈ نہیں البتہ میرا ماموں......''

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''خبردار! آیندہ ماموں کی حیثیت سے اس کا نام اپنی زبان پر نہ لانا۔ میں جان چکا ہوں کہ حقیقت کیا ہے اور اس سے تیرا رشتہ کیا ہے۔ اگر اب اس نے یہاں قدم رکھا، تو پکڑ کر سیدھا تھانے لے جاؤں گا وہاں جب ڈنڈا ڈولی ہو گی تو پھر نہ تیری چلے گی نہ تیرے ''ماموں'' کی۔ صرف ڈنڈا چلے گا اور سابق صدر ایوب خاں مرحوم فرما گئے ہیں۔ ڈنڈا پیر ہے بگڑیاں تگڑیاں دا پیر۔''

میری اس روح فرسا تقریر پر اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ ہکلانے اور بلبلانے لگی۔ آخر ہکلاتے ہوئے بولی ''میرے سرتاج! آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی ہو گا لیکن ایک عرض ہے۔''

میں نے بھوئیں اُچکا کر لاتعلقی سے کہا:

''کیسی عرض!''

''سگریٹ کی دو ڈبیاں لا دو۔''

اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''خبردار!' میں نے انگشت شہادت ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔'' ملک معاشی بحران سے دوچار ہے اور تجھے اٹھکیلیاں سوجھ رہی ہیں...... دو نہیں...... صرف ایک ڈبی!''

کچھ دیر تک وہ اپنی انگلیاں مروڑتی رہی...... پھر بولی ''اچھا ٹھیک ہے فی الحال صرف ایک ڈبی۔''

○○○

منتخب بات

بُری باتوں کے کیچڑ میں

سقراط کے ایک فارمولے کا دلپذیر تذکرہ
بڑے بڑے "سقراط" اس فارمولے کے محتاج ہیں

جاوید چودھری

افلاطون اپنے اُستاد سقراط کے پاس آیا اور کہنے لگا ''آپ کا نوکر بازار میں کھڑے ہو کر آپ کے بارے میں ہرزہ سرائی کر رہا تھا۔'' سقراط نے مسکرا کر پوچھا ''وہ کیا کہہ رہا تھا۔'' افلاطون نے جذباتی لہجے میں جواب دیا ''آپ کے بارے میں کہہ رہا تھا.....'' سقراط نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کروایا اور کہا ''تم یہ بات سنانے سے پہلے اسے تین کی کسوٹی پر رکھو، اس کا تجزیہ کرو اور اس کے بعد فیصلہ کرو کیا تمھیں یہ بات مجھے بتانی چاہیے۔'' افلاطون نے عرض کیا ''یا استاد تین کی کسوٹی کیا ہے؟'' سقراط بولا ''کیا تمھیں یقین ہے تم مجھے یہ بات بتانے لگے ہو یہ بات سو فیصد سچ ہے۔'' افلاطون نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا، سقراط نے ہنس کر کہا ''پھر یہ بات بتانے کا تمھیں اور مجھے کیا فائدہ ہوگا؟'' افلاطون خاموشی سے سقراط کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، سقراط نے کہا ''یہ پہلی کسوٹی تھی، ہم اب دوسری کسوٹی کی طرف آتے ہیں۔ ''مجھے تم جو بات بتانے لگے ہو کیا یہ اچھی بات ہے۔'' افلاطون نے انکار میں سر ہلا کر جواب دیا۔ جی! نہیں یہ بُری بات ہے۔'' سقراط نے مسکرا کر کہا ''کیا تم یہ سمجھتے ہو تمھیں اپنے اُستاد کو بُری بات بتانی چاہیے۔'' افلاطون نے انکار پھر میں سر ہلا دیا، سقراط بولا ''گویا یہ بات دوسری کسوٹی پر بھی پورا نہیں اترتی۔'' افلاطون خاموش رہا، سقراط نے ذرا سا رک کر کہا ''اور آخری کسوٹی، یہ بتاؤ وہ بات جو تم مجھے بتانے لگے ہو کیا یہ میرے لیے فائدہ مند ہے۔'' افلاطون نے انکار میں سر ہلایا اور عرض کیا ''یا اُستاد! یہ بات ہرگز ہرگز آپ کے لیے فائدہ مند نہیں۔'' سقراط نے ہنس کر کہا ''اگر یہ بات میرے لیے

فائدہ مند نہیں، تو پھر اس کے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟'' افلاطون پریشان ہوکر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

سقراط نے گفتگو کے یہ تین اصول آج سے چوبیس سو سال قبل وضع کردیے تھے، سقراط کے تمام شاگرد اس پر عمل کرتے تھے۔ وہ گفتگو سے قبل بات کو تین کسوٹیوں پر پرکھتے تھے، کیا یہ بات سو فیصد درست ہے، کیا یہ بات اچھی ہے اور کیا یہ بات سننے والے کے لیے مفید ہے، اگر وہ بات تینوں کسوٹیوں پر پوری اترتی تھی، تو وہ بے دھڑک بات کردیتے تھے اور اگر وہ کسی کسوٹی پر پوری نہ اترتی یا پھر اس میں کوئی ایک عنصر کم ہوتا، تو وہ خاموش ہوجاتے تھے۔

میں نے مغرب میں زیادہ تر لوگوں کو اس اصول پر کاربند دیکھا۔ ٹیورن اٹلی کا ایک خوبصورت شہر ہے، یہ شہر سوئٹزر لینڈ کی سرحد پر واقع ہے اور یہ اپنی اچھی ہمسائیگی کی وجہ سے بہت خوبصورت، پُرامن اور صحت افزا مقام ہے۔ یہ دو ہزار سال پرانا شہر ہے۔ اس کے درمیان سے دریائے پو گزرتا ہے، یہ دریا شہر کے حسن میں مزید اضافہ کردیتا ہے۔ ٹیورن انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کا ٹریننگ سینٹر ہے۔ مجھے 2009ء میں اس سینٹر میں انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن میں چھوٹا سا کورس کرنے کا موقع ملا۔ میں نے وہاں سے کچھ اور سیکھا یا نہیں سیکھا یہ الگ بات ہے لیکن مجھے سقراط کا یہ فارمولا سیکھنے کا موقع ضرور ملا۔ ہمارے تمام اساتذہ اطالوی تھے، کورس کی انچارج درمیانی عمر کی خاتون تھی۔ کورس کو آرڈی نیٹر بیس بائیس سال کی نوجوان لڑکی تھی اور مرکزی استاد ہماری عمر کا جوان فلپ تھا۔ یہ بے انتہا مستعد اور ماہر لوگ تھے۔ میرے گروپ میں آٹھ لوگ تھے، ان میں مصر کی درمیانی عمر کی ایک خاتون بھی شامل تھی۔ یہ خاتون لاابالی، غیر ذمے دار بلکہ تھوڑی سی بدتمیز بھی تھی۔ یہ عموماً گروپ کو چھوڑ کر کیفے ٹیریا چلی جاتی یا پھر سینٹر کے پب میں بیٹھ جاتی تھی۔ ایک دن فلپ نے مجھ سے پوچھا'' آپ کا گروپ کیسا چل رہا ہے؟'' میں نے پاکستانی روایات کے مطابق گروپ کے لوگوں کی غیبت شروع کردی۔ میرا سب سے بڑا ہدف مصری خاتون تھی۔ فلپ خاموشی سے سنتا رہا۔ میں بول بول کر تھک گیا، تو اس نے مجھے بتایا ہمارے سینٹر میں وائی فائی کی سہولت بھی موجود ہے اگر آپ کو اس کا پاس ورڈ درکار ہو تو آپ مہربانی کرکے ریسپشن سے لے لیں اور وہ اس کے ساتھ ہی وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ مجھے اس کا رویہ بہت بُرا لگا، مجھے محسوس ہوا اس نے مجھے ریسپانس نہ دے کر میری توہین کی ہے۔ میں بے عزتی کے احساس میں جلنے لگا لیکن پھر مجھے اچانک محسوس ہوا فلپ سقراط کے تین اصولوں کا وارث ہے۔ اس نے دیکھا میری بات کی سچائی مشکوک ہے، یہ بات بُری ہے اور اس بات کا اسے کوئی فائدہ نہیں چنانچہ اس نے اس میں کسی قسم کا انٹرسٹ ظاہر نہیں کیا۔ ہاں البتہ وہ مروت یا اخلاقیات کی وجہ سے میری بات سنتا رہا۔ میں نے جرمنی میں ایک بار ایک جرمن صحافی کو ہٹلر کے لطائف سنانا شروع کردیے۔ میں جوں جوں لطائف سناتا گیا وہ ہنسنے یا قہقہہ لگانے کے بجائے سنجیدہ ہوتا گیا۔ میں شرمندہ ہوگیا اور اُس سے پوچھا'' تم میرے لطائف سے لطف اندوز نہیں ہورہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا، یہ جھوٹے لطائف ہیں، ہٹلر ایسا نہیں تھا۔ دوسرا ہٹلر کی باتیں دنیا کے بے شمار لوگوں کو تکلیف دیتی ہیں، میں انھیں اچھا نہیں سمجھتا اور تیسرا یہ فضول اور بے معنی

چیزیں ہیں، ہم ان سے زیادہ اچھی گفتگو کرسکتے ہیں۔ چلو آؤ موسم کی بات کرتے ہیں۔ جرمنی میں اس سال سردیاں بہت دیر سے آرہی ہیں۔ میری شرمندگی میں اضافہ ہوگیا۔ میں نے ایک بار امریکا میں ایک جاپانی سے ناگا ساکی کے ایٹمی سانحے کے بارے میں پوچھا، اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور سنجیدگی سے بولا۔ ہم جاپانی 1945ء کے واقعے کو بُرا خواب سمجھتے ہیں چنانچہ ہم اس کا عموماً ذکر نہیں کرتے۔ آپ مجھ سے اچھی باتیں پوچھو۔ آج کل ٹوکیوں میں چیری بلاسم کا سیزن ہے۔ ہمارے شہر میں چیری کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور میں ان پھولوں پر جان دیتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا'' تم اس ذکر سے خائف ہو؟ اس نے فوراً جواب دیا'' نہیں! ہم بہادر قوم ہیں، ہم نے دو دو ایٹم بم سہے ہیں۔ آپ پوری دنیا میں جاپان کے بعد کوئی دوسرا ملک بتاؤ جس نے ایٹم بم کی تباہی کا سامنا کیا ہو مگر ہم اس کے باوجود صرف پندرہ برسوں میں اپنے قدموں پر کھڑے ہوگئے تھے لیکن ہم جاپانی سمجھتے ہیں ہمیں لوگوں کو اپنے دُکھ سنا کر ان کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں بے فائدہ باتوں میں بھی اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے اس سے پوچھا'' کیا تم امریکا کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے، کیا جاپانی امریکا سے نفرت نہیں کرتے؟'' اس نے ہنس کر جواب دیا'' میرے بھائی ہماری نفرت دوسری جنگ عظیم کے ساتھ ہی ختم ہوگئی تھی۔ ہم اگر اس نفرت کو '' کیری'' کرتے تو آج بھی ناگا ساکی اور ہیروشیما کے ملبے پر بیٹھ کر گریہ و زاری کررہے ہوتے۔ انسان کو محبت ہی سے فرصت نہیں ملتی کہ یہ نفرت بھی شروع کردے، ہم بے فائدہ یا فضول چیزوں میں نہیں الجھتے۔'' میری شرمندگی بڑھ گئی۔

یہ میری زندگی کے چند واقعات ہیں جبکہ میں نے درجنوں مرتبہ یورپ، امریکا اور مشرق بعید کے لوگوں کو سقراط کے تینوں اصولوں پر عمل کرتے دیکھا ہے۔ یہ غیبت، چغل خوری اور منفی باتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں جبکہ ہم میں یہ تینوں بُری عادتیں موجود ہیں۔ ہم ہر بات کو تبلیغ سمجھ کر پھیلاتے ہیں اور ہرگز ہرگز یہ نہیں سوچتے کیا یہ بات سچ بھی ہے، ہم یہ بھی نہیں دیکھتے یہ بات اچھی ہے اور ہم یہ بھی اندازہ نہیں کرتے کہ ہمیں یا سننے والے کو اس کا کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے؟ ہم بات کو کسوٹی کے تین اصولوں پر پرکھے بغیر اسے پھیلاتے چلے جاتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے نہیں سوچتے ہماری اس حرکت سے کتنے لوگوں کو تکلیف پہنچ رہی ہوگی۔ آپ کو یقین نہ آئے، تو آپ آج کے ایس ایم ایس دیکھ لیجیے۔ آپ کو ہر دوسرا ایس ایم ایس جھوٹا، بُرا اور بے فائدہ ملے گا۔ آپ کبھی اپنی گفتگو ریکارڈ کرکے سن لیں، آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے آپ کی زیادہ تر باتیں سنی سنائی، بُری اور بے فائدہ ہیں۔ ان باتوں سے سننے والے کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، البتہ ان سے اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ باتیں خلاف حقیقت اور غلط بھی ہیں۔ ہمارے اس رویے نے پورے معاشرے کو بیمار کررکھا ہے، ہم اگر بات کرتے ہوئے اس بات کو سقراط کے تین اصولوں پر پرکھ لیں، تو ہمارے معاشرے کی اینگزائٹی میں 50 فیصد کمی آسکتی ہے اور ہمارے اِرد گرد موجود لوگ بھی سکھی رہ سکتے ہیں۔ ورنہ دوسری صورت میں ہم بُری باتوں کے کیچڑ میں دفن ہوجائیں گے اور بُری خبروں کے چنگل میں بُری خبر بن کر رہ جائیں گے۔

کھیل کھلاڑی

پہلی گیند پہ کھلاڑی آؤٹ کر ڈالا

1992ء عالمی ورلڈ کپ اور 2009ء کی T20 فاتح ٹیموں کے کوچ نامور پاکستانی کرکٹر، انتخاب عالم کرکٹ سے جڑی یادیں تازہ کرتے ہیں

اعجاز چودھری

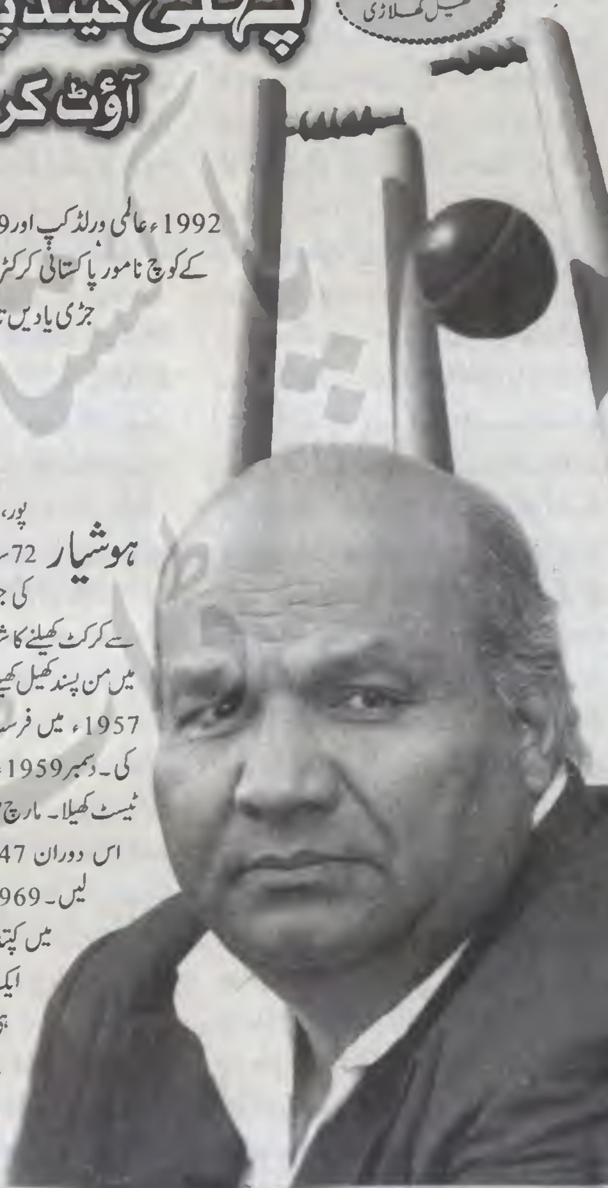

ہوشیار پور، بھارت میں جنم لینے والے 72 سالہ لیگ بریک بالر انتخاب عالم کی جوانی کراچی میں بیتی۔ بچپن ہی سے کرکٹ کھیلنے کا شوق تھا لہٰذا بیشتر وقت میدانوں میں من پسند کھیل کھیلتے بیتتا۔

1957ء میں فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنی شروع کی۔ دسمبر 1959ء میں آسٹریلیا کے خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلا۔ مارچ 1977ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس دوران 47 ٹیسٹ کھیل کر 125 وکٹیں لیں۔ 1969ء تا 1975ء سترہ ٹیسٹوں میں کپتانی بھی کی۔

ایک روزہ کرکٹ میں انتخاب عالم ہی پاکستانی ٹیم کے پہلے کپتان تھے۔ آپ کی قیادت میں پاکستان نے تین ون ڈے انٹرنیشنل کھیلے، دو جیتے اور ایک ہارا۔ 1992ء میں عالمی کپ جیتنے والی فاتح ٹیم کے کوچ تھے۔ 2004ء میں بھارتی پنجاب کی ٹیم نے آپ کو اپنا کوچ مقرر کیا۔ آپ کسی بھی مقامی بھارتی ٹیم کی کوچنگ کرنے والے پہلے غیر ملکی کوچ تھے۔

2009ء میں انتخاب عالم کو ایک اور کامیابی ملی جب ان کی کوچنگ میں پاکستانی ٹیم نے برطانیہ میں ٹی ٹوئنٹی 20 ورلڈ کپ جیتا۔

ڈینس للی

پچھلے دنوں پاکستانی کرکٹ کے لیے عظیم خدمات انجام دینے والے اس ہنس مکھ کھلاڑی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بیتی زندگی کے جو حالات اور واقعات سنائے، وہ انھی کی زبانی پیش خدمت ہیں۔

آصف اقبال کے ساتھ ریکارڈ

اگست 1967ء میں اوول، لندن میں ہمارا انگلستان سے مقابلہ ہوا۔ میں نے اس ٹیسٹ میں آصف اقبال کے ساتھ مل کر 190 رنز بنائے۔ یوں وکٹ کی شراکت کا نیا ریکارڈ قائم ہوا جو اکتیس سال تک برقرار رہا۔ دلچسپ بات یہ کہ فروری 1998ء میں جنوبی افریقن کھلاڑیوں، مارک باؤچر اور سمیوکس نے پاکستانی ٹیم کے خلاف کھیلتے ہوئے ہی یہ ریکارڈ توڑا۔ انھوں نے نویں وکٹ کی شراکت میں 195 رنز بنائے۔

آصف اقبال

جب میں کریز پر پہنچا، تو صرف 65 رنز پر ہمارے 8 کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ پاکستانی ٹیم سخت مصیبت میں تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ میری ایک آنکھ میں درد تھا۔ بہرحال میں نے ہمت پکڑی اور ''ٹک ٹک'' کرنے لگا۔ میری سعی تھی کہ آصف زیادہ کرکٹ کھیلے۔ اس نے 146 رنز بنا کر شاندار بلے بازی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے 51 رنز بنائے۔

ڈینس للی کی دہشت

1970ء کے عشرے میں آسٹریلوی بالر ڈینس للی نے بلے بازوں پر اپنی خطرناک بالنگ کی دھاک بٹھائے رکھی۔ خصوصاً نچلے مقام پر آنے والے (ٹیل اینڈر) کھلاڑی اس سے بہت خوف کھاتے۔ 72-1973ء میں ہم ٹیسٹ کھیلنے ایڈیلیڈ پہنچے۔ وہاں آسٹریلوی بالروں نے 208 رنز پر 8 پاکستانی کھلاڑی آؤٹ کر ڈالے۔ جب میں کریز پر تھا تو فاسٹ بالر سلیم الطاف آ ملے۔

سلیم الطاف نے پوچھا ''میں للی کی گیندوں کا مقابلہ کس طرح کروں؟

میں نے کہا ''ارے بھائی، یہ سوچ کر اس کا سامنا

کرو کہ وہ تمام فاسٹ بالروں جیسا گیند باز ہے۔''

اگلا ہی اوور للی کا تھا۔ اس نے پہلی گیند پر باؤنسر کرایا۔ گیند میرے دستانے سے ٹکرا کر فائن لیگ کی طرف گئی۔ یہ محض ایک رن تھا۔ مگر سلیم الطاف اوپن بولٹ کے مانند برق رفتاری سے بھاگا اور مجھے دوسرا رن لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کی تمنا یہی تھی کہ وہ للی کی تیز رفتار گیندوں کا مقابلہ نہ کرے۔

بہترین بالنگ

فروری 1973ء میں ہم نیوزی لینڈ ٹیم کے خلاف کھیلنے ڈیونڈن شہر پہنچے۔ میں نے اپنے کیریئر کی بہترین بالنگ وہیں کرائی۔ پہلی اننگ میں پاکستان نے 507 رنز بنائے۔ مشتاق محمد نے 201 جبکہ آصف اقبال نے 175 رنز بنا ڈالے۔ ہم نے پھر کیوی کھلاڑیوں کو 156 رنز پہ ڈھیر کر دیا۔ میں نے صرف 52 رنز دے کر 7 وکٹیں لیں۔ آج بھی کوئی پاکستانی بالر کسی غیر ملک میں اتنے کم رنز پر 7 وکٹیں نہیں لے سکا۔

نتیجتاً کیوی ٹیم فالو آن پر مجبور ہوگئی۔ دوسری اننگ میں ہم نے انھیں 185 رنز پر واپس پویلین بھجوایا۔ میں نے 4 جبکہ مشتاق محمد نے 5 وکٹیں لیں۔ پاکستانی ٹیم نے بہترین کھیل دکھا کر ٹیسٹ ایک اننگ اور 166 رنز سے جیت لیا۔

ریسٹ آف دی ورلڈ

1970ء میں جنوبی افریقن ٹیم نے برطانیہ آنا تھا، لیکن یہ دورہ ملتوی ہوگیا۔ تب ریسٹ آف دی ورلڈ کرکٹ ٹیم تشکیل دی گئی تاکہ وہ برطانوی ٹیم سے مقابلہ کر سکے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں پاکستان سے اس ٹیم کے لیے منتخب ہوا۔ اسی ٹیم نے اگلے سال آسٹریلوی کھلاڑیوں سے بھی دو دو ہاتھ کیے۔

موت سے فرار

1947ء میں بھارت سے پاکستان آتے ہوئے مجھے اپنے خاندان سمیت کئی بار موت کا سامنا کرنا پڑا۔ تب میرے الیکٹریکل انجینئر والد شملہ میں تعینات تھے۔ رفتہ رفتہ شہر میں مسلم دشمن جذبات عروج پہ پہنچ گئے۔ آخر والد کے ایک ہندو ماتحت نے اپنے گھر پناہ دے کر ہماری جان بچائی۔

ایک انگریز بریگیڈیئر میرے والد کا دوست تھا۔ افسر نے فوجی ٹرک بھجوایا، تو ہم راہ میں بکھرے ہندو اور سکھ غنڈوں سے بچتے بچاتے پٹیالہ پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے کچھ دن گزارے اور پھر پاکستان جانے کے لیے ٹرین پر سوار ہوئے۔ ہماری خوش قسمتی کہ ٹرین کو مال بردار سمجھا گیا، اسی لیے اُس پر حملہ نہیں ہوا۔ ہم بخیر و عافیت پاکستان پہنچ گئے۔

کرکٹ کی نرسری

میں نے کراچی میں چرچ مشن اسکول میں تعلیم پائی جو کرکٹ کی نرسری بھی کہلایا۔ اس اسکول کے کئی طلبہ نے دنیائے کرکٹ میں شہرت پائی۔ مشتاق محمد میرے ہم عصر تھے۔ بعد ازاں جاوید میاں داد اور ہارون رشید بھی وہیں سے نکلے۔

ٹیسٹ کرکٹ میں داخلہ

1958ء میں پاکستانی کرکٹ ٹیم ویسٹ انڈیز کا دورہ کر کے وطن پہنچی۔ تبھی فیصلہ ہوا کہ وہ کراچی کمبائنڈ اسکولز ٹیم سے میچ کھیلے۔ میں بھی اسکولز ٹیم میں شمولیت کے لیے ٹرائل دینے گیا مگر منتخب نہ ہو سکا۔

میرے مرحوم بھائی، آفتاب عالم پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کی عمدہ فرسٹ کلاس کرکٹ ٹیم کے رُکن تھے۔ انہی دنوں بھائی نے مجھے پریکٹس کرنے بلوا لیا کہ ٹیم کو بالروں کی ضرورت تھی۔ سوئے اتفاق کہ وہاں پاکستانی ٹیم کے بلے باز وقار حسن، وزیر محمد اور کپتان اے ایچ کاردار بھی پہنچ گئے۔

کاردار میری بالنگ سے متاثر ہوئے۔ مجھ سے پوچھا ''کیا کل تم اسکولز ٹیم کی طرف سے کھیل رہے ہو؟'' میں نے جواب دیا ''مجھے منتخب نہیں کیا گیا۔''

وہ بولے ''پھر تم کل پاکستانی ٹیم میں کھیلو گے۔''

چناں چہ میں نے میچ میں اسکولز ٹیم کے خلاف کھیلتے ہوئے چار وکٹیں لیں۔ تاہم میں پاکستانی ٹیم کا مستقل رُکن نہیں بن سکا۔

1959ء میں آسٹریلوی ٹیم نے پاکستان کا دورہ کیا۔ اس کا پریذیڈنٹ الیون سے تین روزہ مقابلہ ہوا۔ میں بھی اس کا رُکن تھا۔ میں نے میچ میں آٹھ وکٹیں لیں اور آسٹریلوی ہارتے ہارتے بچے۔ اسی میچ میں عمدہ کارکردگی دکھانے پر مجھے قومی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔

ریکارڈ جو بن نہ سکا

میں طویل عرصہ انگلستان کاؤنٹی کلب سرے (Surrey) سے وابستہ رہا۔ 1970ء میں اوول میں ہمارا مقابلہ مڈل سیکس کاؤنٹی ٹیم سے ہوا۔ میں نے اس میچ میں مخالف ٹیم کے پہلے آٹھ کھلاڑی ''کس'' کر دیے۔ مجھے یقین تھا کہ بقیہ دو وکٹیں بھی میرے حصے میں آئیں گی۔ لیکن رابن جیک مین نے بڑا ہی آسان کیچ چھوڑ دیا۔

بعد ازاں رابن ہی نے ایک اوور میں دونوں بقیہ کھلاڑی آؤٹ کر دیے۔ جب کھیلنے کی ہماری باری آئی، تو میں نے سنچری بنائی۔ یوں میں ایک منفرد ریکارڈ بنانے سے رہ گیا۔ اگر رابن کیچ پکڑ لیتا، تو ممکن تھا، میں فرسٹ کلاس کرکٹ میں ایک میچ کے دوران 10 وکٹیں لینے اور سنچری بنانے والا پہلا کھلاڑی بن جاتا۔

1971ء میں کاؤنٹی چیمپئن شپ انجام پائی۔ سرے ٹیم تیرہ برس بعد میری شاندار باؤلنگ کے نتیجے میں کامیاب رہی۔ دوران چیمپئن شپ میں نے 104 وکٹیں لیں۔

ہم نے ہیمپشائر کرکٹ ٹیم کے خلاف آخری میچ کھیلا۔ اس سے سرے اور وار وِک شائر ٹیم کے پوائنٹس برابر تھے۔ اگر ہم میچ جیت جاتے، تو دو بونس پوائنٹ ملنے کی وجہ سے چیمپئن بننے کے حق دار بھی ٹھہرتے۔

مقابلہ بہت دلچسپ ہوا۔ خصوصاً ہیمپشائر ٹیم کا کپتان، رچرڈ گلیات وکٹ پر جم گیا اور آؤٹ ہونے کا نام نہ لیا۔ وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ رچرڈ نے آخری وکٹ کی شراکت کو بہت طول دے ڈالا۔ تب مجھے یہ سوجھی کہ اُسے گگلی (بالیں) کرائی جائیں۔ میری حکمت عملی رنگ لائی اور وہ چوتھی بال پر بولڈ ہوگیا۔ یوں ہم چیمپئن بننے میں کامیاب رہے۔

کھیل کے سنسنی خیز لمحات

گو نیوزی لینڈ کے خلاف ڈیونڈن ٹیسٹ (1973ء) ہم نے ایک اننگ سے جیتا مگر میچ کے آخری لمحات بہت سنسنی خیز ہوگئے تھے۔ ہوا یہ کہ چوتھے دن جب کیوی بلے بازوں کا آخری جوڑا کھیل رہا تھا، تو بوندا باندی شروع ہوگئی۔

اب امپائر کھیل روکنے کا سوچنے لگے۔ یہ دیکھ کر مجھ سمیت سبھی پاکستانی بالر ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے کہ کسی طرح آخری کیوی بلے باز آؤٹ ہوجائے۔ خوش قسمتی سے مجھے کامیابی ملی اور میں نے جمے ہوئے بیٹسمین وک پولارڈ کی وکٹ اڑادی۔ دو ہی منٹ بعد زوردار بارش ہونے لگی اور ہم سرپٹ پویلین کی جانب دوڑ پڑے۔ پھر دو دن تک مسلسل بارش ہوتی رہی۔ اگر پولارڈ آؤٹ نہ ہوتا، تو یقیناً وہ ٹیسٹ ڈرا ہوجاتا۔

پہلی گیند پر وکٹ

میں نے دسمبر 1959ء میں آسٹریلوی ٹیم کے خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلا۔ دوسرے دن جب کھیل ختم ہونے میں بیس منٹ رہ گئے، تو کپتان فضل محمود نے مجھے بالنگ کرانے بلایا۔ فاسٹ بالر چند اوور کرا چکے تھے مگر وہ کسی کو آؤٹ نہ کرسکے۔

میں نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کی پہلی گیند روایتی انداز میں لیگ بریک کرائی۔ سامنے آسٹریلوی بلے باز کولن میکڈونلڈ کھڑا تھا۔ وہ کٹ شاٹ کھیلنے لگا تھا۔ جیسے ہی وہ شاٹ کھیلنے بیک فٹ پر گیا، گیند ٹپا کھا کر اندر کی جانب آئی۔ وہ اُسے سمجھ نہ سکا اور گیند نے درمیانی وکٹ اڑادی۔

کولن کے آؤٹ ہوتے ہی بھرے اسٹیڈیم میں موجود سبھی مرد و زن اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ تالیاں بجا کر مجھے داد دے رہے تھے۔ آج بھی میں ٹیسٹ کرکٹ میں پہلی گیند پر وکٹ لینے والا واحد پاکستانی کھلاڑی ہوں۔

پسندیدہ بال و شاٹ

میں خود کو بلے باز کی نسبت اچھا بالر سمجھتا تھا۔ گو آڑے وقت میں بلے بازی بھی کرلیتا۔ اسی باعث مجھے آل راؤنڈر کہا گیا۔ اسلحہ بالنگ میں فلپر (Flipper) میرا بہترین ہتھیار تھا۔ جبکہ بلے بازی میں کور ڈرائیو میری پسندیدہ شاٹ رہی۔

ہمت نہ ہارو

ہمیشہ اُمید کی شمع جلائے رکھنا میرا وتیرہ رہا ہے۔ نہایت کٹھن حالات میں بھی میں نے ہار نہیں مانی۔ پاکستانی ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے گو مجھے تین بار بڑے صدموں کا سامنا کرنا پڑا۔

1971ء میں ہم لیڈز ٹیسٹ صرف 25 رنز سے ہار گئے۔ اگر ہم جیت جاتے، تو ہماری ٹیم برطانیہ کے خلاف ٹیسٹ سیریز جیتنے والی پہلی پاکستانی ٹیم بن جاتی۔ پھر 1972ء میں ہم میلبورن ٹیسٹ 92 رنز اور سڈنی ٹیسٹ صرف 52 رنز سے ہارے۔ اگر یہ شکستیں نہ ہوتیں، تو ہم برطانیہ اور جنوبی افریقہ کے بعد آسٹریلیا میں ٹیسٹ سیریز جیتنے والی تیسری ٹیم بن جاتے۔

ہر بار ٹارگٹ معمولی رنز پر مشتمل تھا لیکن ہمارے بلے باز نہ چل پائے۔ میلبورن ٹیسٹ میں ہمارے تین بیٹسمین رن آؤٹ ہوئے۔ تینوں ٹیسٹوں کی ہار اب بھی کابوس بن کر نیند میں مجھے ڈراتی اور کبھی تو جگا تک دیتی ہے۔

میرے پسندیدہ کھلاڑی

لڑکپن میں برطانوی کھلاڑی کیتھ ملر میرے آئیڈیل تھے۔ پھر ویسٹ انڈین آل راؤنڈر گیری سوبرز کے کھیل نے مجھ پر سحر طاری کیے رکھا۔ وہ ایک غیر معمولی کھلاڑی تھے۔ جب ورلڈ الیون نے آسٹریلیا کا دورہ کیا، تو میں نے ہی نائب کپتان کی ذمے

داریاں نبھائیں۔ ان سے بہت اچھی نبھی۔

پاکستانی ٹیم میں آصف مسعود میرے بہترین دوست رہے۔ وہ بااخلاق، بااصول، خوش اخلاق اور دوست دار شخص تھے۔ تاہم تمام کھلاڑیوں کے ساتھ میرے خوشگوار تعلقات رہے۔

آسٹریلوی بلے باز، آئن چیپل کو بالنگ کراتے ہوئے ہمیشہ میں نے انبساط محسوس کیا۔ وہ بے پناہ اعتماد اور بہترین فٹ ورک کے مالک تھے۔ چھکے چوکے مارنے ہوں یا دفاع کرنا ہو، کریز سے نکل کر کھیلنا ان کا معمول تھا۔

ایک بار آئن چیپل کی بات سن کر مجھے فخر محسوس ہوا۔ انھوں نے بتایا ''جب ورلڈ الیون اور آسٹریلیا کے مابین میچ ہوا، تو میں نے آپ کا ایک اوور کھیلا۔ وہ میری زندگی کے چند مشکل ترین اووروں میں سے ایک تھا۔''

ویسٹ انڈین بالر، اینڈی رابرٹس کا سامنا کرتے ہوئے ہمیشہ میں مشکلات کا شکار رہا۔ دراصل وہ تیز رفتار ہی نہ تھا بلکہ بڑی چالاکی سے نپی تلی گیندیں پھینکتا۔ اس کے اسلحہ خانے میں ہر رنگ بالیں موجود تھیں۔ کوئی نہ کوئی بلے باز کی وکٹ اکھاڑ ہی پھینکتی۔

دنیا کا پہلا کرکٹ منیجر

میں نے 1981ء میں بین الاقوامی کرکٹ کھیلنا ترک کی۔ پھر میں لاہور منتقل ہوا اور ایک ٹیکسٹائل مل لگالی۔ اس زمانے میں نور خان مرحوم پاکستان کرکٹ بورڈ کے سربراہ تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھے بلایا اور ایسے موضوع پر گفتگو کی جو تب دنیائے کرکٹ میں اچھوتا تھا...... وہ فٹ بال ٹیم کے مانند پاکستانی کرکٹ کی خاطر بھی کل وقتی منیجر بننے کی پیش کش تھی، جو قبول کرلی گئی۔

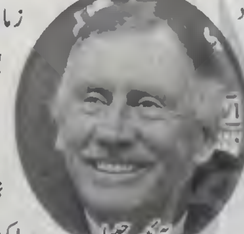
آئین چیپل

1982ء میں نور خان اور سیکرٹری بورڈ، عارف عباسی نے مجھ سے مشورہ کیا کہ کس کھلاڑی کو دورہ انگلستان کے سلسلے میں ٹیم کا کپتان بنایا جائے۔ میں نے عمران خان کا نام تجویز کیا۔ نور خان کہنے لگے کہ ٹیم میں کئی کھلاڑی اس سے سینئر ہیں، وہ احتجاج کریں گے۔ تاہم میں عمران ہی کو اہل سمجھتا تھا۔

میرے اصرار پر نور خان مان گئے۔ بولے کہ عمران سے بات کرو۔ عمران خان سے بات ہوئی، تو وہ بھی سینئر ساتھیوں کا سوچ کر پہلے ہچکچایا، پھر مان گیا۔ یوں اس کی کپتانی میں پاکستانی کرکٹ کا تابناک دور شروع ہوا۔

1992ء کا عالمی کپ

جس پاکستانی کرکٹ ٹیم نے 1999ء کا ورلڈ کپ جیتا، میں اس کا کوچ تھا اور منیجر بھی۔ آج بھی اس جیت کے لمحات میری زندگی میں سب سے یادگار و بے مثال حیثیت رکھتے ہیں۔

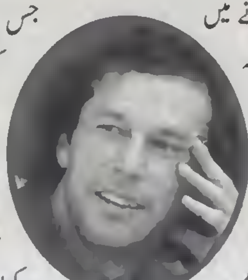
عمران خان

شروع میں ہم نے خاصی بُری کارکردگی دکھائی اور اولین پانچ میچوں میں سے صرف

ایک میچ جیت سکے۔ تاہم عمران خان اور میں نے ساتھیوں کا حوصلہ بلند رکھا۔ ہمارا کہنا تھا ''کبھی ہمت نہ ہارنا، یہ گناہ کے مترادف ہے۔''

ہم نے کرائسٹ چرچ میں اپنا آخری لیگ میچ نیوزی لینڈ کے خلاف کھیلا۔ اس میں ہمیں فتح نصیب ہوئی۔ لیکن ہمارے سیمی فائنل میں پہنچنے کا دارومدار ویسٹ انڈیز بمقابلہ آسٹریلیا کے میچ پر تھا۔ جیسے ہی ہمارا میچ ختم ہوا، وہ شروع ہوگیا۔

پوری پاکستانی ٹیم نے ہوٹل میں وہ میچ دیکھا۔ جب آسٹریلوی ٹیم صرف 217 رنز بنا کر آؤٹ ہوئی، تو ہمارے چہرے اُتر گئے اور مایوسی نے ہمیں گھیرلیا۔ یہی لگنے لگا کہ اگلی صبح سامان باندھ کر ہمیں پاکستان جانا پڑے گا۔

لیکن جب ویسٹ انڈین بلے بازوں نے کھیل کا آغاز کیا، تو وہ رفتہ رفتہ آؤٹ ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی ورنہ ٹارگٹ تو بہت مختصر تھا۔ فتح نے تو آسٹریلوی ٹیم کے قدم چومے لیکن خوشی و مسرت سے ہم جھوم اُٹھے کہ سیمی فائنل میں پہنچ گئے تھے۔

میں نے پھر عمران خان پر زور دیا کہ وہ سیمی فائنل میں پانچویں یا چھٹے کے بجائے تیسرے نمبر پر کھیلنے جائے۔ وجہ یہ ہے کہ تب تک وہ تجربے کار اور ٹھنڈا مزاج رکھنے والا کھلاڑی بن چکا تھا۔ کچھ بحث مباحثے کے بعد اس نے میری تجویز مان لی۔ عمران نے سیمی فائنل میں 44 جبکہ فائنل میں 72 رنز بنائیں اور فتوحات پانے میں اہم حصہ لیا۔

> میں نے رپورٹ میں تمام واقعات دیانت داری سے لکھ ڈالے۔ سات کھلاڑیوں کو جرمانے ہوئے، پابندیاں لگیں یا ان کی نگرانی ہونے لگی۔ بدقسمتی سے جلد ہی ساری سزائیں معاف کردی گئیں۔ اس کمزور رویے اور غلط فیصلے کے باعث کھلاڑی کھل کر من مانی کرنے اور اپنی مرضی چلانے لگے۔

فائنل میں برطانیہ کو شکست دے کر مجھے یوں بھی فخر محسوس ہوا کہ برطانوی ٹیم کا منیجر مکی سٹیورٹ، سرے کاؤنٹی ٹیم میں میرا سابق کپتان تھا۔

میرا منفرد ریکارڈ

میں پہلا پاکستانی کھلاڑی ہوں جس نے ایک ہزار رنز بنانے کے علاوہ ٹیسٹ کرکٹ میں ایک سو وکٹیں بھی حاصل کیں۔

نرم مزاجی کا شاخسانہ

2010-09ء میں آسٹریلوی ٹیم سے کھیلتے ہوئے قومی ٹیم کئی تنازعات کا شکار رہی۔ خصوصاً کھلاڑیوں کے غیر سنجیدہ رویے کی وجہ سے ہم دوسرا ٹیسٹ ہار گئے جو شرمناک بات تھی۔ مجھے کہا گیا کہ بحیثیت کوچ پی سی بی انکوائری کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کردوں۔

میں نے رپورٹ میں تمام واقعات دیانت داری سے لکھ ڈالے۔ سات کھلاڑیوں کو جرمانے ہوئے، پابندیاں لگیں یا ان کی نگرانی ہونے لگی۔ بدقسمتی سے جلد ہی ساری سزائیں معاف کردی گئیں۔ اس کمزور رویے اور غلط فیصلے کے باعث کھلاڑی کھل کر من مانی کرنے اور اپنی مرضی چلانے لگے۔

ooo

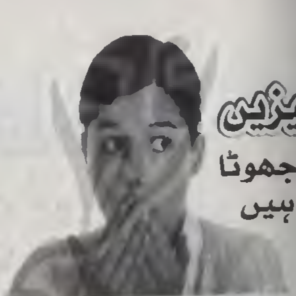

6 چیزیں جو ہمیں جھوٹا بنادیتی ہیں

رعنا جاوید

جھوٹ کی بہت سی اقسام ہیں مثلاً بولا جانے والا جھوٹ، زبردستی بولا جانے والا جھوٹ، جان بوجھ کر بولا جانے والا جھوٹ اس کے علاوہ سفید اور شوقیہ جھوٹ بھی اس کی مشہور اقسام ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ جھوٹ کی ان اقسام کا استعمال کرتے کرتے خود جھوٹے مشہور ہوجاتے ہیں۔

1۔تحفہ پر جھوٹ

پہلی چیز ہے ''تحائف'' جنہیں وصول کرنے کے لیے ہمیں ہر حال میں تحفہ دینے والے کا شکریہ ادا کرنا پڑتا ہے تحفہ چاہے کتنا ہی برا کیوں نہ ہو ہمیشہ مسکراتے ہوئے جبراً کہنا ہی پڑتا ہے کہ ہمیں وہ تحفہ بے حد پسند آیا۔ جھوٹ کی یہ عادت ہمیں بچپن ہی سے ورثے میں مل جاتی ہے جب والدین بچوں کو سکھاتے ہیں کہ جب کوئی تحفہ دے تو شکریہ کے ساتھ تحفے کی تعریف بھی ضرور کرنی چاہیے۔

2۔عزیز و دوست کی جھوٹی تعریف

دوسرا جھوٹ اس صورتحال میں بولنا پڑتا ہے کہ جب آپ کو کسی رشتہ دار یا دوست کی جھوٹی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں کرتے تو تعلقات میں خرابی پیدا ہوسکتی ہے اس لیے آپ کو مسکراتے ہوئے یہ جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔ ''آپ بہت خوبصورت لگ رہے ہیں۔''

3۔سفید جھوٹ

جھوٹ کی تیسری قسم سفید جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی بہت مصیبت میں پھنس جائے۔ ایسے موقع پر سفید جھوٹ کا استعمال کرکے سچ کو بدل کر پیش کردیا جاتا ہے۔ خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کام میں نے تو کیا ہی نہیں یا میں جانتا ہی نہیں۔ ایسا جھوٹ ہمیشہ پکڑا جاتا ہے۔ یہ عادت بچپن سے انسان کی فطرت میں شامل ہوجاتی ہے۔

4۔موٹاپے پر جھوٹ

اکثر لوگ جو بہت موٹے ہوتے ہیں۔ ہم انھیں وزن کم کرنے کا مشورہ دینے کے بجائے جھوٹ بول دیتے ہیں کہ وہ بالکل ٹھیک لگ رہے ہیں۔ انھیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس جھوٹ کی بجائے آسانی سے سچ بھی تو بولا جاسکتا ہے۔

5۔ملازمت اور انٹرویو پر جھوٹ

جو افراد ملازمت کے لیے کوئی انٹرویو دینے جاتے ہیں ان سے پوچھا جائے کہ وہ کتنی تنخواہ پر کام کرنا چاہتے ہیں وہ اکثر جھوٹ بول دیتے ہیں کہ پہلی جگہ پر وہ اتنے پیسے لے رہے ہیں اور بہت زیادہ تنخواہ کی ڈیمانڈ کردیتے ہیں۔ حالانکہ انھیں چاہیے کہ وہ صرف اتنی ہی تنخواہ کا تقاضا کریں جتنی تنخواہ کو وہ اپنے کام کے لحاظ سے اپنا حق سمجھتے ہیں۔ مبالغہ پکڑا جاتا ہے۔

6۔والدین کا بچوں سے جھوٹ

اکثر والدین بچوں کو رات کو سلانے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں ''سوجاؤ ورنہ جن آجائے گا'' یہ جھوٹ بول کر والدین بچے کی شخصیت کو تباہ کردیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اس جھوٹ کی وجہ سے بچہ تاحیات اس ڈر سے چھٹکارہ نہیں پاسکتا۔

ooo

اندھی تقلید کرنے والے

بھینس کا علاج

تک تو صحیح کر نہیں کرسکتے

Spare the rod & Spoil the child

پروفیسر محمد عبدالنعیم خان

> وقت ہاتھ میں ہو، تو موت کے علاوہ ہر کمی کوتاہی سے بچا جاسکتا ہے۔ غلطی کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ جدت اور ترقی ہر زمانے کا لازمی حصہ ہے۔ جدیدیت کوئی حرام شے نہیں جس سے ہر حال میں بچنا ہو۔ تقلید بُری نہیں مگر اندھی تقلید ہلاکت خیز ہے۔

کہتے ہیں کہ کسی شخص کی بھینس بیمار ہوگئی۔ وہ اپنے دوست کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ جب تمھاری بھینس بیمار ہوئی تھی تو تم نے کیا کیا تھا؟ دوست نے کہا کہ میں نے اسے مٹی کا تیل پلایا تھا۔ یہ سُن کر وہ شخص فوراً پلٹا اور اپنے گھر پہنچ کر بھینس کو مٹی کا تیل پلا دیا۔ کچھ ہی دیر میں بھینس مرگئی۔ یہ دیکھ کر وہ بہت طیش میں آیا اور پھر دوست کے گھر جا پہنچا، اسے بتایا کہ میں نے بھینس کو مٹی کا تیل پلایا تو وہ مرگئی۔ دوست نے کہا میری بھینس بھی مرگئی تھی۔ یہ سن کر اس شخص نے کہا ''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں'' دوست نے جواب دیا ''تم نے پوچھا کب تھا؟''

ہمارے حالات بھی اسی نادان شخص کے مانند ہیں کہ کسی کا عمل دیکھ کر نتیجے کی پروا کیے بغیر ویسا ہی عمل شروع کر ڈالتے ہیں اور کچھ عرصے بعد پچھتاتے ہوتے ہیں۔ یورپ، امریکا کے عوامل کی اندھا دھند

تقلید کے نتیجے میں ہمارے بھینسوں کے باڑے کی بہت سی بھینسیں ہلاک ہوچکی ہیں لیکن حرام ہے جو ہم نے سبق سیکھا ہو۔ ہم باقی ماندہ بھینسوں کو بھی تقلید کا تیل پلا پلا کر ان کے دم نکلنے کے منتظر ہیں۔ پھر ایک روز ہم مغربی دنیا سے گلہ کریں گے، تو ہمیں جواب ملے گا کہ بھائی تم نے ہم سے پوچھا ہی کب تھا؟

اندھا دھند تقلید کا آغاز زمانہ جدید کی چکا چوند سے ہوا جب ہم نے یورپی مصنوعات کا استعمال شروع کیا۔ برصغیر پر قبضے کے بعد یورپی اقوام نے پہلے پہل یورپی اسلحے کا دیسیوں پر استعمال شروع کیا جس کے رعب میں آکر دیسی بھی اپنے ہم نسلوں پر یورپی اسلحے کا استعمال کرنا سیکھ گئے۔ دیسی لباس کی جگہ یورپی لباس اور دیسی زبان کی جگہ یورپی زبان قابل فخر عمل ٹھہری۔

انگریزوں نے بڑے پیمانے پر سب سے پہلے ہمیں چائے کا عادی بنایا جس کی تشہیری مہم میں برصغیر میں پہلی بار نوجوان خواتین کو استعمال کیا گیا، جو ریلوے اسٹیشنوں پر مسافروں کو مفت میں چائے پلا کر چائے کی فروخت میں اضافے کا باعث بنتی تھیں۔ چائے کی فروخت زیادہ ہوئی تو لسی اور دودھ کا استعمال کم ہوتا چلا گیا۔ موٹر سائیکل اور موٹر کار کی برصغیر میں آمد ذریعہ سفر میں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس کے ساتھ ہی ریل اور ہوائی جہاز کی آمد نے سفر کو نیا رُخ عطا کیا۔ اب طرز تعمیر اور انداز بود و باش کی باری تھی۔ ہمیں یورپ سے آیا ہوا ہر تعمیری نقشہ قابل اعتبار معلوم ہوا اور ہم اپنی عمارات کی تعمیر بھی یورپی انداز میں کرنے لگے۔ اس تقلید میں ہم یہ بھی بھول گئے کہ یہ تمام انداز سرد ممالک کی ضرورت کے مطابق تیار کیے گئے ہیں جبکہ ہم شدید گرم علاقے کے باسی ہیں۔ بُرا ہو اندھی تقلید کا، ہم صحن کی نعمت اور کھلی ہوا میں سانس لینے سے بھی محروم ہوگئے۔

جدت اور ترقی ہر زمانے کا لازمی حصہ ہے۔ جدیدیت کوئی حرام شے نہیں جس سے ہر حال میں بچنا ہو۔ تقلید بُری نہیں بلکہ اندھی تقلید ہلاکت خیز ہے۔ کاش طبعی اشیا کی تقلید میں ہم نے اپنے زمان و مکاں کو مدنظر رکھ کر اپنی ضرورت کے مطابق جدت پیدا کر کے اشیا کو استعمال کیا ہوتا تو ہم بھی طبعی اشیا سے بہتر انداز میں فوائد حاصل کر پاتے۔ محض تقلید نے ہمارا مٹی کا مادھو ہونا آشکار کر دیا۔

طبعی اشیا اور ان کا استعمال اس قدر ضرر رساں نہیں۔ اصل ہلاکت خیزی تو اس وقت شروع ہوئی جب ہم نے معاشرتی میدان میں اندھی تقلید کی راہ اختیار کی۔ یورپی معاشرت کو برصغیر کے لوگوں نے حاکموں کی صورت میں تو دیکھ رکھا تھا یا کبھی کبھی انگریزی فلموں میں اس معاشرت سے واقفیت حاصل ہوتی تھی لیکن صورت حال اس وقت تبدیل ہوئی جب برصغیر میں ٹیلی ویژن کی آمد ہوئی۔ پاکستان میں ٹیلی ویژن اسٹیشن کا قیام پاکستان کو دیے جانے والے پہلے بڑے امریکی پیکج کی لازمی شرط تھی۔ پہلے یورپی معاشرت کا مشاہدہ گھر سے باہر جا کر ہوتا تھا۔ اب یورپی معاشرت ہمارے گھر میں مشہود ہوئی اور ہم شاہد ٹھہرے۔

اس کو مہمیز اس وقت ملی جب ہمارے ہاں ڈش انٹینا اور کیبل نیٹ ورک کی آمد ہوئی۔ رہی سہی کسر انٹرنیٹ اور کمپیوٹرز کی فراہمی نے پوری کردی جو ہمارے بڑوں کے ذریعے بچوں کے ہاتھوں میں آگیا۔

اب ہم ایک نئے دور میں داخل ہوئے جسے ''میڈیا کا دور'' کہا جاتا ہے۔ میڈیا کے حسن و قبح پر بحث اور اس کے حرام و حلال کے فیصلے کا حق بھی میڈیا ہی کے پاس ٹھہرا۔ میڈیا نے خود ہی رنگ برنگ موضوعات پر مباحث کا اہتمام کیا اور خود ہی اپنے حق میں فیصلے دے کر اپنے ہر قدم کے جواز کو سند عطا کی۔

میڈیا (یہ اصطلاح اب صرف الیکٹرانک میڈیا کے متبادل کے طور پر استعمال ہورہی ہے) کے مشاہدے کا آغاز صبح کی نشریات کے ساتھ ہوتا ہے۔ جسے عرف عام میں ''مارننگ شو'' کہا جاتا ہے۔ مارننگ شو میں پہلے پہل خواتین کے لیے کھانے پکانے اور سینے پرونے کے پروگرام پیش کیے گئے جس کے بعد اب ہر پروگرام کا لازمی حصہ رقص و موسیقی بن گیا۔ بہت سی خواتین و حضرات جنھیں ہم بہت عرصے سے دیکھتے چلے آرہے تھے اور وہ دیگر پروگراموں میں ہمیں خاصے سنجیدہ اور سلجھے ہوئے نظر آتے تھے۔ مارننگ شوز میں آکر چھچھورے رقاص ثابت ہوئے۔ ان پروگراموں میں اس چھچھور پن کا آغاز شادی بیاہ کی نام نہاد رسموں سے ہوا جو بڑھ کر اب محض ''مجرے'' بن کر رہ گئی ہیں۔ ہم نے جوان العمر سے لے کر اچھی خاصی عمر رسیدہ خواتین کو یہ مجرے کرتے دیکھا۔ یقین مانیے کہ سر شرم سے جھک گئے کہ نانی دادی کہلانے والی یہ خواتین کس ثقافت کی نمایندگی کررہی ہیں۔ رقص و موسیقی کے ہماری زندگی میں اس قدر دخیل ہونے کا کمال اس وقت سامنے آیا جب مسلم لیگ ق کی ایک انتخابی محفل میں

اس عمل سے فوائد تو نجانے کیا حاصل ہوئے لیکن ٹیچرز خوف زدہ اور طلبا خودسر ہوگئے۔ تعلیمی نظم و ضبط کمزور پڑگیا اور تعلیمی استعداد تنزلی کا شکار ہوگئی۔

چودھری شجاعت کے سامنے اسی قسم کا مظاہرہ کیا گیا جسے حاضرین نے خوب ڈھٹائی سے برداشت کیا اور داد بھی دی۔

میڈیا (یعنی الیکٹرانک میڈیا) میں ایک بدرسم کا آغاز ہوا ہے جسے بولڈ موضوعات پر گفتگو کا نام دیا گیا ہے۔ بولڈ ہونے کی آڑ میں زیادہ تر ان موضوعات کا انتخاب کیا جارہا ہے جن کا تعلق عائلی و ازدواجی زندگی اور جنسی معاملات سے ہے۔ وہ باتیں جو عقلاً بالغ اور مخصوص افراد کے درمیان ہونی چاہئیں اب کھلے عام کی جارہی ہیں اور کچے ذہنوں کو آلودہ کیا جارہا ہے۔ سکرین کے ایک کونے میں ''PG'' لکھ دینا یا ''بچے نہ دیکھیں'' لکھ دینا اس بات کی ہرگز ضمانت نہیں کہ یہ پروگرام کون دیکھ رہا ہے۔ پیمرا نامی ادارہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے کہ میڈیا اس قدر منہ زور، منہ پھٹ اور طاقتور ہوگیا کہ ''مافیا'' کے انداز میں ایک دوسرے کو سہارا دے رہا ہے..... زیارت ریذیڈنسی کے حوالے سے قائم ہونے والا مقدمہ اس کی مثال ہے جب اس ''مافیا'' نے زور ڈال کر حکومت سے مقدمہ واپس کروا دیا۔

کچھ عرصہ قبل اسی میڈیا پر ایک ایسی بحث پیش کی گئی جس میں فحش ویب سائٹس کے حوالے سے گفتگو پیش کی گئی۔ حاصل کلام یہ تھا کہ آپ ان کو اب روک نہیں سکتے اور ساری دنیا میں یہ ویب سائٹس عام ہیں اگر ہمارے ہاں بھی ہیں تو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اپنی تربیت اتنی بہتر کریں کہ نوجوان اس جانب متوجہ

ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ مغربی تقلید کے حامل شر کا مغرب سے بڑھ کر جواز پیش کررہے تھے۔ چند روز قبل برطانوی وزیراعظم کا بیان نظر سے گزرا جس میں تجربے اور تجزیے کی بنیاد پر اس نے فحش مواد کے خلاف فیصلے لینے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ مواد ہمارے بچوں کا بچپن تباہ کررہا ہے۔ جب مغرب اس مواد پر پابندی لگائے گا تو پھر ہمارے نام نہاد مفکرین کیا جواز پیش کریں گے۔

پڑھے لکھے پنجاب کے زمانے میں مغرب سے امداد کے بدلے ہمیں ''مار نہیں پیار'' کا نعرہ ملا۔ یہ نعرہ ہم نے ہر اسکول کے باہر اور اندر بورڈ پر لکھ کر لگایا۔ اس کے نیچے محکمہ تعلیم کے افسران کے ٹیلی فون نمبر دیے گئے تھے جن کو فون کرکے مار پیٹ کرنے والے ٹیچرز کے خلاف فوراً کارروائی کا وعدہ کیا گیا تھا۔

اور ہاں امریکا کی بھی سن لیجیے جہاں مار نہیں پیار کے نتیجے میں اسکولوں میں طلبہ کے بدمعاش گروہ پرورش پارہے ہیں۔ جن کی سرکوبی کے لیے مسلح محافظ تعینات کیے جاتے ہیں۔ امریکا کے اسکولوں میں طلبا کے ایک دوسرے پر تشدد اور طلبہ کے ہاتھوں اساتذہ کے پٹنے کی شرح بڑھتی جارہی ہے۔

اس عمل سے فوائد تو نجانے کیا حاصل ہوئے لیکن ٹیچرز خوف زدہ اور طلبا خودسر ہوگئے۔ تعلیمی نظم و ضبط کمزور پڑگیا اور تعلیمی استعداد تنزلی کا شکار ہوگئی۔

1950ء کی دہائی تک برطانیہ و امریکا کے اسکولوں میں جسمانی سزا برائے اصلاح موجود تھی۔ ایک مشہور مقولہ Spare the rod & spoil the child مغرب ہی کی پیش کش ہے۔ اُس زمانے میں بھی تعلیمی معیار تھا، ایجادات بھی ہورہی تھیں اور مغربی ممالک ترقی بھی کررہے تھے۔ ہم ابھی ترقی کی منازل سے فاصلے پر ہیں۔ معیشت بدحال ہے، تعلیم و تحقیق نہ ہونے کے برابر ہے لیکن معاشرت میں مغرب کی برابری کی کوششیں ہورہی ہیں۔ یاد رکھیے کہ ہر چیز جو صدیوں سے آپ کی ثقافت کا جز ہے، ضروری نہیں کہ غلط ہو۔ معاشرت تبدیل کرنے سے پہلے سو بار سوچیے کہ زیادہ تر صورتوں میں معاشرت کی تبدیلی ناقابل واپسی ہوتی ہے۔ بچوں کی اصلاحی سزا کے حوالے سے جان لیجیے کہ برطانیہ ٹیچرز ایسوی ایشن نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اصلاحی سزا کی اجازت دی جائے تاکہ ہماری اگلی نسل کو درست سمت میں تربیت دی جاسکے۔ تشدد کی تائید کوئی ذی عقل نہیں کرتا لیکن یاد رہے کہ سزا و جزا تربیتی عمل کا لازمی حصہ ہے۔ اور ہاں امریکا کی بھی سن لیجیے جہاں مار نہیں پیار کے نتیجے میں اسکولوں میں طلبہ کے بدمعاش گروہ پرورش پارہے ہیں۔ جن کی سرکوبی کے لیے مسلح محافظ تعینات کیے جاتے ہیں۔ امریکا کے اسکولوں میں طلبا کے ایک دوسرے پر تشدد اور طلبہ کے ہاتھوں اساتذہ کے پٹنے کی شرح بڑھتی جارہی ہے۔ سنجیدہ امریکی طبقہ اس جانب حکومت کی توجہ مبذول کرا رہا ہے تاکہ صورت حال کو قابو میں کیا جاسکے۔ جب کہ ہم اس جانب جارہے ہیں جہاں سے دوسروں کی واپسی ہورہی ہے۔ ہم اپنی ایک نہیں، کئی بھینسوں کو تیل پلا چکے ہیں۔

ابھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا، اپنی غلطیوں کی اصلاح کیجیے۔ اپنی سمت کو درست کیجیے، اندھی تقلید سے بچیے اور بھینس کا صحیح علاج کیجیے۔ اور ہاں! پڑوسی کی تقلید سے پہلے نتیجہ ضرور پوچھ لیجیے۔

○○○

اشعار میں دلچسپ عنوان سوچیے اور انعام پائیے

نئے قارئین کے لیے خصوصی پیشکش

ان تصاویر کو غور سے دیکھیے اور پھر سوچیے کون سا شعر یا مصرع اس حوالے سے موزوں رہے گا۔ اس صفحے کی فوٹو کاپی یا الگ صفحے پر اپنے نام، عمر، فون نمبر اور مکمل پتے کے ساتھ ہمیں اپنا جواب بھجوا دیجیے۔ بہترین اشعار پر دو تحائف آپ کے منتظر ہیں۔ تحفے میں چھ چھ ماہ کے لیے اُردو ڈائجسٹ کی اعزازی ترسیل صرف آپ کی خوشی کا باعث ہی نہیں ہوگی بلکہ آپ کی ذہانت اور ذوقِ مطالعہ کی تحسین بھی ہوگی۔ (ایڈیٹر: اُردو ڈائجسٹ)

ماہِ اکتوبر

نعمان رفیق لیکچرار بیالوجی پنجاب کالج کوٹلی روڈ F-1 میر پور آزاد کشمیر

(۱)

ذکر کے چیت کا گلاب شہاب
سوچ کا، سانچ کا شباب شہاب

(۲)

جلا سکتی ہے شمعِ کُشتہ کو موجِ نفس اِن کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دِل کے سینوں میں

اسباق الثلاثہ

اپنی پرانی پوستین بھول بیٹھنے والے ایک نوجوان کی کہانی کوئی اس کی بات سننے پر آمادہ نہ تھا

بانو قدسیہ

کسیلے گھاس کی دھونی اُس کے حلق میں تھی اور آنکھوں سے آنسو بے ساختہ بہ رہے تھے۔ اُلٹا لٹکے رہنے کے باعث غلام رسول کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ صرف قمیص پہنے ہوئے تھا، کمر سے نیچے اُس کے کوئی کپڑا نہ تھا۔

سرکار...... میں قصور وار ہوں...... میں مانتا ہوں لیکن ہیجڑا نہیں ہوں حضور۔"

"پھر وہی بات، مرغے کی وہی ایک ٹانگ...... لٹکاؤ اُلٹا اور طبیعت صاف کر دو......"

"ایک بار، صرف ایک بار سرکار...... آخری بار میری بات سن لیں......"

"لمبی بات کی ...... تو پھر دھونی دیں گے۔ جلدی جلدی بتاؤ اور اگر اپنی صفائی میں جھوٹ بولا یا غلط کلامی کی، تو یاد رکھنا ہم جن نکالنا جانتے ہیں......"

"ناں سرکار، یقین جانیں میں قصوروار ہوں۔ غلطی مجھ سے ہوئی ہے...... لیکن میرا ارادہ اتنی بڑی غلطی کا نہیں تھا جنابِ عالی...... اچانک...... جیسے فلم میں انسان امریکا پہنچ کر گاڑیوں میں پھرتا ہے...... میموں کے ساتھ شغل کرتا ہے...... ایسے ہوا...... میں خود اپنے اندر چھپے ہوئے شیطان سے واقف نہیں تھا سرکار۔ بیگم صاحبہ کے، سرکار مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ جب پچھلے سال میری بیوی بیمار ہوئی، تو پورے پانچ ہزار میرے ہاتھ میں پکڑا کر بیگم صاحبہ بولی...... یہ لو پانچ ہزار، اگر کچھ اور کی ضرورت پڑے، تو فون کر دینا...... اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے نمبر لکھ کر دیا۔ ہماری بیگم صاحبہ بہت اچھی ہیں سرکار، دل کی بڑی نرم ہیں...... میرے اندر خدا جانے کب کی ناشکر گزاری چلی آ رہی ہے!"

"ہوں...... تم حرام زادے ہو...... اول درجے کے......"

"نہیں سرکار، میں حرام زادہ نہیں ہوں۔ آپ میرے گاؤں چل کر پوچھ لیں، سب اس بات کی گواہی دیں گے کہ غلام رسول دل کا نرم اور ہاتھ کا سخی ہے......"

"کیا کسی انسان کے لیے دل کا نرم اور ہاتھ کا سخی ہونا کافی ہے، غلام رسول......؟"

غلام رسول سوچ میں پڑ گیا...... آج تک وہ اپنے آپ کو ایک اچھا انسان ہی سمجھتا آیا تھا۔ باورچی خانے کی چھوٹی موٹی چوری کے علاوہ اُس نے کوئی بڑی بد دیانتی بھی نہ کی تھی۔ مکھن، ملائی، کیک، بسکٹ نگاہ بچا کر کھا لینا...... وقت بے وقت چائے بنا کر پینا...... اپنے لیے پراٹھے تل کر کھانا...... پھل کی باسکٹ سجاتے وقت تھوڑا بہت منہ مار لینا...... لیکن دوسرے خانساموں کی طرح اُس نے کبھی بازار میں خرید و فروخت کے وقت کمیشن لی تھی نہ سودے میں سے پیسے بچائے تھے۔ جب کبھی وہ باورچی خانے سے نکلتا، خالی ہاتھ نکلتا۔

بیگم صاحبہ کے پاس آنے سے پہلے وہ تین کوٹھیوں میں خانساماں گیری کر چکا تھا اور ان تین خوشحال گھرانوں میں رہ کر اُس نے تین سبق سیکھے تھے۔

پروفیسر صاحب کے گھر علم و فضل کے دریا بہتے تھے۔ ہر وقت دانشور، اہلِ قلم، اخباروں کے نمایندے جرنلسٹ اور پڑھنے کو اوڑھنا بچھونا سمجھنے والے پڑھاکو طالب علم آتے رہتے۔ پروفیسر صاحب کی بیگم کمپلسری سبجیکٹ والی اس مہمان داری سے بہت جھجکتی تھیں لیکن ساتھ ساتھ یہ اُن کے گھر کا طرہ امتیاز بھی تھا کہ گھر کی چوکھٹ پر ناصیا فرسا قسم کے لوگوں کا جم گھٹا رہتا۔ پروفیسر صاحب کے علم و فضل کا دبدبہ دُور دُور پھیلا تھا۔ وہ کتابوں کے اس قدر رسیا تھے کہ رات گئے تک اُن کے بیڈ لیمپ کی روشنی جلتی رہتی اور جتنی بار غلام رسول اُٹھ کر باہر جاتا، وہ کھنکار کر اُن کی کھڑکی کے پاس سے گزرتا تاکہ اُنھیں پتا چل جائے کہ اپنا غلام رسول آ جا رہا ہے......

پروفیسر صاحب غلام رسول سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ وقت بے وقت چائے بنا کر اُن کی اور مہمانوں کی تواضع کرتا۔ بیگم صاحبہ بچوں میں مشغول

رہتیں اور رزق کم ہونے کی وجہ سے خِست اور احمق پن سے گزارہ کرنے کو سگھڑ پن شمار کرتیں۔ اُن کا بڑا بیٹا فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا اور نئے نئے پر پُرزے نکالنے کی وجہ سے غلام رسول کو کبھی کبھی تھپڑ، گالی سے بھی نواز دیتا...... لیکن غلام رسول نے ان چھوٹی چھوٹی فرسودہ باتوں کا کبھی بُرا نہیں منایا۔ وہ جانتا تھا کہ چاکری میں دل کشادہ رکھنا پڑتا ہے۔ اگر انسان عزت بے عزتی کے مسئلوں میں پڑ جائے، تو پھر نوکری چھوٹ جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب کی دونوں بیٹیاں چھوٹی تھیں غلام رسول نے اُنھیں نیم کے درخت پر جھولا ڈال دیا تھا۔ اُن کا سارا دن اُسی کے گرد کٹتا۔ غلام رسول کے ساتھ اُن کا کوئی سروکار نہ تھا۔

پروفیسر صاحبہ خود سارا دن باورچی خانے میں گھسی رہتیں۔ اُنھیں پکانے کی ترکیبیں بتانے کا بہت شوق تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ غلام رسول سے بہتر باورچی ہیں۔ اسی لیے ڈوئی چلانا، نمک مرچ چیک کرنا، بوٹی کی گلاوٹ دیکھنا، چپاتی کو توے پر اُلٹ دینا اور اس جیسے ان گنت کام کرتے رہنا جن سے وہ مشغول نظر آئیں، اُن کے دن بتانے کے طریقے تھے۔

سرکاری رہائش میں غلام رسول کو دوسرا سال تھا جب اچانک اُس میں ایک تبدیلی آ گئی...... ریڈیو باورچی خانے میں ہمہ وقت رواں رہتا تھا۔ جب سارا خاندان ٹیلی ویژن دیکھتا وہ بھی باورچی خانے سے فارغ ہو کر پائے دان کے پاس جا بیٹھتا۔ پانچویں پاس تھا، پروفیسر صاحب سے اخبار، رسالے لے جا کر کوارٹر میں پڑھتا...... جب بہت زیادہ انفارمیشن غلام رسول کے کمپیوٹر میں فیڈ کر دی گئی، تو اچانک اُسے زبان لگ گئی...... پہلے تو وہ موقع محل دیکھ کر بات کرتا تھا۔ پھر ہولے ہولے فیملی کی باتوں میں دو چار لطیفے اور حاضر جوابیاں موقع محل کی مناسبت سے ٹھونک کر اُسے اندرونی سرکل میں جگہ مل گئی۔ سب اُس کی باتوں سے ایسے محظوظ ہوتے جیسے بندر کا تماشا دیکھ رہے ہوں۔ اب جب کبھی پروفیسر صاحب سے اہلِ دانش، ادیب، جرنلسٹ ملنے آتے، تو غلام رسول چائے پلاتے وقت طرح مصرعہ ضرور پیش کر دیتا۔ پروفیسر صاحب اُردو کے ایک اخبار میں بڑا مقبول کالم بھی لکھتے تھے۔ اس اخبار کی سرکولیشن لاکھوں میں تھی اور اسی تناسب سے پروفیسر صاحب کے قاری بھی تھے۔ کالم والا اخبار رول کر، بغل میں داب، پروفیسر صاحب اپنی ایم اے معاشیات کی کلاس لینے جاتے تھے۔ اسی اخبار کے باعث جگہ جگہ کالم کی تعریف وصول کرنے میں اُنھیں سہولت بھی رہتی۔

غلام رسول کبوتروں کے ڈربے سے نکل کر اونچی اُڑانیں لینے لگا۔ تاڑ کا سا قد، متناسب جسم، کھلی کھلی آنکھیں، سپرمین سی تیزی...... غلام رسول بڑی بڑی زبانیں بولنے لگا تھا۔ جب گاؤں سے نیا نیا آیا تھا تو پروفیسر صاحبہ کو لگتا پیپل تلے کا بھتنا ہے، اب اس کی حیثیت پیرِ مغاں کی سی ہو گئی۔

اس روز پروفیسر صاحب کے گھر میں پریس کانفرنس تھی۔ چند ہفتے پہلے پروفیسر امجد نے کچھ ایسی باتیں اپنے کالم میں لکھی تھیں جن پر بڑے دھڑتے کی لے دے ہو رہی تھی۔ چند اخباروں کے نمایندے چھوٹے سے سرکاری بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ دو کیمرا مین اسٹل تصویریں کھینچ رہے تھے، جب غلام رسول چائے کی ٹرالی لے کر اندر داخل ہوا۔

پروفیسر امجد اپنی اہمیت اُتراتے ہوئے بلا خوف و خطر بازو، ہاتھ، گردن، آنکھیں سارے جسم کو بروئے کار لا کر اپنے نظریے بیان کر رہے تھے۔

''ہماری فلاح اسی میں ہے کہ ہم جمہوریت کو اپنائیں اور سچے دل سے اس کی پیروی کریں......''

ایک نمایندے نے ذرا سا آگے ہو کر پوچھا ''سر تیسری دنیا میں خواندگی کم ہے...... غریبی نے ہمارا بھرکس نکال دیا ہے...... طبقاتی معاشرہ ہے...... جوائنٹ فیملی سسٹم، برادری سسٹم میں سوسائٹی ہے...... کیا ایسی صورت میں بھی جمہوریت ہی کا ساتھ دینا ہوگا......؟''

''جمہوریت اور پھر جمہوریت اور پھر جمہوریت......'' پروفیسر غرآئے ''جمہوریت ہمارا واحد علاج ہے لیکن جہاں تعلیم عام نہ ہو...... وہاں ووٹ کون دے اور کیوں دے اور پھر ووٹ کی...... اَن پڑھ آدمی کے ووٹ کی...... حیثیت کیا ہو......؟''

پتا نہیں غلام رسول پر کیا گزری وہ چائے کی پیالی چھوڑ کر بڑے اعتماد سے آگے بڑھ کر بولا......

''سرکار...... جمہوریت نہیں چلے گی تیسری دنیا میں...... جب تک مساوات نہ ہو، جمہوریت کا بوٹا کیسے لگ سکتا ہے یہاں...... ہمیں تو ایک شیر شاہ سوری دلا دیں جو کلکتہ سے پشاور تک سڑک بنا دے...... ہمیں تو ایک وڈیرا ایسا دلا دیں جو مزارعوں کا لہو نہ پیے، ان سے انصاف کرے...... ہمیں جمہوریت نہیں چاہیے سرکار...... گائے، بھینس، بکریاں جمہوریت کا کیا بنا دیں گی سرکار...... ہمیں تو جدھر ہانک لے جائیں گے، چلے جائیں گے...... ہمیں تو ایک اچھا گڈریا لا دیں عالی جاہ! جس کے دل میں ہمارا غم ہو...... ہم جمہوریت کا ڈھونگ رچا کر کیا لیں گے...... جمہوریت کا سرکار تعلیم سے نہیں، مساوات سے تعلق ہے...... آپ سچ جانیں جہاں ووٹ ہی برابر نہ ہوں وہاں جمہوریت کیسی؟'' کیمرے مڑ کر غلام رسول کی تصویریں بنانے لگے۔ نمایندوں نے جلدی جلدی غلام رسول کی باتوں کے نوٹ لینا شروع کر دیے۔

پروفیسر امجد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غلام رسول کو لتاڑ کر باہر نکال دیا۔ رات کو جب باورچی خانے میں صاحب آئے، تو غلام رسول اپنا پہلا سبق سیکھ چکا تھا......

''میں بے انصاف نہیں ہوں ورنہ تیری تنخواہ روک لیتا...... یہ لو اپنے پیسے اور یاد رکھو زبان کھولنے سے پہلے اپنا درجہ، مقام ضرور پہچان لینا چاہیے...... اناڑی کی بندوق نہ بنو، آدمی بنو۔ اپنی حیثیت پہچانو...... پاؤ آدھ پاؤ میری بھی غلطی ہے، تم جیسے جوکر کی باتوں پر خوش ہوتا رہا...... اب سمجھ آئی کہ مور پنکھ لگا کر کوا مور نہیں بن جاتا۔ منہ کھولنے سے پہلے سوچو کس سے بات کر رہے ہو...... تم کون ہو اور وہ کون ہے...... گٹ آؤٹ ایٹ ونس!''

سرکاری بنگلے سے نکل کر غلام رسول کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُسے پروفیسر صاحب اور اُن کا گھرانہ اپنا اپنا لگنے لگا تھا۔ گھر سے نکالتے وقت کسی نے اُس سے یہ نہیں پوچھا کہ بھائی غلام رسول کیا تم بھی ہمیں چھوڑنا چاہتے ہو کہ نہیں......! ہاں اتنی بات اُس کی سمجھ میں ضرور آ گئی کہ برابر کی بات کرنے کے لیے بھی جمہوریت کی نہیں، مساوات کی ضرورت تھی اور ابھی...... مالک نوکر برابر نہیں تھے۔

یہ نوکری بلاوجہ چھوٹ گئی، اُس کی حماقت کی وجہ

ہے۔ چھ مہینے بڑی عسرت اور بے کاری میں گزرے۔ پھر اُڑ بھنبھیری ساون آیا...... غلام رسول ان دنوں ایک بہت بڑی کوٹھی میں مزدوری کر رہا تھا جب اچانک اُس کی ملاقات کوٹھی کے مالک سے ہو گئی، جو آرکیٹیکٹ کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا'' میں بڑی مشکل میں ہوں آج کل...... بیگم صاحبہ یورپ گئی ہوئی ہیں، خانساماں اچانک بھاگ گیا......''

اس وقت غلام رسول نے آگے بڑھ کر عرض کیا...... ''سر میں خانساماں ہوں۔ میرا باپ بھی کرنل ہاکنز کا خانساماں تھا۔ جب کرنل ہاکنز ریٹائر ہو کر لندن گیا سرکار تو میرا ابا بھی ساتھ گیا تھا۔ پر دل نہیں لگا، واپس آ گیا۔ سات کورس کا کھانا اکیلا پکا لیتا ابا جناب عالی! بغیر مسالچی کے۔''

ملک صاحب اُسے کار میں بٹھا کر اپنے ساتھ گلبرگ لے گئے۔

جن دنوں وہ دیہاڑی کرنے ڈیفنس والی کوٹھی پر جایا کرتا تھا، تو وہاں ملک صاحب کے متعلق ٹھیکے دار، مستری اور مزدور لوگ بڑی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ملک صاحب حال ہی میں اکیسویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے تھے۔ اُن کی دو کوٹھیاں گلبرگ میں تھیں اور یہ تیسری ڈیفنس میں بن رہی تھی۔ واسا میں ڈائریکٹر رہے تھے اور لمبا ہاتھ مارا تھا۔ رشوت اتنی دھڑلے سے لیتے تھے کہ سارے عملے کو خبر تھی لیکن کوئی منہ سے بات نہ نکالتا تھا۔ ملک سے باہر کئی بنکوں میں اکاؤنٹ تھے۔ فرانس میں دو شاندار ولا اور لندن میں ایک اپارٹمنٹ عموماً کرائے پر چڑھے رہتے۔ وہ کہا کرتے کہ تیسری دنیا میں صرف دولت کام آتی ہے، یہاں میرٹ راستہ کھولتی ہے نہ شرافت نجابت...... بس ہتھیلی گرم کرنے سے کھل جا سم سم کا سا اثر ہوتا ہے۔ جب غلام رسول نے اپنی تنخواہ سنی تو اُسے چکر سا آ گیا۔ سترھویں گریڈ میں پہنچ کر اُس نے دل میں سوچا کہ واقعی دیر آید درست آید...... بڑی تڑپراہٹ کے ساتھ بڑی تیزیوں کے ہمراہ اُس نے اپنی اہلیت دکھانا شروع کر دی۔ پہلے اُس کے کھانے سادہ اور سروس معمولی تھی۔ اب اُس نے چائنیز اور کونٹی نینٹل کھانوں کے علاوہ بیکنگ بھی سیکھ لی۔ فاسٹ فوڈ اور سجی بنانے کا بھی ماہر ہو گیا۔ گھر کے پچھواڑے تندور میں خمیری، فطیری روٹیاں لگاتا۔ اُس کے نان، کلچے، سندھی پراٹھے دُور دُور مشہوری پا گئے...... اس قدر اعلیٰ خانساماں، تس پرا سارا گھرانہ اُس کی خاموشی کی تعریف ہر ملنے ملانے والے سے کرتا...... آپس میں سارا خاندان اُسے Jewel پکارتا۔ اس بھج کاگ کی مثال دوسرے ملازموں کو دے کر ڈرایا جاتا، اُن کی کارکردگی کو ڈاؤن گریڈ کیا جاتا۔ غلام رسول یا تو فوج کا بیٹ مین لگتا یا پھر کسی انگریز کا ملازم...... وقت کی پابندی، کام کا سلیقہ، صفائی ستھرائی...... بہت سی خوبیاں غلام رسول میں تعریف ہی سے پیدا ہو گئیں۔

لیکن اس قدر سمپورن خانساماں میں بھی ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ جس طرح کبھی کبھی ثابت سموچا خوش رنگ سیب اندر سے خراب نکلتا ہے ایسے ہی بیگم صاحبہ پر غلام رسول ایک بھٹ بھیڑیا ثابت ہوا...... رات کھانے سے فارغ ہو کر کوارٹر میں ڈیزرٹ کولر لگا کر غلام رسول نماز پڑھ رہا تھا۔ رات کے ڈنر پر دس بارہ مہمان بھی تھے جنھوں نے خانساماں کے پکیرے کی بہت تعریف کی تھی۔ ایک صاحب تو چند تندوری پراٹھے

پیک کروا کے ساتھ لے گئے تھے...... اس وقت بیرا جمیل داخل ہوا اور بڑی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا...... ''نماز پڑھ کر اندر چلے جانا، بیگم صاحبہ نے فوری طلب کیا ہے......''

جس چکر ملے انداز میں بیرے نے بات کی اور جس ترنت طریقے سے وہ پلٹا، غلام رسول کو تھوڑی سی سندک تو لگ ہی گئی لیکن وہ سمجھ نہ سکا کہ اُس نے کہاں ٹھوکر کھائی، کون سی حرکت سے بیگم صاحبہ کے خط ضامنی کو پار کیا۔ نماز پڑھ کے اس نے عافیت کی دُعا مانگی کیونکہ اتنی اچھی نوکری پا کر وہ بھی بزدل ہو چکا تھا...... آسائش نے اُسے بھی بودا کرنے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ باورچی خانے میں جوتی اُتار کر وہ قالینوں پر چلتا، دروازے آہستہ آہستہ بند کرتا، گھٹنے سے گھٹنا ٹکراتا، بیگم صاحبہ کے پرائیویٹ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

بیگم صاحبہ بھاری کندھے اور کولہے والی خاتون تھیں۔ اُن کا چہرہ اُزبکی، ہاتھ پاؤں فرانسیسی اور آواز پنجابی تھی۔

''اسلام علیکم سر......''

بیگم صاحبہ کچھ پڑھنے میں مشغول تھیں، اُن کے ہاتھ میں گھروں کی سجاوٹ بڑھانے والا ایک ضخیم رسالہ تھا۔ معمول کے مطابق وہ سلام کرنے کے بعد خاموش ہوگیا۔ چند منٹ بیگم صاحبہ نے بڑے جانچ پڑتال کی خاموشی اختیار کی پھر اہتمام سے رسالہ بند کیا، دونوں ہاتھ گود میں رکھے اور محاسبے کی آواز میں بولیں...... ''مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی غلام رسول......''

خانساماں نے منمنا کر ''جی سر'' کہا...... وہ ابھی تک سمجھ نہ پایا تھا کہ مواخذہ کیوں، کیسے اور کس لیے کیا جا رہا ہے......!

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ تم اتنے میسنے اور کمینے ہو......''

باز پُرس کی اصلی وجہ ابھی تک غلام رسول پر نہ کھلی تھی۔

''تم سمجھتے تھے اُلو کہ مجھے خبر ہی نہ ہوگی...... حرام زادے تم چوری چوری بالائی آمدنی بناؤ گے اور مجھ تک بات ہی نہ پہنچے گی۔ چور آدمی تم سو مرتبہ رازداری سے پیسے بناؤ، مالک کو لوٹے جاؤ...... تمھارا کیا خیال ہے کبھی بھید نہیں کھلتا......''

وہ پھر ''یس سر'' کہہ کر خاموش رہ گیا۔

''کل میں پھل والے کے پاس گئی تو...... مجھے پتا چلا کہ انگور تو ساٹھ روپے کلو ہیں، تم نے مجھے سو روپیہ کلو لکھوائے......''

''جی سر غلطی ہوگئی......''

''اب تو ڈرائیور، بیرا، صفائی والی مریم سارے لوگ گواہی دیتے ہیں کہ تم نے ہر دُکان پر کمیشن مقرر کر رکھی ہے...... ہم نے تم کو اتنی بڑی تنخواہ پر رکھا...... ایسا کوارٹر دیا جس میں ہیٹر، ڈیزرٹ کولر اور پنکھا لگا ہے...... استری مفت، گرم ٹھنڈے پانی کی سہولت موجود...... میڈیکل فری...... اور تم نے ہم ہی کو لوٹنا شروع کردیا......''

غلام رسول کو اپنی نوکری کی آخری گھڑیاں نظر آگئیں......

نظریں جھکا کر وہ شائستگی سے بولا...... ''سر غلطی ہوگئی، معاف کردیجیے۔ آیندہ یہ غلطی نہیں ہوگی۔''

''پاکستان کے عوام ہی سارے چور ہیں، اسی لیے

اوپر کوئی درست آدمی نہیں آتا۔ حکومت کیسے چلے جب بے ایمانی کا یہ عالم ہو...... ہر چیز مل رہی ہے اور پھر بھی بے ایمانی سے باز نہیں آتے۔ اوپر کی آمدنی کا ایسا چسکا پڑا ہے...... ایسا چسکا پڑا ہے کہ منہ سے چھوٹتی نہیں...... میں تمھیں پولیس کے حوالے کردوں گی...... سوچتے کیا ہو!''

اس کے بعد بیگم صاحبہ نے اپنی شائستگی، تعلیم اور کلچر چھوڑ کر بے تکان گالیوں کی بوچھاڑ کردی۔

غلام رسول کو جب یقین ہوگیا کہ نوکری رہتی نظر نہیں آتی، تو اُس نے اس پوچھ پچھار سے حوصلہ پاکر کہا...... ''بیگم صاحبہ...... ہم غریبوں کی کیا چوری...... لوگ تو بینک خالی کرگئے، پاکستان کی معیشت تباہ کردی...... پہلے اُن کا محاسبہ ہونا چاہیے...... ہم غریب کیا چوری کریں گے بیگم صاحبہ...... پہلے اوپر والوں کی خبر لیں...... بڑا مال تو اُنھوں نے ہی لوٹا ہے...... اُنھوں نے ہی غریب آدمی کو چوری کرنے کا حوصلہ دیا ہے...... ہم تو اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں سر جی۔''

بیگم صاحبہ تو طیش میں بھتنی بن گئیں۔ جھپاک سے اُٹھ کر پورے ہاتھ کا وہ تھپڑ رسید کیا کہ غلام رسول اپنے جننے والی کو یاد کرنے لگا......

''تمھاری یہ جرأت اتنی ہمت......'' پھر گالیوں کی بوچھاڑ......

''احمق! جیسے لوگ ہوتے ہیں، ویسے حاکم اُن پر مقرر کردیے جاتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو صرف اوپر والوں کا قصور تھا۔ سارا قصور تم غریبوں کا ہے...... یاد رکھو...... چوری چوری ہوتی ہے، لاکھ کی چوری اور روپے کی چوری ایک ہی بات ہے۔ خبردار جو اپنی معذرت میں زبان کھولی...... تم لوگوں نے ہرے پاسپورٹ کی قدر کھوئی...... تم جیسے بے قاعدہ لوگوں نے ہمارے ملک میں بیرونی ممالک کا سرمایہ آنے نہیں دیا...... تم جیسے بدبختوں نے ملک کو قرضوں کے بوجھ تلے نڈھال کردیا۔ تمھاری غریبی مٹانے کے لیے حکومت کو دشمنوں کے ساتھ تجارت کرنی پڑتی ہے۔ تم جیسے عوام جس ملک کے ہوں، اُس ملک کی قسمت کیسے جاگ سکتی ہے...... جس ملک کے عوام چور، بے ایمان، فریبی ہوں اُس ملک کا کیا بن سکتا ہے......اوپر کے لوگوں کو کیا دوش دے رہے ہو؟ سارا قصور عوام کا ہے...... بے دین، بداخلاق، دُکھ دینے والے، نٹنے باز...... اس لیے نعرے لگائے تھے قیامِ پاکستان کے وقت؟ لوٹنے کے لیے مانگا تھا پاکستان...... دُور ہو جاؤ میری نظروں سے...... میں تم جیسے ملک دشمن کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ منشی جی کے ساتھ حساب کرلینا...... صبح نظر نہ آؤ مجھے...... گٹ آؤٹ ایٹ ونس......''

غلام رسول اس احتساب کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ ملک صاحب کی کوٹھی میں کسی سمراٹ کی سی زندگی بسر کررہا تھا۔ سارے نوکروں کا حاکم، اندر باہر کی چابیوں کا رکھوالا، ہر فون سننے پر قادر، صاحب اُس کا متوالا، بیگم اُس کی پکی ووٹ...... یہ تو اچانک بے موسم کے اولے گرے۔ دنگ رہ گیا۔ صاحب سے معافیاں مانگیں۔ بیگم صاحب سے بار بار کہا کہ جو چور کی سزا وہی میری، ایک چانس اور دیں۔ بیگم صاحبہ کی ڈکشنری میں کوئی آیندہ درج نہ تھا۔ خلاصی پیشہ غلام رسول سے دبتے تھے، اب اُنھوں نے بڑے بن کر تسلیاں دینا شروع کیں۔ دل میں

خوش، اوپر سے مسمسے چہرے بنا کر وفد کی صورت بیگم صاحبہ کے آگے پیش ہوئے۔ معافی مانگی...... جب بیگم صاحبہ نے سب کو نکال دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو منہ لٹکائے باہر سرونٹس کوارٹر میں آرہے اور غلام رسول کو یہی مشورہ دیا کہ چپکے سے راستہ ناپنے ہی میں عافیت ہے۔

غلام رسول کوٹھی سے اس طرح نکلا جیسے کوئی راجا بن باس قبول کرے اور جنگل سدھارے...... لیکن اس بار غلام رسول قسمت کا دھنی نکلا۔ جس بیکری سے غلام رسول سودے خریدتا تھا اور سامان پر دس فی صدی کٹوتی وصول کرتا تھا، اپنا چھوٹا سا صندوق اور گٹھڑی لے کر وہاں پہنچا۔ اس بار اُس کا اِرادہ گاؤں لوٹ جانے کا تھا۔ وہ کیک پیسٹری کے سیکشن میں اپنے گاؤں کا ایڈریس لکھوا رہا تھا۔ اِسٹور والا کافی مصروف تھا۔ اپنی ڈائری میں نام پتا لکھنے کے لیے اُس کے پاس وقت نہ تھا لیکن غلام رسول نے اُس سے ہزاروں روپے کی خریداری کی تھی۔ اُس نے غلام رسول کا پتا چار فون اور کئی سودے بیچنے کے درمیان مکمل کرلیا...... اس وقت مسز مہتاب شوخ وشنگ لباس میں داخل ہوئیں۔

دانش صاحب بڑے پشڈ بینکر تھے۔ حکومت کے فنانس منسٹر اُن کے ذاتی دوست تھے۔ وہ آئی ایم ایف کی میٹنگوں میں پاکستان کی معیشت سے متعلق پالیسیوں کا دفاع کرتے۔ بنیادی طور پر وہ وکیل تھے۔ بینک نے پہلے اُن کو اوپریشن میں رکھا، پھر فارن ایکسچینج میں مانجھا اور اس کے بعد Litigation کے ڈیپارٹمنٹ میں اُن کی کلا جاگی...... چڑھتے چڑھتے وہ وائس پریذیڈنٹ ہوگئے۔ اب شہر کے تمام قابل ذکر وی آئی پی اُن کے ذاتی دوست تھے۔ اُن کا سوشل حلقہ بڑے قابل ذکر صنعت کاروں، سیاسی لیڈروں اور دانشوروں کا گلدستہ تھا۔

جس وقت مسز مہتاب شام کی چائے کے لیے پیسٹری کیک منتخب کر رہی تھیں، غلام رسول شیشے کا دروازہ پش کر کے باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔

''بھئی تم نے مجھے خانساماں تلاش کر کے نہ دیا...... بڑی تکلیف ہے ہمیں...... تمھیں پرواہی نہیں۔''

غلام رسول کی قسمت نے آواز دے کر دربدری سے بچایا۔ چھوٹی ٹرنکی اور گٹھڑی ڈکی میں ڈال وہ بیگم مہتاب دانش کی کوٹھی پر راج ہنس کی طرح پہنچا۔ پہلی ہی پارٹی میں غلام رسول کی واہ واٹیسو کے پھول کا رنگ لائی۔ ایسا سلیقہ، سگھڑ پن دکھایا کہ بیگم مہتاب نے رات کے وقت دانش صاحب سے کہا'' پتا نہیں آج تک ہمیں ایسا آدمی کیوں نہ ملا! یہ تو گویا کسی نیک کام کا اجر ہے۔ سارے رونے دُھل گئے۔'' دوسرے دن دبے پاؤں غلام رسول کھانے کے کمرے کے دروازے میں دست بستہ آ کھڑا ہوا۔ ''سر میں اندر آسکتا ہوں۔''

بیگم صاحبہ نے نظر تحسین سے دانش کی طرف دیکھا، گویا وہ اُس کے آداب کی تعریف کررہی ہوں۔

''آجاؤ...... بھئی''

غلام رسول نے قریب آ کر سارا حساب اور بقیہ ریزگاری بیگم صاحبہ کے پاس تپائی پر رکھ دی۔

''سر یہ چیک کرلیں......''

بیگم مہتاب دانش نے حساب دیکھا، جمع جوڑا، ریزگاری گنی اور پرس میں ڈال لی۔

''یہ حساب تم نے خود لکھا ہے......؟''

غلام رسول نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پڑھے لکھے ہو......؟''

''جی سر، پانچویں جماعت تک......''

اُس نے پروفیسر صاحب کے گھر اَن گنت رسالے، کتابیں، اخباریں پڑھی تھیں۔ پھر مذاکرے، مباحثے بھی کانوں سے گزرے تھے۔ وہ ڈگریوں سے تو نا آشنا تھا لیکن انفارمیشن کی حد تک اُس کا کمپیوٹر سافٹ ویئر سے بھرا پڑا تھا۔

''اچھا بھئی غلام رسول اب تم کو ذرا میری مدد کرنا ہوگی۔ جب تک سیکرٹری روما نہیں آتیں، آپ کو سارے فون بھی اٹینڈ کرنے پڑیں گے۔ میں ذرا اڈے والوں کے پاس جارہی ہوں، تم نیچے آفس میں بھی جھانکتے رہنا...... آج صاحب اور میرا لنچ باہر ہے...... باہر ملازموں کے لیے بڑے گوشت کے دو پیکٹ نکال کر اُس میں کچھ ڈال لو...... ہم رات کو سوپ اور کچھ لائٹ فوڈ لیں گے......''

''جی بہتر......''

دانش صاحب کی کوٹھی چھ کینال میں پھیلی تھی۔ نچلے پورشن میں بیگم صاحب کا آفس، ڈرائنگ روم اور فارمل مہمانوں کے رہنے کے لیے ایک سویٹ آف رومز تھا۔ آفس کا بڑا کمرا سامنے تھا جس میں بیگم مہتاب دانش ڈیزائنر کپڑے کمپوز کرتی تھیں۔ آفس سے ملحق کمروں میں درزی خانہ تھا۔ چار درزی اور ایک کٹر کھچاکھچ قینچیں چلاتے تھے۔ ان کی چائے کا انتظام بھی نچلے پورشن ہی میں ایک چھوٹے سے کچن میں ہوتا، صرف سپرویژن غلام رسول کرتا تھا۔

ایک روز غلام رسول دست بستہ بیگم مہتاب کے سامنے پیش ہوا۔

''سر وہ درزی خانے کے کچن کا دودھ بھی ختم ہے اور چائے کی پتی بھی۔ اس کے لیے کیا حکم ہے؟''

''تم خرید کر لا دو غلام رسول...... اور دوسری بات یہ درزی خانہ نہیں ہے، یہ مہتاب بوتیک ہے...... تمھیں معلوم ہے شہر میں میری بوتیک کے کتنے شوروم ہیں؟''

غلام رسول نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''دو شوروم تو گلبرگ میں ہیں۔ ایک Casual wear بکتا ہے اور دوسرے Pace والے میں فارمل کپڑے ہیں۔ ایک ڈیفنس پر شاپ ہے۔ ایک لنک روڈ کی سپر مارکیٹ میں...... ایک ماڈل ٹاؤن میں...... ابھی اس کی ایک برانچ اسلام آباد میں بھی کھلی ہے۔ سوائے جب ہم لوگوں کو Entertain کریں۔ باورچی خانے کا کام زیادہ نہیں...... ہاں مہمانوں کی ٹرولی...... قہوہ، چائے، کافی...... یہ سب چٹکی بجنے پر حاضر کرنا ہوگا۔ میں اور صاحب تو زیادہ تر باہر ہی کھانا کھاتے ہیں۔''

بیگم صاحبہ مولے کی طرح تھیں۔ اُن کا جسم ہرنی کا دماغ پارہ، حرکات مشینی تھیں۔ گھر پر ہوتیں تو ٹریک سوٹ قسم کا لباس پہنتیں۔ اگر باہر سے آکر لباس تبدیل کرنے کا وقت نہ ملتا تو پیٹی کوٹ اور بغیر آستینوں کا بلاؤز پہن کر بھنبھیری کی طرح سارے گھر میں گھومتی پھرتیں۔ ڈریس ڈیزائنر اُن کے پاس اوپر والے پورشن ہی میں آجاتا اور بیگم صاحبہ پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں ملبوس اُس کے پاس بیٹھ کر نئے لباس ڈیزائن کرتیں، رنگ میچ کرتیں۔ اس کے علاوہ فوٹو گرافر کا اوپر آنا جانا رہتا، رسالے والوں کے نمایندہ لوگ بھی بلا روک ٹوک آتے جاتے۔ اس کام کو بیگم صاحبہ جس بڑے پیمانے پر کررہی تھیں، اُس میں دو

باتیں واضح تھیں۔ ایک تو اُن کے پاس وقت کی کمی تھی...... دوسرے وہ بلاوجہ جھجک، حیا اور فضول بناوٹی قسم کی شرم کو پسند نہ کرتی تھیں۔ ہر سال وہ اپنے کپڑوں کی نمائش کے لیے یا تو امریکا جاتیں یا یورپ۔ اس نمائش کی تیاری میں اُنھیں مہینے درکار ہوتے...... اپنے کپڑوں کے اشتہاروں کے لیے اُنھیں ماڈل گرلز اور لڑکے بھی درکار ہوتے جو گھر پر آکر اُن کے لباس پہن کر تصویریں کھنچواتے۔ کئی ماڈل گرلز جنھوں نے شروع میں اُن کے لباسوں کے لیے اشتہاروں میں کام کیا تھا، اب ٹی وی اور فلم کی قابل ذکر فنکار بن چکی تھیں۔

میڈیا اور لباس کی دُنیا غلام رسول کے لیے نیویارک سٹی کا سا گھراؤ تھی۔ اُس نے کبھی عورتوں کو کھلے بندوں سگریٹ پیتے، فحش لطیفوں پر ہنستے، بال لہراتے، کندھے اُچکاتے، اپنے جسم کو نمائش کے لیے پیش کرتے نہ دیکھا تھا۔

غلام رسول کو یہ سب کچھ دل سے پسند آیا......

غلام رسول کو پتا چلا کہ دراصل وہ اسی ماحول کا اصلی تیراک تھا۔ وہ یہاں رہ کر اس قدر خوش تھا کہ اس سے پہلے ایسی خوشی کا کوئی خواب بھی اُس کے ذہن میں نہ آیا تھا۔ نیچے درزی خانے میں جاتا تو فیشن کے رسالے، گرم کڑک چائے اور شاندار گاہک خواتین سے ملاقات ہوتی۔ کچھ اُپر کلاس کی بیگمات اپنی بیٹیوں کے پورے پورے جہیز مہتاب بوتیک سے بنوا رہی تھیں۔ وہ دفتر سے کھسکتی درزی خانے میں گھس آتیں۔ دو تین اڈے والے گیراج میں سلمیٰ، بادلا، ستاروں کا کام کرتے تھے اور کشیدہ کاری کے ماہر تھے۔ ان سے اندرون شہر کی گوسپ بھی غلام رسول کو سننے میں آتی۔ شہر کی گلیوں میں اپنے رنگ کی رنگینی، قتل و غارت، اغوا کے قصے تھے۔ اوپر جاتا تو وقت ٹیلی ویژن ہمہ وقت آن رہتا۔ بیگم صاحبہ کو سارا دن ٹیلی ویژن دیکھنے کا وقت نہ ملتا۔ اس پر ڈش کے میوزک پروگرام جاری رہتے۔ دُھنی ڈانس اور جنسی ہیجان ابھارنے والے گیت اور ناچ دیکھ دیکھ کر غلام رسول کا دل نہ بھرتا تھا۔ جونہی بیگم صاحبہ کی اسپورٹس مرسیڈیز گیٹ سے باہر جاتی، غلام رسول گیت اور ناچ کی اس بے مہار دنیا میں گم ہوجاتا۔ ان نوجوان گانے والوں کو موسیقی ریاض سے نہ ملتی تھی۔ بس جو گیت تھا، تازہ پکے پھل کے مانند تھا...... تھوڑا ترش، تھوڑا میٹھا، تھوڑا قدرتی کڑواہٹ لیے ہوئے...... اس موسیقی میں ایک خرابی بدرجہ اتم تھی کہ اسے سنتے ہی آدمی اس کے ردھم میں گم ہوجاتا اور نچلے دھڑ میں ناچنے کی اُمنگ پیدا ہو جاتی۔ دیکھتے دیکھتے غلام رسول ناچنے کا ماہر ہوگیا۔ وہ بیگم صاحبہ کی عدم موجودگی میں پھڑک پھڑک کر ناچتا۔ ذرا سی پریکٹس سے گلا بھی سر میں ہوگیا۔ پروفیسر صاحب کے گھر میں اُسے باورچی خانے میں بھی محنت کرنا پڑتی تھی اور پڑھنے میں بھی کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ یہاں ٹیلی ویژن سے تعلیم حاصل کرنے میں علم کا کوئی دخل نہ تھا۔ غلام رسول کے بالوں کا اسٹائل بھی بدل گیا۔ نیچے ٹیلر ماسٹر سے کف بند قمیص اور خوبصورت جیکٹس سلوا لیں۔ اب وہ آسانی سے دانش صاحب کے گھر کا غریب رشتہ دار لگنے لگا۔

اب جبکہ غلام رسول کا حلیہ بیگم صاحبہ کی بوتیک کے عین مطابق ہوگیا، ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ اُس روز نچلے آفس میں جرمنی کے ایک اخبار کا نمایندہ کچھ

تصویریں بنانے کے لیے آیا بیٹھا تھا۔ تینوں ماڈل گرلز آ پہنچی تھیں۔ بیگم صاحبہ تھوڑا سا نروس ہو رہی تھیں کیونکہ ماڈل زبیر نہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔ اُس کے گھر فون کیے۔ جس ایڈورٹائزنگ کمپنی میں وہ ملازم تھا، وہاں بھی کئی فون کھڑکائے۔ تینوں ماڈل گرلز تیار بیٹھی تھیں۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں وہ جرمن فوٹوگرافر سے کافی فلرٹ کر چکی تھیں اور اب اُن کی انگریزی ختم ہوگئی تھی۔ آخری بار جرمن نے اپنی کلائی والی گھڑی سے سوئیٹر کا کف ذرا اونچا کر کے بیگم مہتاب دانش سے کہا ”آئی ایم ایفریڈ...... اب اگر آپ کا ماڈل نہیں آتا، تو میں تصویریں نہیں بنا سکتا۔ مجھے ایئر پورٹ پہنچنا ہے......“

بیگم صاحبہ آئیڈیاز کی عورت تھی۔ وہ بھاگی بھاگی اوپر والی منزل میں پہنچی اور پانچ منٹ میں غلام رسول کو مغلیہ عہد کا خوبصورت لباس پہنوا کر نیچے لے آئیں۔ جب سلیم شاہی جوتی، خوبصورت تاج نما ٹوپی اور لمبے مخملی ثوب میں غلام رسول گلاب کا پھول سونگھتا ہوا سیڑھیاں اُترا تو تینوں ماڈل لڑکیوں نے سیٹی بجائی اور جرمن فوٹوگرافر نے لمبا سا ”واؤ“ کہہ کر کیمرے کا زاویہ بنانا شروع کردیا۔

”یہ مغلیہ شہزادہ ہے......؟“ جرمن فوٹوگرافر نے سوال کیا۔

”ہم نے اسے شہزادہ سلیم بنا کر پیش کرنا ہے......“ اس کے بعد بیگم صاحبہ نے فر فر انارکلی، نور جہاں اور حرم کی زندگی پر بے جوڑ اور تخیلاتی کہانیاں سنانا شروع کردیں۔

فوٹوگرافر نے اوپر تلے اتنی تصویریں لیں کہ شٹر بند ہونے اور کھلنے میں وقفہ ہی مشکل سنائی پڑتا تھا۔

جرمن جب کام سے فارغ ہوگیا، تو اُس نے چھوٹی سی ڈائری میں ماڈل گرلز کے نام پتے اور جسم کے تین بنیادی ناپ لکھے۔ اس کے بعد وہ غلام رسول کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں غلام رسول کا نام پوچھا۔ تو بیگم صاحبہ نے فوراً خود انفارمیشن دینا شروع کردی۔

”یہ پرنس ہے...... اس کا اصلی نام تو غلام رسول ہے لیکن فیملی میں سب اسے پرنس کہتے ہیں۔ تم بتاؤ یہ پرنس سلیم لگتا ہے ناں......“ جرمن نمایندہ لڑکیوں سے بھی زیادہ غلام رسول کا معتقد ہوگیا اور جرمنی میں اپنے گھر کا ایڈریس اُسے دیا۔

تینوں ماڈل لڑکیوں نے فلمی انداز میں ایک بار پھر سیٹیاں بجائیں، اُونچے اُونچے ”واؤ“ کہا اور ہنسنے لگیں...... یوں لگ رہا تھا گویا یہ کوئی ڈش کا پروگرام ہو رہا ہے......

جھوٹ سچ ملا جلا کر جرمن نمایندے کو ایئر پورٹ چھوڑنے خود بیگم صاحبہ اپنی سپورٹس مرسیڈیز میں گئیں۔ سارا راستہ وہ غلام رسول کو پرنس کہہ کر ہی مخاطب کرتی رہیں۔ جب ان ماڈل گرلز کو ڈراپ کر کے غلام رسول گھر واپس آیا، تو اُس کا دل اور دماغ دونوں ساتویں آسمان پر تھے۔ وہ دیر تک ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑا رہا اور مختلف پوز بنا کر گلاب کا پھول سونگھتا رہا۔

اس دن کے بعد غلام رسول کا نام پرنس پڑ گیا۔ رات کو بیگم صاحبہ نے ہنس ہنس کر دانش کو صبح کے واقعات سنائے اور بار بار غلام رسول کو پرنس کہہ کر پکارا...... اب جب بھی وہ اُس سے کافی، ڈرائی فروٹ، قہوہ مانگتیں، پرنس کہہ کر ہی آرڈر کرتیں۔ مسز

مہتاب دانش کا اکلوتا بیٹا حسن ابدال میں تعلیم پا رہا تھا، فون پر اُسے بھی بتایا گیا کہ غلام رسول کو اب سب پرنس سلیم کہتے ہیں۔ اور سارے ملنے والوں کو جرمن فوٹو گرافر کی تفاصیل کے ساتھ ساتھ اُس واقعے کا حوالہ بھی دیا جاتا جس میں غلام رسول نے مغلی شیروانی کے اشتہار کے لیے ایک جرمن اخبار کے لیے تصویریں کھنچوائی تھیں۔

ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ غلام رسول ایک اور شبخون کا شکار ہوا۔ بیگم صاحبہ ایک کزن کی ڈھولک پر گئی ہوئی تھیں۔ دانش صاحب کسی میٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد میں تھے۔ فریج میں سے اپنی پسند کے کھانے نکال کر غلام رسول نے مائیکروواوون میں گرم کیے۔ پیٹ بھر کر روسٹ، قورمہ، کوفتے سندھی پراٹھوں کے ساتھ کھائے اور فارغ ہو کر ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تو اُس نے مغربی پاپ موسیقی سنی لیکن اُسے کالے امریکن ناچتے گاتے پسند نہ آئے۔ وہ یہ جان نہ سکتا تھا کہ سفید امریکی نے کمال عقل مندی سے نیگرو امریکی کو اپنی سنجیدہ زندگی کے طاقت ور بہاؤ میں شمولیت سے روک دیا تھا۔ کالے امریکن کھیلوں اور موسیقی میں خلق کو تفریح مہیا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور سفید امریکی موسیقی اور کھیلوں میں اس کی شمولیت کو اتنا زیادہ پروجیکٹ کرتا تھا کہ کالے امریکی اتنی شہرت پا کر علم، سائنس اور ملکی ترقی میں اپنے پیچھے رہ جانے پر کچھ اتنے افسردہ بھی نہ تھے...... ڈش کے سٹیشن ہلا جلا کر وہ ایسے ناچ گانے تک پہنچ گیا جس میں لڑکیاں لڑکے تو مشرقی تھے لیکن موسیقی برِ صغیر پاک و ہند کی نہ تھی...... لباس مغربی اور ناچ گانے جنسی ہیجان ابھارنے والے تھے۔

اُس موسیقی میں کچھ ایسی لے، تھرک، اور دف تھی کہ غلام رسول پہلے تو صوفے پر بیٹھا تھرکنے لگا، پھر اُس نے اُٹھ کر ناچنے والوں کے ساتھ قدم ملائے اور اپنے جسم کو آزاد کر کے جنسی ہیجان میں تڑپنے پھڑکنے لگا...

اُسے علم نہ ہو سکا کہ کب اور کس دروازے سے مہتاب دانش اندر داخل ہوئی۔ گو ریپ موسیقی کے الفاظ ہندوستانی تھے لیکن حرکات مغربی تھیں جن میں کاؤبوائز، میکسیکو کے غصے اور جنسی انگیخت نے چار چاند لگا دیے تھے۔ گانا ختم ہونے پر جب اُس نے اکیلے ہی تالی بجائی تو ساتھ ہی بیگم صاحبہ نے اپنی تالیاں بھی شامل کر دیں۔

''سوری بیگم صاحبہ......'' وہ یکدم آسمان سے زمین پر آگیا۔

''نہیں نہیں...... تم بہت اچھا ناچ رہے تھے غلام رسول...... میں تمھارا شو دوبارہ دیکھتی لیکن میری طبیعت بہت خراب ہے۔ مجھے کپکپی لگ رہی ہے۔ ایک قدم اور میں اُٹھا نہیں سکتی۔'' بیگم صاحبہ کھڑی کھڑی لڑکھڑا گئیں۔

پرنس نے بھاگ کر اُنھیں سہارا دیا۔ بیگم صاحبہ نے آرگنزا کی آر پار نظر آنے والی پشوار پہن رکھی تھی، جس کے نیچے سلک کی سلپ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس قدر سردی کے باوجود اُن کے تن پر کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔

''ہائے میں مرجاؤں گی پرنس...... صاحب کو فون کرو۔ ڈاکٹر کو بلاؤ...... جلدی جلدی غلام رسول، میں مرنے والی ہوں۔''

ایک بار پھر وہ غلام رسول کے بازوؤں میں لڑھک گئیں اور ان کے دانت کٹکٹانے لگے۔ غالباً ڈھولک والے گھر میں اُنھیں سردی لگ گئی تھی...... اور دیر تک ناچتے رہنے کی وجہ سے اُن کا سٹیمنا بھی ختم ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ لڑکیوں کی طرح نازک اور دھان پان تھیں۔

بڑے مودب انداز میں وہ بیگم صاحبہ کو اُٹھا کر ماسٹر بیڈ روم میں لے گیا۔ اُنھیں ماسٹر بیڈ پر لٹایا۔ پیروں کے کھسے اتارے۔ ہیٹر جلایا، کمبل اُوڑھایا۔ بیگم صاحبہ بے ہوش سی تھیں یا کسی اور دنیا میں تھیں، اُنھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں غلام رسول کا ہاتھ لے کر کہا...... '' ذرا میرے پرس میں سے ڈائری نکالو اور ڈاکٹر عباس کو فون کرو...... وہ فوراً آجائیں......'' ڈاکٹر عباس کو فون کرنے کے بعد اُس نے اسلام آباد ہوٹل میں دانش صاحب کو فون کیا۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ حسن ابدال فون نہ ہو سکا......

اب مہتاب دانش پر رونے کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ اونچے سسکنے، آہیں بھرنے اور ہچکیاں لے لے کر کہنے لگی...... ''سب کو اپنی پڑی ہے...... کسی کو میری فکر نہیں...... دانش کو اپنی میٹنگوں کی زیادہ فکر ہے۔ اس الو کے پٹھے، حرام زادے صغیر کو کتنی مشکل سے پالا...... اسے کیا ماما مرجائے یا زندہ بچے...... موج لوٹو...... مزے کرو...... میں کام کر کر کے مر گئی، کھپ گئی...... کسی نے لیا...... اللہ کرے دانش مرجائے...... کبھی وقت پر کام نہیں آیا الو۔''

رونے دھونے، واویلا مچانے کے دوران کبھی کبھی وہ بلبلا کر کہتی...... ''اور مجھے پتا ہے ذرا میری آنکھ لگی، تم نے کوارٹر میں بھاگ جانا ہے۔ تمھارے جیسے لٹیرے میں نے کئی رکھے ہیں۔''

غلام رسول نے بار بار اُسے تسلی دی کہ وہ بھاگنے والوں میں سے نہیں ہے...... اور ان ہی تسلیوں کے درمیان پرنس کہیں اپنی اوقات بھول گیا!

گھاس کی کسیلی دھونی نے اُس کے سینے اور حلق میں آگ سی لگا دی تھی۔ اُس کے تن پر صرف ایک کرتا تھا جس کی اب دھجیاں بکھر چکی تھیں۔ غلام رسول نے اتنے بید کھائے تھے...... اتنے مکوں...... گھونسوں، تھپڑوں سے نوازا گیا تھا کہ اب اُس کی آنکھیں الگ الگ دیکھنے لگی تھیں......

''نہیں نہیں تھانے دار جی، بیگم صاحبہ کا کوئی قصور نہیں...... اُنھوں نے تو مجھے بڑی عزت دی...... مجھے پرنس بلاتی تھیں...... میں ہی اپنی اوقات بھول گیا، تو جی...... ہر انسان کی یہی بیماری ہے سر جی، جب اُسے طاقت مل جاتی ہے، تو اُسے یاد نہیں رہتا وہ کون ہے...... میں بھی بھول گیا تھا غلام رسول کو...... سچی میں اپنے آپ کو پرنس ہی سمجھنے لگا تھا...... مائی باپ صرف بادشاہ سبکتگین اپنی پرانی پوستین نکال کر دیکھا کرتا تھا...... نہ دیکھتا، تو وہ بھی بھول جاتا سارا کچھ...... پروفیسر صاحب اچھے آدمی تھے سر...... میں ہی تب بہک گیا تھا...... مجھے کیا لینا تھا جمہوریت سے...... مجھے کیا لینا تھا مساوات سے...... ایویں...... کچھ تھوڑی سی پی کر بہت زیادہ بہک جاتے ہیں، سر، میں بھی غلام رسول کو بھول گیا......''

''ہمیں دھمکاتا ہے...... ہمیں سکھاتا ہے...... لمبا ڈالو...... اور طبیعت صاف کرو۔''

اس بار اُس کی طبیعت اتنی صاف کی گئی کہ دوبارہ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

غلام رسول اپنا قصور مان کر ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا تھا!

○○○

شودر

عبادت میں ڈوبے ایک بنگالی محبوب کی کہانی وہ مندر کے باہر رہنے پر مجبور تھا۔

آج کے عہد کی خاص کہانی

جہاں شودروں کی شکلیں بدل گئی ہیں۔

آغا گل

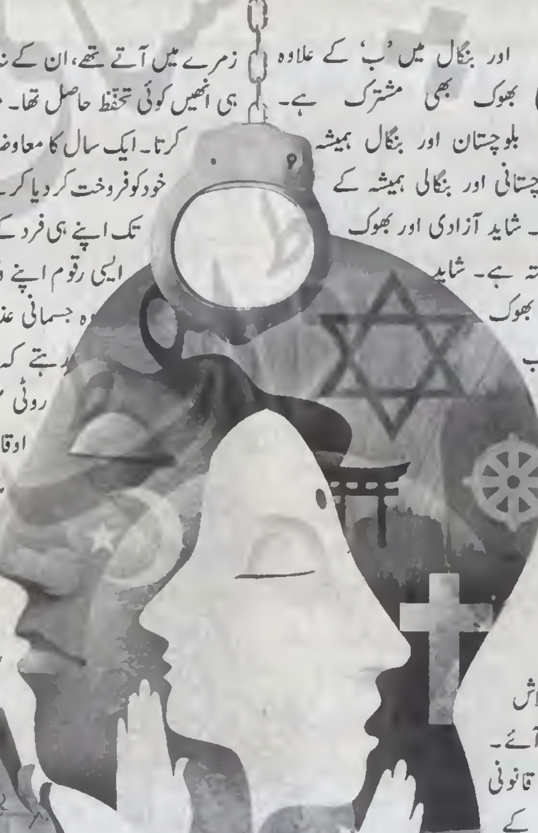

بلوچستان اور بنگال میں 'ب' کے علاوہ بھوک بھی مشترک ہے۔ بلوچستان اور بنگال ہمیشہ آزاد ہے مگر بلوچستانی اور بنگالی ہمیشہ کے بھوکے ہی رہے۔ شاید آزادی اور بھوک میں کوئی گہرا رشتہ ہے۔ شاید آزادی کی قیمت بھوک ہی ہے۔ جب افغان جنگ کے ڈالر بلوچستان پر برسنے لگے من و سلوئی کی طرح تو بنگالی جوق در جوق روٹی کی تلاش میں یہاں چلے آئے۔ چونکہ وہ غیر قانونی تارکین وطن کے زمرے میں آتے تھے، ان کے نہ تو کوئی حقوق تھے نہ ہی انھیں کوئی تحفظ حاصل تھا۔ معاوضہ بھی کم ہی ملا کرتا۔ ایک سال کا معاوضہ پیشگی لے کر وہ گویا خود کو فروخت کر دیا کرتے۔ پھر وہ ایک برس تک اپنے ہی فرد کے ملازم رہتے۔ بنگالی ایسی رقوم اپنے وطن بھجوا دیا کرتے۔ وہ جسمانی عذاب سہ کر بھی خوش رہتے کہ ان کے لواحقین کو روٹی مل رہی ہے۔ بعض اوقات مالک ان ملازموں کو آگے بھی فروخت کر دیتے۔ یہ خرید و فروخت چونکہ باہمی رضا مندی سے ہوا کرتی۔ لہٰذا کا ٹھیک ٹھاک

چلتا رہتا۔ ایک بار خورشید ایک بنگالی میرے ہاں لے آیا۔

''یہ بنگالی میں نے چھ ماہ کے لیے خریدا ہے۔ کچھ سستا مل رہا تھا۔''

''وہ کیسے؟'' مجھے اچنبھا ہوا۔

''پہلے مالک کو پتا چلا کہ یہ ہندو ہے، تو اس نے نقصان میں میرے ہاتھ فروخت کر دیا۔''

ایسے بنگالی شرائط ملازمت پہلے طے کر لیا کرتے تھے اور پھر ان پہ سختی سے کاربند بھی رہا کرتے۔

''اس کی شرائط کیا ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں صرف یہ کہ اسے پوجا پاٹ کی اجازت ہوگی اور ہفتے میں جس روز تم چاہو اسے ایک دن رات کی مکمل چھٹی ہوگی۔''

''وہ کیوں؟''

''دراصل یہ کسی لڑکی شکنتلا سے محبت کرتا ہے۔ اس کا خاندان بھی یہیں کہیں مارا مارا پھر رہا ہے۔ یہ شکنتلا کی تلاش میں آیا ہے۔ ہر ہفتے چوبیس گھنٹے اسے تلاش کر کے صبح ملازمت پر آ جایا کرے گا۔''

''خورشید تم نے خصوصی طور پر یہ ناکام عاشق اور وہ بھی ہندو کیوں تلاش کیا۔ تم امیر آدمی ہو معاوضے کی کمی بیشی سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''وہ عقل مند ہی امیر ہوا کرتے ہیں۔ پروفیسر تم امیر کیوں نہیں؟ دراصل ہمارے ہاں شراب پر پابندی لگنے سے اب ہم اقلیتوں کے کوٹے کی شراب لیتے ہیں۔ بڑی خجالت سی محسوس ہوتی ہے۔ ہم مسلمان بھنگیوں کے دروازوں پہ رات کو شراب خریدنے گئے ہوتے ہیں۔ ان کے نخرے غمزے بھی برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ ان کا بھی کاروبار چل نکلا ہے۔ مزے سے کماتے ہیں اپنے دروازوں پہ ہم سے انتظار کراتے ہیں۔ کم بخت مارے میں نے سوچا کہ مادھو یعنی یہ ملازم ہندو ہے۔ اس کے نام پہ پرمٹ بنوا لوں گا اور کام یہ تمھارے گھر پہ کرے گا۔ اس کی رقم میں ادا کر چکا ہوں۔''

خورشید میرا دوست تھا۔ میں یونیورسٹی کے سرکاری مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ خورشید پینے پلانے میرے ہاں چلا آتا۔ یونیورسٹی کالونی محفوظ جگہ تھی۔ مجھ پہ بھی وہ خرچ کرتا رہتا۔ اس لیے میں نے تعریض نہ کی۔ اب یہ نوکر بھی چھ ماہ کے لیے مل گیا۔ میں پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر رہا تھا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے سے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ دو ہزار روپیہ ماہانہ الاؤنس بھی ملتا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ دو ہزار کی اضافی آمدنی کے بعد شادی کا سوچوں گا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی استریوں اور کمبلوں پہ کی جاتی ہے۔ کوئٹہ سے جو جتنی استریاں اور کمبل متعلقہ ممتحن کو پہنچاتا رہے اسی قدر جلد ڈگری مل جاتی ہے۔ ان کا ذمہ خورشید نے لے رکھا تھا۔ لہٰذا مجھے فکر نہ تھی۔

خورشید نے مادھو کو اندر بلا لیا۔ مادھو صحت مند شخص تھا۔ آنکھوں میں ذہانت اور بغاوت تھی۔ عمر کوئی تیس برس کے لگ بھگ تھی۔

''مادھو! پروفیسر صاحب کا خیال رکھنا اور انعام بھی دیا کروں گا۔''

''آپ فکر نہ کریں مالک۔'' مادھو نے مسکرا کر یقین دلایا۔ اس کی مسکراہٹ زخمی تھی۔ جیسے پھڑ پھڑاتا گھائل شقوق۔

چند ہی روز میں مادھو نے گھر کا نقشہ ہی بدل کے رکھ دیا۔ ہر چیز میں ایک سلیقہ سا آ گیا۔ میں بھی مادھو سے بے تکلف ہو گیا۔ اکثر شام میں ہم اِدھر اُدھر کی

باتیں کیا کرتے۔ پھر شکنتلا کا ذکر چھڑ جاتا۔ جس پہ مادھو بہت خوش ہوا کرتا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی آ جایا کرتی۔ میں سوچتا کیسی خوش قسمت ہے شکنتلا جس سے مادھو اتنی شدید محبت کرتا ہے۔ بلکہ وہ تو فنا کے مقام تک جا پہنچا تھا۔ اس عشق میں مرا تو شہید کہلائے گا۔

میرے دوستوں میں بھی مادھو بہت مقبول ہو گیا۔ دوڑ دوڑ کے ان کے احکام بجالاتا۔ سر شام گلاس سجاتا، مشروبِ خاص کے لوازمات لاتا اور پینے والوں کی خدمت میں جتا رہتا۔ وہ اسے کچھ ٹپ بھی دے جایا کرتے۔ میں مغرب اور پھر عشا کی نماز پڑھنے کے بعد اپنا مقالہ تیار کرتا۔ مجھے شراب سے گھن آتی۔ بس چلتا، تو اپنے شرابی دوستوں کو نکال باہر کرتا، لیکن ان سے میرے گھر کا خرچ چلتا۔ وہی میرے ان داتا میرے سفارشی تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی افسر میرا بال بیکا نہ کر سکتا تھا۔ وائس چانسلر تک مؤدب سے رہا کرتے۔

رفتہ رفتہ مجھے مادھو کے عشق سے ہمدردی ہو گئی۔ میں نے خلوص دل سے دعائیں مانگیں کہ راجا دشینت کی طرح مادھو بھی اپنی شکنتلا سے جا ملے۔ اس چھ ارب انسانوں کے اژدھام میں اگر دو چاہنے والے مل جائیں تو کیا فرق پڑ جائے، قدرت کے کارخانے میں۔ میری دعاؤں سے مادھو بہت خوش ہوا کرتا۔ میں دوستوں سے مانگ مانگ کے مادھو کو شکنتلا کی تلاش کے لیے روپیہ بھی دلوانے لگا۔

''تم مجھے ریسرچ کے لیے پیسے دیتے ہو مادھو کو بھی ریسرچ کے لیے پیسے دیا کرو۔''

سب کو چڑھی ہوئی تھی۔ خورشید نے ہانک لگائی

''مادھو میں تو ہماری جان ہے، بول مادھو کیا چاہیے؟''

''شکنتلا!'' وہ بے خیالی میں کہہ اٹھا۔

ایک قہقہہ بلند ہوا۔ مادھو جھینپ گیا۔

''یہ شکنتلا کو دالبندین سے ورینگرو تک، کچلاک سے چمن تک تلاش کرنا چاہتا ہے۔ بولو کون اس عاشق کی مدد کرے گا؟''

سبھی جھوم اٹھے۔ ''ہم سبھی مدد کریں گے۔''

شرابی اگر شراب چھوڑ دیں، تو مجھے زیادہ اچھے لگیں گے۔ ان کی مالی اعانت سے مادھو کے دن پھر گئے۔ مادھو ہر ہفتے جلتے صحراؤں اور تپتے پہاڑوں سے تھکا ماندہ لوٹتا۔ پہلے تو میں پوچھا کرتا ''مادھو! کیا کچھ پتا چلا؟''

اس کے چہرے پہ دشت گواران کی اُداسیاں اتر آتیں مگر وہ پُر امید رہتا۔

''جی نہیں! مگر پتا چل جائے گا۔''

ایک گرم سہ پہر جب کہ بجلی کئی گھنٹوں سے غائب تھی اور میں مکھیوں سے لڑتے لڑتے تنگ آ چکا تھا۔ دوسرے کمرے میں فون کی گھنٹیاں بجتی چلی گئیں۔ میں نے سوچا کون بد ذوق اتنی شدید گرمی میں فون کر سکتا ہے؟ مادھو ہی فون اٹھائے تو بہتر ہو۔ گرمیوں کی دوپہر میں فون کی گھنٹی مجھے Death Knell سی لگتی۔ مادھو بھی جاگ اٹھا۔ برآمدے میں سو رہا تھا۔ اس نے فون اٹھا لیا۔ ہتھوڑوں کی طرح برسنے والی گھنٹی سے امان ملی۔ میں نے پھر آنکھیں موند لیں...... ہو دھماکے سے میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ مادھو دیوانہ وار اندر آیا۔

''شاب جی! شاب جی! شکنتلا مل گئی۔''

مادھو پاگل ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گنگا اتر آئی تھی۔ گنگا کا مقدس پانی اس کے چہرے کو پرنور بنا رہا تھا۔

وہ میرے قدموں پہ گر پڑا۔ میں نے بمشکل اسے اٹھایا۔

''شاب جی! آپ کی نمازوں سے ملی ہے۔ آپ کی دعاؤں سے ملی ہے۔''

''یہ اللہ کا کرم ہے میرا مطلب ہے تم بھی اپنے بھگوان کا شکر ادا کرو۔''

بھگوان کا نام سنتے ہی اسے جھٹکا سا لگا اور ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ اتنے مہینے وہ ساتھ رہا۔ ایسا پرخلوص، اتنا کھرا اور خدمت گزار کہ مجھے دکھ ہوا کہ اب وہ چلا جائے گا۔ اس کی وجہ سے گھر میں کتنی رونق تھی۔ ہر چیز تیار ملا کرتی۔ اپنی تنگدستی کے ہمراہ اکیلا رہنا تکلیف دہ تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ ''مادھو! مادھو!'' میں پکارتا رہ گیا۔ مادھو تپتی ہوئی سنسان سڑکوں میں اوجھل ہو گیا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے جوتے پہنے۔ دل میں وسوسے بھی اٹھ رہے تھے کہ کیا خبر کسی دشمن نے دھوکے سے فون کر کے بلایا ہو۔ پھر مادھو کی چیزیں اور پیسے بھی میرے پاس بطور امانت محفوظ تھے۔ یہ ساری چیزیں میرے دوستوں نے اسے دی تھیں۔ کہیں ان کے بغیر ہی مادھو نہ نکل جائے۔ میں مادھو کو ڈھونڈتا رہا۔ لوگوں سے پوچھتا پچھاتا بہت دور نکل گیا۔ میرے پاؤں جل رہے تھے۔ پسینے میں شرابور دھوپ سے دماغ پگھل گیا۔ مادھو جب شکنتلا کا نام سن کر نکلا، تو کس قدر خوش تھا۔ کتنی طاقت تھی اس میں کیسا عزم تھا اس میں سراج الدولہ کی شکتی، جیسے تیتو میر کا عزم، سبھاش چندر بوس کی وفا۔ بھگت سنگھ کا جلال۔ جیسے مکتی باہنی کا غیظ و غضب؟ کیا معلوم عالم جنون میں کیا کر ڈالے؟ پتا چلا کہ ہندو محلہ کی جانب اڑا جا رہا تھا۔ میں نے ہندو محلہ کی راہ لی۔ پر پیچ گلیوں سے ہوتا ہوا مندر کی جانب جا

فراق گورکھپوری

موت، اک گیت رات گاتی تھی
زندگی جھوم جھوم جاتی تھی
روتے جاتے تھے تیرے ہجر نصیب
رات فرقت کی ڈھلتی جاتی تھی
کھوئی کھوئی سی رہتی تھی وہ آنکھ
دل کا ہر بھید پا بھی جاتی تھی
ذکر تھا رنگ و بو کا اور دل میں
تیری تصویر اُترتی جاتی تھی
حسن میں تھی اُن آنسوؤں کی چمک
زندگی جن میں مسکراتی تھی
زندگی کو وفا کی راہوں میں
موت خود روشنی دکھاتی تھی
تھے نہ افلاک گوش بر آواز
بے خودی داستان سناتی تھی
کروٹیں لے اُفق پہ جیسے صبح
کوئی دو شیزہ رسمساتی تھی
زندگی زندگی کو وقت سفر
کارواں کارواں چھپاتی تھی
غم کی وہ داستان نیم شبی
آسمانوں کو نیند آتی تھی
موت بھی گوش برصدا تھی فراق
زندگی کوئی گیت گاتی تھی

انتخاب: (اشفاق علی، لاہور)

نکلا۔ مندر کے سامنے میدان میں درختوں کا جھنڈ تھا۔ گھنے سائے میں درخت کے نیچے آلتی پالتی مارے ہاتھ باندھے آنکھیں بند کیے مادھو بیٹھا تھا۔ اس کا رخ مندر کے کھلے دروازے کی جانب تھا۔ جہاں سے کرشن بھگوان کی مورتی دکھائی دے رہی تھی۔ بانسری بجانے والا مکٹ سجائے محبتیں بانٹنے والا، جس نے ساڑھے تین ہزار برس قبل وحدت الوجود کا فلسفہ دیا تھا۔

مادھو کے چہرے پہ سکون تھا۔ عبادت کرتے ہوئے اس کے چہرے پہ ایک حسن اتر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس کے آنسو دہکتی ہواؤں نے کسی مہربان ماں کی طرح خشک کر دیے تھے۔ صرف نشان سے رہ گئے تھے۔ جیسے بلوچستان کے خشک دریا جن میں سب کچھ ہوتا ہے، پانی نہیں ہوتا۔ تپتے پتھروں کی سفید گزرگاہیں پڑی ہوتی ہیں۔

میں نے قریب جا کر شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ ''مادھو مادھو!'' اس کا مراقبہ ٹوٹ گیا۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں جن میں خوشیاں تیر رہی تھیں، آنسوؤں میں ڈوبی ڈوبی۔

''مادھو! تم اندر کیوں نہیں چلے جاتے۔ کرشن بھگوان کے قدموں میں؟ جاؤ اندر چلے جاؤ۔ اتنی دور سے عبادت کر رہے ہو؟ شکنتلا کے تو پاس جانا چاہتے ہو اور بھگوان سے دور رہتے ہو جو دلوں میں محبتیں ڈالتا ہے۔ جو مکمل محبت ہے۔''

''شاب جی! مجھے لگتا ہے محبت کرنے والے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ میں شودر ہوں۔ میں مندر کے اندر نہیں جا سکتا۔ بھگوان کو دور ہی سے دیکھ سکتا ہوں۔''

مجھے تاسف ہوا ''بیچارا! کاش یہ مسلمان ہوتا، دھڑ سے مسجد میں چلا جاتا۔ ہندومت کیا ہے کہ پوجا کرنے والوں پہ بھی پابندی لگاتا ہے۔''

میں نے اس کا احساس کمتری مٹانے کے لیے موضوع بدل دیا۔

''شکنتلا کہاں ہے؟''

''اس کے بھائی کا فون تھا وہ خود مجھے لینے کے لیے آ رہا ہے۔ صبح تک پہنچ جائے گا۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم شکنتلا کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔'' میں متوقع تنہائی سے خائف تھا۔ مادھو ٹال سا گیا۔

باتیں کرتے ہوئے ہم ساتھ ساتھ چلتے ہندو محلہ سے باہر نکل آئے۔ سورج کی تمازت دم توڑ چکی تھی۔ مسجدوں میں اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہم امام بارگاہ کے قریب سے گزرے۔ اگلی مسجد اہل احادیث کی تھی، اس کے بعد اہلسنت کی مسجد تھی، لشکر طیبہ والوں کی مسجد تھی، پھر سپاہ محمد کی مسجد اور تھوڑی دور جماعت المسلمین کی مسجد بھی تھی۔ ہر مسجد سے اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔ فضا میں تقدیس تھی۔ اذان تو ایک ہی تھی جو ہر مسجد کے منار سے بلند ہو رہی تھی، مگر مسجدیں الگ الگ تھیں، جدا جدا تھیں، بے شمار تھیں۔ آگے پیچھے دائیں بائیں مساجد تھیں۔ میرے فقہ کی مسجد دور تھی۔ اس لیے میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ مادھو ایک ایک مسجد کو عقیدت سے دیکھتا پھر مجھے غور سے دیکھتا، مگر میں بڑھے ہی چلا جا رہا تھا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔

''شاب جی! اتنی مسجدیں گزریں۔ آپ ایک مسجد میں بھی داخل نہ ہو سکے۔ شاب جی! آپ بھی شودر ہیں کیا مسلمانوں کے؟''

ooo

ویسے تو صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اسے امرتا پریتم نے لکھا ہے

عمارت ساز

ایک آرزومندی کی شکستگی کی کہانی

وہ جس گھر کا مالک بننا چاہتا تھا وہاں عمارت ساز ٹھہرا تھا

امرتا پریتم

کہتے ہیں ہیر کی بھی سہیلیاں حسن کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک جب مل بیٹھتیں، تو قیامت کا حسن ایک گروہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتا۔ اسی طرح گاف روڈ کی کوٹھیاں بھی ہیر کی سہیلیاں تھیں۔ بانکی، شوخ، آراستہ پیراستہ اور ان سب میں راج میت کی کوٹھی تو واقعی ہیر تھی۔ شوخ و شنگ، چنچل اور البیلی۔

باقی کوٹھیوں کے باغیچے کسی دیہاتی حسینہ کے بالوں کی مینڈھیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ عشق پیچاں کی بیل، آرزو کے درخت پر لہرا کر چڑھ گئی تھی۔ توری کی بیل، موتیا کے پودے کے اوپر سایہ کرتی

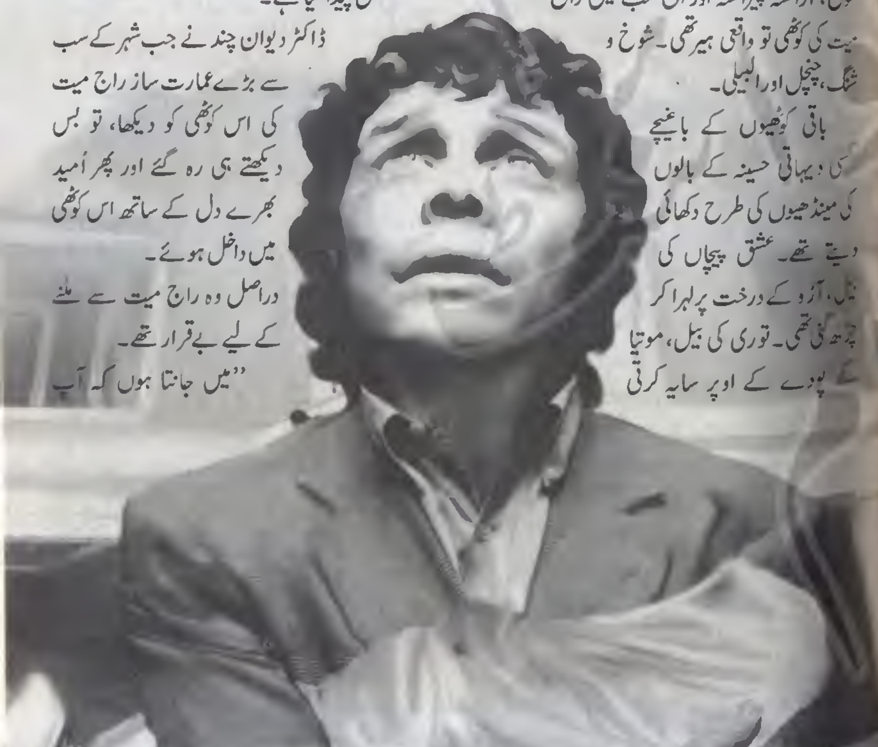

گزرتی تھی۔ اسی لیے راج میت ازراہ مذاق کہا کرتا تھا کہ میرے اس باغ کا پتا پتا میرے خیالوں کی طرح الجھا پڑا ہے۔ لیکن لوگ اس کی امریکن طرز کی کوٹھی میں پودوں کے اس خودرو اور بے ترتیب انداز کو دیکھ کر کہہ اٹھتے تھے کہ اس نے شہری دل کشی کو جنگلی پچ دے کر ایک نیا حسن پیدا کیا ہے۔

ڈاکٹر دیوان چند نے جب شہر کے سب سے بڑے عمارت ساز راج میت کی اس کوٹھی کو دیکھا، تو بس دیکھتے ہی رہ گئے اور پھر امید بھرے دل کے ساتھ اس کوٹھی میں داخل ہوئے۔

دراصل وہ راج میت سے ملنے کے لیے بے قرار تھے۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ

صرف سرکاری عمارتوں کے نقشے تیار کرتے ہیں اور ایک رہائشی کا نقشہ تیار کرنے پر رضا مند نہ ہوں گے...... پھر بھی آپ کے پاس آیا ہوں۔ ڈاکٹر دیوان چند نے خود ہی کہہ دیا۔"

راج میت یہ سن کر مسکرا دیا۔

"میری بیوی کے دل میں نہ جانے کون سے گھر کا خیال سمایا ہوا ہے، کئی نقشے تیار کرا چکا اور رد کر چکا ہوں۔ لیکن...... اب آپ کی شہرت سنی، یہ بھی سوچا کہ آپ ایک معمولی کام کو کیسے ہاتھ میں لیں گے۔ پھر بھی ایک موہوم سی اُمید کا دامن تھامے یہاں آیا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ عمارتوں کے نقشے تیار کرنے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔"

راج میت نے سنا، تو اس کے دل نے جیسے کہا "اگر لوگ ایسا کہتے ہیں، تو غلط کہتے ہیں۔ ممکن ہے عمارتوں کے نقشے بنانے میں میرا مقابل کوئی نہ ہو، لیکن ایک گھر کا نقشہ...... یہ تو میں نے آج تک کبھی بنایا ہی نہیں۔ جب کبھی میں کسی گھر کا نقشہ تیار کرنے بیٹھتا ہوں، تو وہ ایک خوبصورت عمارت کا نقشہ بن کر رہ جاتا ہے۔" لیکن راج میت نے اس جواب کو اپنے ہونٹوں تک ہی رکھا اس کے ساتھ ہی اس کی مسکراہٹ بھی دب کر رہ گئی۔

"فیس کے بارے میں، تو اب میں کیا کہوں۔ آپ تو لاکھوں روپے کا کام کرتے ہیں۔ چھوٹی موٹی رقم سے آپ کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کاروباری نقطۂ نظر سے نہ سہی، کسی بھولے بھٹکے خواب کی تعبیر سمجھ کر ہی آپ یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔"

"لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے آج تک کسی مکان یا کوٹھی کا نقشہ بنایا ہی نہیں۔

"آپ نے اپنے اس گھر کا نقشہ تو بنایا ہے۔"

"میرا گھر......؟" راج میت کی نگاہیں دیواروں سے جا ٹکرائیں اور پھر چھت کو دیکھتی ہوئی، بیٹھک سے باہر کی طرف کھلتے ہوئے دروازے سے نکل گئیں۔

راج میت کے پاس سیدھا سادہ جواب تھا کہ گھر کا ایک نقشہ تو وہ ہے جس میں گھر والے کی بیٹھک کا دروازہ گھر والی کے کمرے میں کھلے جس سے وہ محبت کرتا ہو۔ اور اس قسم کے گھر کا نقشہ اس نے کبھی تیار نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس نے ایسا گھر کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ راج میت یہ جواب دے، تو دیتا لیکن وہ خاموش رہا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ بات ڈاکٹر دیوان چند کی سمجھ میں ہرگز نہیں آئے گی۔ کیونکہ اس سیدھی سی بات کو کوئی سمجھ ہی نہیں پایا تھا۔

"نہ جانے کس گھر کا نقشہ ہے میری بیوی کے دماغ میں؟ وہ کہتی ہے کہ جب میں رات کو سوتی ہوں، تو وہ گھر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ لیکن جاگتے ہی سب کچھ گم ہو جاتا ہے اور اپنی زبان سے میں اس گھر کی تفصیل بیان نہیں کر سکتی۔"

راج میت نے ایک ٹھنڈی سانس لی جو سگریٹ کے دھوئیں میں خلط ملط ہو گئی اور پھر اسے یوں محسوس ہوا، جیسے کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی ہو۔"

برسوں پرانی یادوں نے جیسے راج میت کے کمرے کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کر دیے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک یاد بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی اور راج میت کے بائیں طرف یعنی دل کی طرف آ کر رُک گئی۔ راج میت نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ ستی تھی، جس نے ابھی

سولہویں برس میں قدم رکھا تھا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے نانا کے گاؤں آئی تھی۔ راج میت ان دنوں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اس نے چھٹیوں کو اپنے ماموں کے شہر میں گزارنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ لیکن ستی کو دیکھتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے شہر کی تمام دل فریبیاں اور رعنائیاں خود چل کر اس گاؤں آ گئی ہوں...... اب وہ شہر جا کر کیا کرتا۔

اسی وقت کھلے دروازے سے ایک اور یاد لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی آ گئی اور وہ آ کر اس کے دائیں طرف کھڑی ہو گئی۔ گاؤں کی سبھی لڑکیاں ستی کی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ستی نے بھی رنگین پیڑھے پر بیٹھ کر رنگ برنگ ریشمی دھاگوں سے پھلکاری کاڑھنی شروع کر دی۔

راج میت کے استادوں کو یہ شکایت تھی کہ پڑھائی میں سب سے ہوشیار ہونے کے باوجود بہت ہی بدخط تھا۔ لیکن ستی کی پھلکاری پر جیسے جیسے رنگ برنگ ریشمی پھول بنتے گئے، راج میت کی کاپیوں پر بھی جادو ہو گیا۔ اس کے حروف بھی موتیوں کی طرح صاف ہوتے چلے گئے۔ ڈرائنگ کی کاپی میں اس کی لائنیں اور رنگ ان کہی داستانیں سنانے لگے۔

بیرونی دروازے سے ایک اور یاد سمٹ کر داخل ہوئی...... ستی نے اپنے ماموں زاد بھائی کے ہاتھ راج میت سے اس کی کچھ کتابیں اور کاپیاں منگوا بھیجی تھیں۔ وہ بھی دسویں کا امتحان دینے والی تھی اور راج میت کے بارے میں شاید اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ کلاس میں سب سے ہوشیار ہے۔

جب ستی نے کتابیں واپس بھیجیں، تو حساب کی کتاب کے پہلے صفحے پر راج میت کے نام کے ساتھ ستی نے پنسل سے اپنا نام بھی لکھ دیا تھا۔ راج میت نے یہ دیکھا، تو اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ پھر تو اس کا یہ معمول ہو گیا کہ ادھر کتاب پر نظر گئی ادھر دل کی دھڑکن بڑھی۔ وہ اپنی زندگی کا نیا حساب کتاب کرنے بیٹھ جاتا۔ پنسل سے لکھے ہوئے ستی کے نام کو اس نے سیاہی سے گہرا کر دیا۔

گاؤں والوں کی انگشت نمائی سے بچنا ہو، تو کسی غیر لڑکی سے بات کرنے کے لیے ایک نوجوان کو سو بہانے درکار ہوتے ہیں۔ گاؤں کے چھل کپٹ سے آزاد جیون میں کوئی ایسا بہانہ یا موقع تلاش کرنا بڑا جوکھم کا کام ہے۔ جب وہ ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے، تو ان کی نگاہیں بہت لمبے قول قرار کر جاتیں۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کو آئیں۔ شہر جانے سے پہلے ستی نے راج میت کی دوسری کتاب اٹھائی، تو اس میں پرزہ تھا۔

"دسویں پاس کرنے کے بعد شہر میں آ جائیے۔ کالج میں ایک ساتھ پڑھیں گے۔"

راج میت کی انگلیاں جل اٹھیں۔ اس نے جھٹ دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔

بڑے دروازے سے ایک اور یاد کھڑکھڑاتی ہوئی داخل ہوئی اور راج میت کے کندھے کے پاس سر جھکا کر کھڑی ہو گئی...... راج میت سالانہ امتحان میں مشکل سے پاس ہوا تھا۔ نمبر اچھے نہیں آئے تھے۔ اس لیے اسے کسی کالج میں داخلہ نہ مل سکا۔ وہ بمبئی چلا گیا۔ یہاں پہلے پہل اس نے بجلی کا کام سیکھنا شروع کیا۔ پھر ریڈیو کی دکان پر ملازمت اختیار کی...... لیکن اس کا دل نہ لگا۔ آخر کار اس نے آرٹ اسکول میں داخلہ لے لیا

اور فنِ تعمیرات کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔

راج میت کی جدوجہد سے بھری ہوئی زندگی کی راہوں پر ستی کے وعدے بھرے خطوط کے جگنو ٹمٹماتے رہے۔ جب بھی وہ کاغذ پنسل سے عمارتوں کے ڈیزائن تیار کرتا، تو اسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ ایک خوابوں سے بھی حسین گھر کا نقشہ تیار کر رہا ہو جس کا دروازہ ستی کے دروازے کی طرف کھلتا اور پھر......

کچھ برس بعد جب فنِ تعمیرات کی سند حاصل کر کے بمبئی سے واپس آیا، تو ستی کے ماں باپ نے اپنی زمین گروی رکھ دی تھی۔ ستی کی سگائی وہ کہیں کر چکے تھے ستی نے رو کر صرف یہی کہا تھا۔

''راج مجھے معاف کر دو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری زبان کو اقرار کرنے کا کوئی حق نہیں۔ شاید ہمارے دیش میں کسی بھی عورت کے ہونٹوں کو قول دینے کا اختیار نہیں۔''

راج میت کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ وہ ان سب یادوں کو پھٹکار رہا تھا۔

اب تم یہاں کیا کرنے آئی ہو، تم یہ بخوبی جانتی ہو کہ میں لاکھ کوشش کرنے پر بھی ایک گھر کا نقشہ تیار نہیں کر سکا۔ کیوں کہ میری بیٹھک کا دروازہ جس عورت کے کمرے کی طرف کھلتا ہے وہ ستی نہیں!''

ڈاکٹر دیوان چند حیران پریشان بیٹھے تھے۔ راج میت کی خاموشی ٹوٹنے میں ہی نہیں آتی تھی۔ راج میت کے انکار پر تو وہ منت سماجت کر سکتے تھے، لیکن اس خاموشی پر وہ کیا کرتے؟

اسی وقت ایک نوکرانی کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر دیوان چند کو محسوس ہوا جیسے وہی ان کی مشکل کا حل بن کر آئی ہو۔ نوکرانی راج میت سے مخاطب ہوئی اور پھر راج میت کی خاموشی ٹوٹے گی۔

''صاحب میم صاحب کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

راج میت کو بات سمجھنے میں پہلے دقت ہوئی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا۔ ڈاکٹر دیوان چند سے اس نے کہا ''صاحب معاف فرمائیے، مجھے گھر میں ڈاکٹر کو بلانا ہے۔ آپ کی مرضی کے مطابق ڈیزائن تیار کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ کسی اور آرکیٹیکٹ......''

ڈاکٹر دیوان چند ڈیزائن والی بات کو ان سنی کرتے ہوئے بولے ''مسز راج میت کو کوئی تکلیف ہے؟ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میری خدمات حاضر ہیں۔''

''شکریہ...... لیکن اس وقت ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر راج میت اٹھ کر چلنے لگا۔

''آپ بیٹھیے! میری بیوی ہسپتال میں سب سے بڑی ڈاکٹر ہے۔ میں چند منٹ میں اسے یہاں لے آتا ہوں۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا اور راج میت رُک گئے۔''

ڈاکٹر دیوان چند چلے گئے، لیکن راج میت بہت پریشان تھا کیونکہ یہ بن بلائی یادیں جو زبردستی اس کے کمرے میں آ گئی تھیں، واپس جانے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ پہلے تو اس نے انھیں منت سماجت سے لوٹ جانے کو کہا۔ لیکن وہ نہ جانے کس ارادے سے آئی تھیں۔ انھوں نے راج میت کے ماتھے کی تیوریوں کی پروا کی نہ منت سماجت کی۔ وہ بڑے آرام سے کمرے میں ٹہل رہی تھیں، کمرے کی چیزوں کو الٹ پلٹ کر رہی

تھیں اور آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ راج میت چپ چاپ بیٹھا ان کی طرف دیکھتا رہا۔ کرسیوں میزوں، کتابوں، تصویروں سب کا یادیں جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر وہ ایک میز کے قریب آ کر رُک گئیں۔ دراز کھولا۔ ایک ریشمی رومال میں بڑے سلیقے سے لپٹی ہوئی کتاب نکال لائیں اور راج میت کے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔

''ہوں...... یہ تو حساب کی کتاب ہے اور وہ بھی دسویں جماعت کی۔ اتنا بڑا عمارت ساز! بھلا اس کو کیوں سنبھال سنبھال کر رکھے ہوئے ہے؟ ایک یاد نے اسے چھیڑا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔''

''دیکھی، اس کا پہلا صفحہ تو دیکھ۔ یہ کیا لکھا ہے؟ یہ سن کر تمام یادیں ایک دوسرے سے کتاب چھین کر پڑھنے کے لیے بے قرار ہو اٹھیں۔

''ستی۔ راج میت ایک یاد نے اونچی آواز میں پڑھا۔ راج میت کی آنکھیں ایک کرب سے ڈبڈبا آئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے زندگی بھی ایک حساب کی کتاب ہے، جس پر نہ جانے ستی کی محبت نے اپنا نام کیسے لکھا کہ وہ اب صرف اسی کا نام ورد کرنے لگا اور اپنا سب کچھ بھول گیا۔

کمرے میں آہٹ ہوئی۔ نوکرانی نے آ کر بتایا کہ لیڈی ڈاکٹر آ گئی ہے اور وہ اپنی نرس کے ہمراہ سیدھی میم صاحب کے کمرے میں چلی گئی ہے، ویسے فکر کی کوئی بات نہیں۔

راج میت نے اثبات میں سر ہلا دیا اور نوکرانی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اب راج میت نے ستی کی یادوں کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ اس کتاب کو میز کی دراز میں مقفل کر کے چلے جاؤ۔''

یادیں مسکرا دیں، جیسے کہہ رہی ہوں ہم تمھاری نوکر نہیں، ہم کسی کی بھی نوکر نہیں، ہم نہ کسی کے کہنے سے آتی ہیں، نہ کسی کے حکم پر واپس لوٹتی ہیں۔

راج میت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ہاتھوں سے چہرے کو یوں پونچھنے لگا جیسے یادیں بھی پسینے کے قطرے ہوں...... پھر اپنی اس حرکت پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ یہ ہنسی، یہ قہقہہ رونے سے زیادہ مشابہہ تھا۔ پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی ایک کاغذ نکالا اور پنسل سے اس نے ایک نقشہ تیار کرنا شروع کر دیا۔

نوکرانی ہانپتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی...... جیسے بہت تیز دوڑتی ہوئی آئی ہو ''صاحب! صاحب! چھوٹا صاحب...... نوکرانی کے پیچھے پیچھے لیڈی ڈاکٹر بھی تھی۔ نوکرانی نے پردہ ہٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ڈاکٹر نے سفید کپڑوں میں لپٹے ہوئے بچے کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مبارک!''

لیڈی ڈاکٹر کی پھول سی مسکراہٹ ایک دم سوکھ کر کانٹا بن گئی۔ اور یہ کانٹا۔ مبارک لفظ کے پاؤں میں چبھ گیا۔ ڈاکٹر ستی نے ساری زندگی کی پیاس آنکھوں میں بھر کر راج میت کی آنکھوں میں جھانکا...... ستی کی زبان تو نہیں، لیکن پلکوں پر اٹکا آنسو جیسے بہت اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''راج دیکھ میرے ہاتھوں میں وہ بچہ ہے۔ جس کی ماں مجھے بننا تھا۔ لیکن آج صرف اس کی دائی......''

راج میت نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو ستی کی طرف بڑھا دیا۔ راج میت کی زبان تو نہیں، لیکن اس کی پلکوں پر اٹکا ہوا ایک آنسو بھی اونچی آواز سے کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو!...... مجھے تبھی اس گھر کا مالک بننا تھا۔ اب میں محض اس کا عمارت ساز ہوں۔''

○○○

دھوپ کی منڈیر

قبروں کی بے بسی کے شاہد ایک گورکن کی کہانی
اسے ایک لڑکی، کسی قبر پر
لگے کتبے کی طرح زبانی یاد تھی

مظہر الاسلام

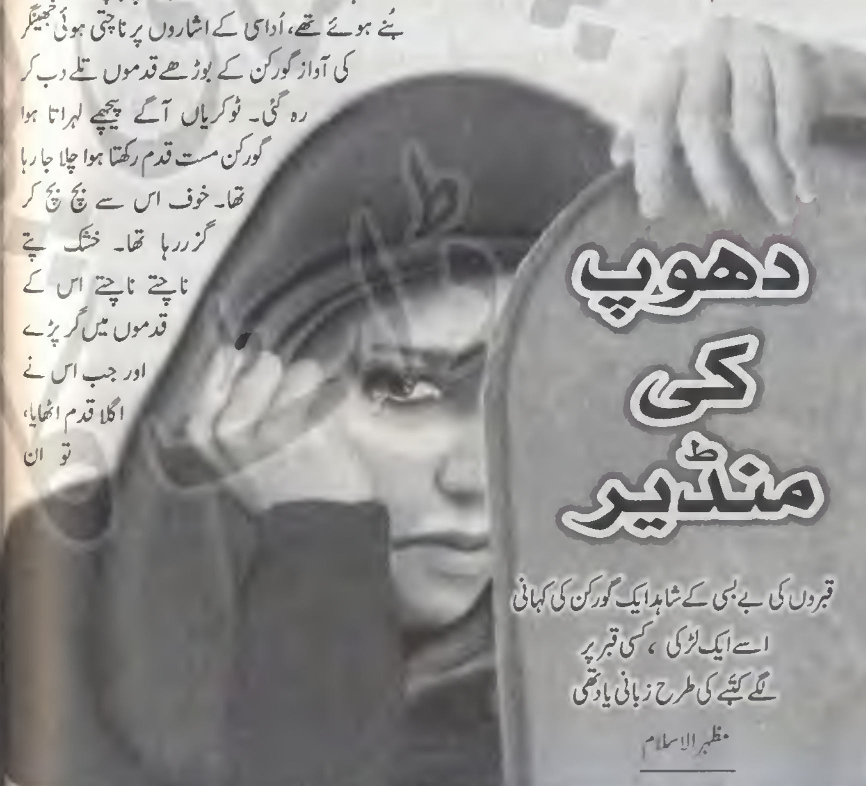

جب وہ قبر کھود چکے، تو گورکن نے بغلی جیب میں ہاتھ ڈال کر ناپ کا دھاگا نکالا اور اپنے بیٹے کی طرف اچھالتے ہوئے بولا

''دیکھ لو ٹھیک ہے نا۔'' بیٹے نے جھٹک کر دھاگے کے بل کھولے اور ایک سرا باپ کے ہاتھ میں پکڑا کر قبر کا ناپ لیا۔ بیٹے کے لبوں پر پوری مسکراہٹ دیکھ کر گورکن کو اندازہ ہوگیا کہ قبر ناپ کے مطابق ہے۔ آگے بڑھ کر اس نے کدال اور ٹوکریاں اٹھالیں اور درخت پر بیٹھے چونچیں لڑاتے ہوئے پرندوں پر نظریں جماتے ہوئے بولا

''میں چلتا ہوں تم قبر اچھی طرح صاف کردو۔''

دونوں ہاتھ کمر پر جما کر اس کے بیٹے نے اکتایا ہوا چہرہ قبر کی طرف لٹکاتے ہوئے پوچھا:

''جنازہ کتنے بجے آئے گا؟''

گورکن کی نظریں بدستور پرندوں کی ایک دوسری میں گڈمڈ ہوتی ہوئی چونچوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ''سنا ہے مرنے والے کے عزیز دور دراز کے رہنے والے ہیں۔ کچھ دیر لگ ہی جائے گی تم یہیں انتظار کرو۔'' وہ تیزی سے گھوما اور بے پروائی سے قبروں پر پاؤں رکھتا ہوا آگے بڑھا۔

چاروں طرف پھیلی ہوئی قبروں پر چُپ کے جالے بُنے ہوئے تھے، اُداسی کے اشاروں پر ناچتی ہوئی جھینگر کی آواز گورکن کے بوڑھے قدموں تلے دب کر رہ گئی۔ ٹوکریاں آگے پیچھے لہراتا ہوا گورکن مست قدم رکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ خوف اس سے بچ بچ کر گزر رہا تھا۔ خشک پتے ناچتے ناچتے اس کے قدموں میں گر پڑے اور جب اس نے اگلا قدم اٹھایا، تو ان کی سسکیاں لہک کر خشک اور نوکیلی جھاڑیوں میں دب گئیں۔ دو نیولے ایک دوسرے کے تعاقب میں قبروں پر اچھلتے ہوئے آئے اور گورکن کے جوتے کی نوک سے ٹکرا کر کچی قبر کے ساتھ والے سوراخ میں گھس گئے۔

دھت تیرے کی کم بخت......!

کدال کندھے پر درست کرتے ہوئے وہ بڑبڑایا اور تیز تیز قدم اٹھانے لگا...... اس کے وجود کے درخت کی ٹہنیوں پر بیٹھی سوچوں کی چڑیاں چوں چوں کرنے لگیں۔

جب وہ قبریں کھودنے کے قابل ہوا تھا، تو اس کا باپ چل بسا تھا اور اب جب سے اس کے بیٹے نے قبریں کھودنے کا کام سنبھالا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی زندگی کے دن پورے ہوگئے ہیں۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح وہ بھی اسی قبرستان میں پیدا ہوا اور اب یہیں قبر کے لیے جگہ تلاش کر رہا تھا۔ مگر اپنی قبر کے لیے جو جگہ بھی وہ پسند کرتا وہی جگہ ہر مرنے والے کے عزیزوں کو پسند آجاتی اور وہ اچھے گورکن کی طرح جگہ ان کے حوالے کر دیتا۔ آج بھی جس جگہ وہ قبر کھود کر آرہا تھا اس نے وہ خود اپنے لیے منتخب کر رکھی تھی۔

اچانک وہ رک گیا ایک لڑکی اس نوجوان کی قبر پر جھکی ہوئی تھی جو کچھ ہی دن پہلے اچانک موت کا شکار ہو گیا تھا۔ شاید وہ اس کی بیوی تھی۔ دوپٹا لڑکی کی کمر تک پھیلا ہوا تھا اس نے چہرہ ہاتھوں کی قبر میں چھپا رکھا تھا۔ اس کی نازک سی سینڈل کا ایک پیر پہلو کے بل پڑا تھا اور گول مٹول بغیر ہڈی کے پیر بھُر بھری مٹی میں منہ چھپائے تھے۔ قریب ہی ایک ٹوکری رکھی تھی جس میں نان اور پھل تھے۔ ٹوکری دیکھ کر گورکن کے پیروں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ کندھا جھکا کر اس نے کدال نیچے اتارا اور ایک دوسری سے لپٹی ہوئی ٹوکریاں اوندھی کر کے بیٹھ گیا اور بار بار ٹوکری اور لڑکی کے درمیانی فاصلے کو آنکھوں سے ناپنے لگا۔ اس نے سوچا کچھ ہی دنوں بعد یہ لڑکی بھی دنیا کے کاموں میں اتنی محو ہو جائے گی کہ اسے قبر پر آنے کے لیے فرصت بھی نہیں ملے گی۔ خود وہ اس قبرستان میں ہوتے ہوئے بھی زیادہ دنوں تک اپنے باپ کی قبر پر حاضری نہ دے سکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شروع شروع میں لوگ باقاعدگی سے اپنے عزیز کی قبر پر پھول چڑھاتے، کھانا تقسیم کرتے اور پھر یوں بھول جاتے ہیں جیسے کوئی بچہ استعمال شدہ کاپی کو الماری میں رکھ کر بھول جاتا ہے۔

تجربے کے جوش اور اعتماد سے گورکن کی نس نس پھڑ پھڑانے لگی اسے بے اختیار وہ لڑکی یاد آگئی جو کئی ماہ پہلے باقاعدگی سے ایک نوجوان کی قبر پر آیا کرتی تھی۔ وہ ہر روز اچھے اچھے کھانے پکا کر لاتی اور گھنٹوں بیٹھ کر قبر سے باتیں کیا کرتی جب اس کی چھوٹی چھوٹی مگر سمندروں سے بھی گہری آنکھوں میں بادل گھر آتے، تو وہ خالی برتن سمیٹ قبرستان کی حدود سے نکل جاتی۔

سوچتے سوچتے گورکن کی زبان سے لذت کا فوارہ چھوٹا۔ کتنے اچھے کھانے پکا کر لایا کرتی تھی وہ......! اس کی نظریں سامنے پڑی ہوئی ٹوکری پر جم گئیں۔ پھر اس نے قبر پر جھکی ہوئی لڑکی کو نگاہوں پر اس طرح گھمایا جیسے حساب کا کوئی سوال حل کرتے ہوئے انگلیوں پر گنتی کر رہا ہو...... کتنا اچھا ہے اب یہ لڑکی بھی مزے مزے کے کھانے پکا کر لایا کرے گی...... کچھ دن ہی سہی جب تک چلتا ہے چلاؤ، انگلی سینے پر رکھ کر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا...... لیکن شاید پھر اس کی اپنی بات بھی پوری طرح اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ لگتا ہے یہ مرنے والے کی بیوی ہے۔ زیادہ دنوں تک نہیں ٹک سکے گی۔

سوچتے سوچتے اس نے خالی ٹوکری میں ہاتھ گھمایا۔

گورکن کی تمام زندگی میں قبر پر حاضری دینے کی طویل مدت کی مثال اسی لڑکی کی تھی جو کئی ماہ تک باقاعدگی سے دل کے رشتوں کی خاطر نوجوان کی قبر پر آیا کرتی تھی۔ وہ قبر پر یوں آتی جیسے مردہ نہیں کسی زندہ انسان سے ملنے آئی ہو...... اس کا سینہ گرمی اور پیاس کی شدت سے ستائی ہوئی چڑیا کی طرح ہلکان ہونے لگتا۔ اس کے ہاتھ دعا کے لیے کبھی نہیں اٹھے تھے۔ لفظ اس کی گردن کے اندر ہی پھڑکتے رہتے اور اس کے ہونٹ دھوپ میں پڑے ہوئے خالی کٹورے کے کناروں کی طرح ویران اور اداس ہو جایا کرتے تھے۔

گورکن نے سوچ کی زبان کو لگام دی اور ٹانگیں پھیلا کر نیم دراز ہوگیا۔ سامنے قبر پر جھکی ہوئی لڑکی اس کے قریب پڑی ہوئی ٹوکری اور ٹوکری میں لذیذ کھانا...... انتظار گورکن کی آنکھوں میں بلکنے لگا۔ ایسا ہی انتظار اسے ان دنوں بھی ستایا کرتا تھا جب کئی ماہ پہلے آنے والی لڑکی قبر پر جھک کر یوں گم ہو جایا کرتی تھی جیسے مر ہی گئی ہو......

جھینگر کی آواز پھر اداسی اور تنہائی کے کندھوں پر سوار ہوگئی تھی۔ خوف گورکن کے ڈر سے جھاڑیوں میں چھپا اسے گھور رہا تھا، چھوٹی چھوٹی تیز اور پھرتیلی رنگین چڑیاں قبروں کے کتبوں پر بیٹھی دُمیں ہلا ہلا کر ایک دوسری سے باتیں کر رہی تھیں۔ کتبوں کے چہرے بیٹوں سے لتھڑے ہوئے تھے۔ قبروں کی بے بسی دیکھ کر گورکن کو وہ دن یاد آ گیا۔ جب ایک دن اپنے عزیزوں کی قبریں دیکھنے کے لیے وہ لڑکی اپنی موٹی موٹی اور چتر بہنوں کے ہمراہ قبرستان آئی تھی اور ان سے نظر بچا کر نوجوان کی قبر کے پاس آ گئی تھی اور جب

غزل

ہر عقدۂ تقدیرِ جہاں کھول رہی ہے
ہاں دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے

رہ رہ کے کھنک جاتی ہے ساقی یہ شبِ ماہ
اک جام پلا خنکیِ شب بول رہی ہے

رکھتی ہے مشیت حدِ پرواز جہاں بھی
انسان کی ہمت وہیں پَر تول رہی ہے

پہلو میں شبِ تار کے ہے کون سی دنیا
جس کے لیے آغوشِ سحر کھول رہی ہے

ہر آن وہ رگ رگ میں چٹکتی ہوئی کلیاں
اُس شوخ کی اک ایک ادا بول رہی ہے

خوش ہے دلِ غمگیں بھی، غنیمت ہے یہ وقفہ
اس کی نگہ ناز بھی ہنس بول رہی ہے

گو حسن کی قیمت ہے ازل ہی سے دو عالم
دو جنسِ محبت ہے جو اَنمول رہی ہے

پھر از سرِ نو چونکتی جاتی ہیں نگاہیں
خاموش ہیں افلاک، زمیں بول رہی ہے

اک کشفِ کرامات کا عالم ہے گلستاں
یا بادِ صبا رازِ جہاں کھول رہی ہے

چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے
آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

آتا ہے فراقؔ آج ادھر بہرِ زیارت
بت خانے کی خاموش فضا بول رہی ہے

(شاعر: فراق گورکھپوری انتخاب: حماس، ساہیوال)

اس کی بہن نے غرا کر پوچھا تھا کہ یہ کس کی قبر ہے، تو لڑکی نے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا ''پتا نہیں!'' اس دن گورکن کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ لڑکی قبر پر حاضری دیے بغیر بھی پرسکون رہ سکتی ہے۔ لڑکی نے کپڑے میں لپٹے ہوئے برتن چپکے سے قبر کے قریب رکھ دیے تھے۔ گورکن کی طرف دیکھتے ہوئے چور مسکراہٹ اس کے خشک ساحل سے ٹکرائی تھی اور گورکن کو یوں لگا تھا جیسے وہ اس کی پہلی اور آخری مسکراہٹ تھی۔

اس لڑکی نے کبھی بھی گورکن سے بات نہ کی، اسے بات کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس کی خاموش حرکتیں پوری تفصیل سے گورکن کی سمجھ میں آجایا کرتی تھیں۔ اس کے لیے وہ لڑکی قبروں پر لگے ہوئے ان کتبوں کی طرح تھی جن کی تحریریں اسے زبانی یاد تھیں۔

گورکن نے جسم دوہرا کر کے بازو اکڑائے اچانک قریبی جھاڑی میں کوئی چیز پھڑپھڑائی...... گورکن نے کدال کو جھاڑی کی طرف دھکیلا اور پھر پیچھے کھینچ لیا۔ جھاڑی ساکت ہوگئی...... اس نے کدال ایک طرف رکھ دیا اور تہ بند اوپر کر کے پنڈلیاں کھجانے لگا۔ قریب ہی ایک قبر پر موٹے موٹے کالے کیڑے کسی سفید سی چیز کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے، اتنے میں کتیا بچوں کی قطار پیچھے لگائے مناسب چال چلتی ہوئی آئی اور منہ اٹھا کر قبر کی طرف دیکھا اور پھر چل پڑی...... تمھاری ماں کی...... گورکن اس کی طرف جھکتے ہوئے بڑبڑایا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کتیا کچھ دیر اور وہاں کھڑی رہتی، تو [illegible] در چونک کر حواس مجتمع کر لیتی۔ کدال کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی...... اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر اس کے قریب جائے لیکن پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ شاید لڑکی اس کی مداخلت کو پسند نہ کرے۔ ہوسکتا ہے اسے یک دم گورکن سے نفرت ہو جائے...... لیکن کھانا...... معاً پہلے والی لڑکی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کی لذت گورکن کی زبان پر سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر گئی...... اسے وہ دن یاد آ گیا جب آخری بار اس نے اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا تھا...... اس کے بعد وہ کبھی نہیں آئی تھی شاید وہ بھی کسی حادثے کا شکار ہوگئی تھی...... مگر نہیں وہ تو قبر سے بڑی اچھی طرح جدا ہو کر گئی تھی۔ اس دن وہ صبح سویرے ہی آ گئی تھی اور تمام دن قبر کے اردگرد لڑھکتی ہوئی مٹی درست کرتی رہی تھی اور جب شام کے وقت سورج کی روشنی قبروں میں چھپتی پھر رہی تھی، تو اس نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی جیسے وہ نوجوان کہیں دور دراز سفر پر جا رہا ہو اور وہ اسے اسٹیشن پر الوداع کہنے آئی ہو......

شور ہوا...... ''کلمہ...... کلمہ شہادت۔'' گورکن کو اندازہ ہوگیا کہ جنازہ آ گیا ہے۔ اس کا بیٹا قبر کے پاس بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ تہبند لپیٹتا ہوا اٹھا اور جلدی جلدی جنازے کی آوازوں کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن کچھ ہی دور تک جا کر جلدی سے پلٹا اور قبر پر جھکی ہوئی لڑکی کے قریب رکھی کھانے کی ٹوکری کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ تیز ہوا...... اور تیز...... قریب آ کر اس نے ہاتھ ٹوکری کی طرف بڑھایا...... لڑکی نے چونک کر اپنا چہرہ ہاتھوں کی قبر سے باہر نکالا اور اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ سن ہوگیا...... اس کا سر چکرایا...... اس کا ٹوکری کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ وہیں رک گیا......

''یہ تو وہی ہے...... وہی پہلے والی لڑکی!''

○○○

دو دوست

چمکتی دھوپ میں پڑے دو تھیلوں کا ماجرا
انھوں نے دو لوگوں پر بالکل ہی الگ ۔۔۔ الگ ۔۔۔ اثر کیا تھا

گائے ڈی موپساں

شدید قحط کی لپیٹ میں **پیرس** تھا۔ حتیٰ کہ چھتوں پر چڑیاں اور گٹروں میں چوہے نظر آنا بند ہو گئے..... لوگوں کے ہاتھ جو شے لگتی، اُسے چٹ کر جاتے۔

ایک دن گھڑی ساز، مونیور موریسوٹ چہل قدمی کرنے نکلا ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے۔ اچانک اس کی ملاقات ایک شناسا سے ہوگئی۔

جنگ چھڑنے سے قبل وہ ہر اتوار دریائے رائن مچھلیاں پکڑنے جاتا تھا۔ ایک ہاتھ میں بنسی و کانٹا ہوتا، دوسرے میں ٹن کا ڈبا۔ وہ اپنی پسندیدہ جگہ پہنچتے ہی مچھلیاں پکڑنے لگتا اور رات گئے تک پکڑتا رہتا۔

اسی جگہ اس کی مونیور سیوج سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ پست قامت، خوش باش شخص کپڑے کا تاجر تھا اور اسی کے مانند مچھلیاں پکڑنے کا شوقین! چنانچہ ان کے مابین دوستی کا زم گرم رشتہ پیدا ہوگیا۔ وہ دونوں پانی میں بنسیاں ڈالے گھنٹوں پہلو بہ پہلو بیٹھے رہتے۔

ان کے درمیان بہت کم گفتگو ہوتی۔ کبھی کبھی ہی بات کرتے۔ دراصل ملتی جلتی دلچسپیوں اور جذبات کے باعث وہ ایک دوسرے کا مزاج خوب سمجھ گئے تھے۔ ایسی حالت میں دوسرے کو اپنی بات سمجھانے کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں رہتی۔

موسم بہار میں صبح دس بجے جلد سورج نکلنے کے باعث پانی میں ہلکی ہلکی دھند پھیل جاتی اور دھوپ جوشیلے بنسی بازوں کی کمر کو گرمائش پہنچاتی۔ تب موریسوٹ اپنے پڑوسی سے گویا ہوتا:

''واہ! کیا سہانا سماں ہے؟''

جواب ملتا ''اس سے بہتر منظر میرے تصور میں نہیں سما سکتا۔''

یہ مختصر جملے انھیں مطمئن کرنے اور ایک دوسرے کو سراہنے کے لیے کافی ہوتے۔

موسم خزاں میں دن ڈھلے آسمان پر چمکتا آفتاب دہکتی آگ کا گولا بن جاتا۔ فضا میں منڈلاتے بادل تب سورج کی شعاعوں میں دمکنے لگتے اور پتے بھی عجب رنگ دکھاتے جو سردی کا استقبال کرنے کو تیار ہوتے۔ دریا کنارے چھایا یہ سماں بھی دونوں دوستوں کو مبہوت کر دیتا۔ تب مونیور سیوج بول اُٹھتا:

''واہ! کیا شاندار منظر ہے؟''

موریسوٹ جواب دیتا ''ایسا سماں قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔''

جیسے ہی ان کی نظریں ملیں، وہ رک گئے اور پھر سے تپاک سے ملے۔ گو انھیں یہ احساس بھی رہا کہ وہ [illegible] حالات میں مل رہے ہیں۔

مونیور سیوج نے سرد آہ بھری اور بڑبڑایا: ''بڑا بُرا وقت ہے۔''

موریسوٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور گویا ہوا: ''مگر سال کے پہلے دن موسم بڑا خوشگوار ہے۔''

وہ پھر پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔ چال ڈھال پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

مونیور سیوج آہ بھر کہ بولا: ''ہم نے اکٹھے بڑا حسین وقت گزارا ہے۔ نجانے اب ہم کب مچھلیاں پکڑ سکیں گے۔''

ماضی کی خوشگوار یادیں تازہ کرتے دونوں دوست ایک کیفے میں جا گھسے۔ کافی پی کر نکلے، تو خود کو تروتازہ محسوس کرنے لگے۔ سرد ہوا نے مونیور سیوج کے جذبے کو مہمیز دی۔ وہ بولا ''کیوں نہ ہم مچھلیاں پکڑنے چلیں؟''

''کہاں؟''

''ارے جہاں پہلے پکڑتے تھے۔ دریائے رائن جانے والے راستے پہ ہی فوجی چوکی کا کمانڈر، کرنل ڈومیلن میرا واقف کار ہے۔ میں اس سے اجازت لے لوں گا۔'' سیوج نے بتایا۔

یہ سن کر موریسوٹ جیسے پھر جی اٹھا۔ کہنے لگا ''بہت خوب! تو پھر ہم چلتے ہیں۔''

وہ اپنا اپنا سامان لانے جدا ہوگئے۔ ایک گھنٹے بعد وہ دریائے رائن کی سمت رواں دواں تھے۔ فوجی چوکی پہنچے، تو کرنل ڈومیلن کی سمت رواں دواں تھے۔ فوجی چوکی پہنچے، تو کرنل ڈومیلن نے انھیں خوش آمدید کہا۔ فرمائش سننے پر مسکرایا اور آگے جانے کی اجازت دے دی۔ واپسی کے لیے پاس ورڈ بھی بتا دیا گیا۔

جلد وہ دریائے رائن کے کنارے اپنی مخصوص جگہ جا پہنچے۔ وہاں سے دریا پار کولمین نامی گاؤں نظر آتا تھا۔

پہلے گاؤں میں چہل پہل رہتی۔ مرغیاں دانہ چگتیں، تو مویشی گھاس چرتے۔ مگر ان کے وہاں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ گاؤں کے سبھی باسی بھاگ کر پیرس چلے آئے تھے۔

گاؤں کے پیچھے گھاس کے میدانوں کا وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان میں جابجا چھوٹے بڑے ٹیلے بھی موجود تھے۔ مونیور سیوج نے انھی میدانوں کی سمت اشارہ کر کے بتایا ''جرمن فوج نے وہاں اپنے ٹھکانے بنائے ہیں۔''

ویران گاؤں دیکھ کر دونوں دوستوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ دل ہی دل میں جرمنوں کو کوسنے لگے۔ گو انھوں نے اب تک جرمن فوجیوں کو نہیں دیکھا تھا، مگر وہ کئی ماہ سے ان کے مظالم سہ رہے تھے...... جرمنوں نے پہلے فرانسیسیوں کا قتلِ عام کیا، پھر لوٹ مار کی اور اب پیرس کے محاصرے سے انھیں بھوک و پیاس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ فرانسیسی اب اس اجنبی و فاتح قوم کو دہشت و نفرت کی ملی جلی نظروں سے دیکھتے۔ موریسوٹ نے دریافت کیا ''اگر ہمارا ان سے ٹاکرا ہوگیا تو؟''

''تو ہم انھیں مچھلی کی دعوت دے ڈالیں گے۔'' سیوج مزاح کی چاشنی بھرے لہجے میں بولا۔

تاہم چاروں سمت پھیلی ویرانی اور خاموشی نے انھیں کھلے عام مچھلیاں پکڑنے سے باز رکھا۔ چناں چہ انھوں نے ایسی جگہ تلاش کرلی جو جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ انھوں نے وہاں بیٹھ کر ماحول کا جائزہ لیا، ہر طرف بدستور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ان کا اعتماد بحال ہوا اور وہ دل جمعی سے مچھلیاں پکڑنے لگے۔

عرصے سے کوئی بنسی باز نہیں آیا تھا، اسی واسطے دریا میں مچھلیوں کی کثرت تھی۔ وہ وقفے وقفے سے مچھلیاں پکڑنے لگے۔ انھوں نے پہلے کبھی اتنی جلد ڈھیر سارا شکار نہیں پکڑا تھا۔

صبح کے بارہ بج گئے۔ شمسی شعاعیں ان کی کمر کو گرمائش پہنچانے لگیں۔ رفتہ رفتہ ان کا وجود خوشی و مسرت سے بھر گیا۔ انھیں اپنی من پسند تفریح واپس مل گئی جسے پانے کی خاطر وہ تڑپ رہے تھے۔

رفتہ رفتہ عالم بے خودی میں ان کی توجہ مچھلیاں پکڑنے پر مرکوز ہوگئی۔ وہ دنیا کو فراموش کر بیٹھے اور اپنے حال میں مست ہوئے۔ لیکن اچانک ایک زوردار دھماکے نے انھیں ہلا کر رکھ دیا اور وہ امن و محبت سے بھری اپنی دنیا سے نکل آئے۔

انھوں نے اردگرد نظر دوڑائی، دور ایک ٹیلے سے سفید دھواں اُٹھ رہا تھا۔ وہیں سے ایک جرمن توپ نے فرانسیسی فوج کی پوزیشنوں پر گولا پھینکا تھا۔ جلد ہی پے در پے دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اب جرمن توپیں تمام فرانسیسیوں کے گھروں پر بھی گرجنے برسنے لگیں۔

مونیور سیوج نے کاندھے اچکائے اور بولا ''وہ پھر شروع ہوگئے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ موریسوٹ بے چینی سے اپنی بنسی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس امن پسند شخص کا دل ان پاگلوں کے لیے غصے سے بھر گیا جو دیوانہ وار بم باری کررہے تھے۔ وہ تلخ لہجے میں بولا ''ایک دوسرے کو مارنے والے یہ انسان واقعی پاگل ہیں۔''

''جانوروں سے بھی بدتر!'' سیوج نے تبصرہ کیا۔

موریسوٹ بولا ''جب تک ہماری حکومتیں قائم ہیں، حالات یہی رہیں گے۔''

ہاں، اگر عوامی حکومت ہوتی، تو جنگ کی نوبت نہ آتی۔''

''مگر عوامی حکومت ہو، تو ہم پر خانہ جنگی نازل ہوتی ہے اور بادشاہ ہو، تو غیر ملکی جنگیں!''

وہ پھر امن پسند شہریوں کی طرح مبنی بر حقیقت گفتگو کرنے لگے۔ انھوں نے اتفاق کیا کہ وہ کبھی آزاد نہیں ہوسکتے۔ اس دوران جرمن توپوں کی بم باری جاری رہی۔ وہ انسانوں کی جانیں سرمہ بناتی رہیں، کئی حسین خواب مٹی میں جا ملے، اُمیدیں خاک اور خوشیاں شعلوں کی نذر ہوئیں۔ غیر ملکی ولیس میں انھوں نے ان گنت بیویوں، بیٹیوں اور ماؤں کو لامتناہی دکھ و اندوہ سے دوچار کردیا۔

مونیور سیوج آہ بھر کر بولا: ''یہی زندگی ہے۔''

موریسوٹ مسکرا کر کہنے لگا ''نہیں، یہ کہو، یہی موت ہے۔''

اسی لمحے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سن کر وہ ہڑبڑا گئے۔ گھوم کر دیکھا، تو چار لمبے چوڑے آدمیوں کو خود پر بندوقیں تانے پایا۔ دونوں دوستوں کے ہاتھوں سے بنسیاں چھوٹیں اور پانی میں گم ہوگئیں۔

چند منٹ میں جرمن فوجیوں نے ان کی مشکیں کسیں، اپنی کشتی میں پھینکا اور دریا پار پہنچ گئے۔ تب دونوں دوستوں پر منکشف ہوا کہ وہ جس گاؤں کو اجاڑ سمجھ رہے تھے، اس کی پشت پر جرمن پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ وہاں ایک دیوہیکل انسان آرام کرسی پر اطمینان سے بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ اسی نے انھیں شاندار فرانسیسی میں مخاطب کیا:

''ہاں دوستو! کتنی مچھلیاں پکڑلیں؟''

ایک جرمن فوجی مچھلیوں سے بھرا تھیلا اٹھانہیں [illegible] تھا۔ اب وہ اس نے اپنے کمانڈر کے قدموں میں ڈھیر کردیا۔ موٹا تازہ تھیلا دیکھ کر دیوہیکل آدمی مسکرایا اور بولا: ''تم نے شکار خوب کھیلا۔ لیکن میں تمھیں کچھ اور بھی بتانا چاہتا ہوں، خوفزدہ مت ہونا۔ میری نظروں میں تم جاسوس ہو جو ہماری جاسوسی کے لیے بھیجے گئے۔ تم مچھلیاں پکڑنے والوں کے بھیس میں یہاں آئے مگر ہمارے ہتھے چڑھ گئے۔ لہٰذا اب میں چاہوں تو، تمھیں گولی ماردوں۔ جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

''لیکن ایک بات تمھیں بچا سکتی ہے۔ فرانسیسی کمانڈر نے تمھیں آگے پیچھے جانے کی خاطر ایک پاس ورڈ بتایا ہوگا۔ وہ پاس ورڈ مجھے بتاؤ اور آزاد ہو جاؤ۔''

دونوں دوست چپ چاپ پہلو بہ پہلو کھڑے رہے۔ ان کا رنگ زرد اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

کمانڈر بات جاری رکھتے ہوئے بولا: ''کسی کو بھی کچھ پتا نہیں چلے گا۔ تم باحفاظت اپنے گھر پہنچ جاؤ گے اور یہ راز تمھارے ساتھ غائب ہوجائے گا۔ لیکن تم نے انکار کیا، تو خود کو مردہ سمجھو۔ اب انتخاب کرلو۔''

دونوں خاموش کھڑے رہے، لب بالکل نہیں ہلائے۔ جرمن افسر جلدی میں نہ تھا۔ اس نے دریا کی سمت اشارہ کیا اور پُرسکون لہجے میں بولا ''ذرا سوچو! محض پانچ منٹ بعد تم دریا کی تہ میں ہوگے، صرف پانچ منٹ میں!! مجھے یقین ہے، تمھارے بال بچے، تو ہوں گے؟''

جرمن توپیں مسلسل فرانسیسیوں پر گولے پھینک رہی تھیں۔ ان کی دھمک سے وقتاً فوقتاً زمین تھرا اٹھتی۔

دونوں دوستوں کے ہونٹ بدستور سلے رہے۔ یہ دیکھ کر افسر نے جرمن میں اپنے فوجیوں کو کچھ حکم دیا۔ پھر اس نے اپنی کرسی پیچھے کرلی تا کہ قیدیوں سے پرے ہٹ جائے۔ تب درجن فوجی ہاتھوں میں بندوقیں لیے

بڑھے اور صف بنا ایستادہ ہوگئے۔

دیوہیکل پھر دونوں دوستوں کی طرف مڑا اور گویا ہوا میں تمھیں سوچنے کے لیے ایک منٹ دیتا ہوں، ایک سیکنڈ کم نہ ایک زیادہ!

یہ کہہ کر اچانک وہ اُٹھا، دونوں فرانسیسیوں کے پاس پہنچا، مونیور موریسوٹ کو بازو سے پکڑا، کچھ دور لے گیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا جلدی سے پاس ورڈ بتاؤ۔ تمھارے دوست کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ میں نہ جاننے کی اداکاری کروں گا۔

موریسوٹ نے ایک لفظ نہ کہا۔

جرمن افسر یہ دیکھ کر مونیور سیوج کے قریب پہنچا، اُسے بھی کچھ دور لے گیا اور آہستہ آواز میں وہی سوال دہرایا۔

سیوج نے کوئی جواب نہ دیا۔

جلد ہی وہ پھر شانہ بہ شانہ کھڑے تھے۔

افسر نے حکم جاری کیا، فوجیوں نے بندوقیں سیدھی کرلیں۔ اسی لمحے موریسوٹ کی نگاہیں چند فٹ دور پڑے مچھلیوں والے تھیلے پہ جا پڑیں۔ چمکتی دھوپ میں مچھلیاں چاندی کے مانند دمک رہی تھیں۔ موریسوٹ کا دل بیٹھ گیا۔ ضبط کے باوجود آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

''خدا حافظ مونیور سیوج!''

''خدا حافظ مونیور موریسوٹ!'' جواب ملا۔

تب انھوں نے ہاتھ ملائے۔ ان کے بدن سر تا پاؤں لرز رہے تھے۔

کمانڈر چلایا ''فائر''

بارہ بندوقوں سے بیک وقت گولیاں برآمد ہوئیں۔ مونیور سیوج آن واحد میں منہ کے بل آگے گر پڑا۔

مونیور موریسوٹ کچھ لمبا تھا، وہ پہلے لہرایا پھر اپنے دوست کے پہلو میں گر پڑا۔ اس کے سینے سے ابلتے خون نے کوٹ کی رنگت سرخ کر ڈالی۔

افسر نے نئی ہدایات دیں۔ جرمن فوجی منتشر ہوگئے۔ کچھ دیر بعد وہ رسیاں اور پتھر اٹھائے نمودار ہوئے۔ پتھر دونوں دوستوں کے پیروں سے باندھ کر انھیں دریا کنارے تک گھسیٹا گیا۔

جرمن توپوں کی بم باری جاری تھی۔ بموں سے دھوئیں اور اٹھتے گرد و غبار نے پیرس کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

دو فوجیوں نے ڈنڈا ڈولی کے انداز میں موریسوٹ کو بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑا۔ سیوج کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھیں دریا کی نذر کردیا گیا۔

پانی میں چھپاکا ہوا، کچھ بلبلوں نے جنم لیا اور پھر سطح آب پر سکون چھا گیا۔ بس خون کے چند قطرے بیتنے والا ماجرا بیان کرتے رہ گئے۔

کمانڈر پر سارے عرصے اطمینان چھایا رہا تھا۔ وہ تلخ ہنسی ہنستے ہوئے مذاقاً بولا ''اب مچھلیوں کی باری ہے۔''

وہ پھر اپنے خیمے کی سمت چل پڑا۔ اچانک اس کی نظر مچھلیوں سے بھرے تھیلے پر پڑی جسے فراموش کیا جا چکا تھا۔ اس نے اُسے اٹھایا، دیکھا بھالا، مسکرایا اور پکارا:

''ولہم!''

سفید ایپرن میں ملبوس ایک جوان نمودار ہوا۔ کمانڈر نے اُسے دونوں دوستوں کا شکار تھمایا اور بولا: ''انھیں ابھی تل کر لاؤ۔ تازہ مچھلی کا ذائقہ لاجواب ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پائپ پیتا خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ ○○○

ایک تھا پنساری

ایک بھتیجے کی شرارتوں کا تذکرہ جسے علم کے دو بول سیکھنے سے دلیے کا پیالہ اور پنیر زیادہ اچھا لگا

خالدہ حسین

ایک تھا طالب علم۔ ایک مناسب سا طالب علم۔ وہ ایک بوسیدہ تاریک چوبارے میں رہتا تھا۔ وہ ایک مفلوک الحال طالب علم تھا۔

وہیں ایک پنساری بھی رہتا تھا۔ ایک مناسب پنساری۔ وہ مکان کی نچلی منزل میں رہا کرتا تھا۔ دراصل وہ سارے مکان کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ایک شریر ناٹے قد کے بھوت نے بھی ساتھ رہنے کا انتخاب کیا (وہ بھوت تھا یا بھتنا؟)

اسے ہر کرسمس کے موقع پر دلیے کا ایک پیالہ دیا جاتا جس میں مکھن کا بڑا سا ڈلا بھی ہوتا تھا۔

ناٹے قد کا بھتنا پنساری کی دکان میں رہتا تھا۔ ایک شام وہ طالب علم پچھلے دروازے سے چند موم بتیاں اور پنیر خریدنے کے لیے آیا۔ اس نے جلدی جلدی موم بتیاں اور پنیر خریدا۔ پنساری اور اس کی بیوی نے اسے ''شام بخیر'' کہا۔

پنساری کی بیوی سر ہلانے کے علاوہ بہت کچھ کرسکتی تھی۔ یعنی وہ باتونی تھی۔ ہر وقت باتیں، باتیں اور باتیں۔ اسے گپیں مارنے میں کمال حاصل تھا۔ بہرحال طالب علم نے جواباً اپنا سر ہلایا اور اخبار کا ایک پرزہ پڑھنے لگا۔

دراصل وہ اخبار کا پرزہ نہیں تھا، کسی پرانی کتاب کا پھٹا ہوا ورق تھا۔ وہ پرانی کتاب شاعری سے بھری ہوئی تھی۔ ''اس کتاب کا بقیہ حصہ میرے پاس موجود ہے اگر تمہیں اس کی ضرورت ہو......''

پنساری نے کہا۔ ''میں نے اس کتاب کے لیے ایک بوڑھی عورت کو کافی کے چند دانے دیے تھے۔ اگر تمہیں یہ کتاب پسند ہو تو میں تمہیں یہ بچی کھچی کتاب چھ پینی میں دے سکتا ہوں۔''

''شکریہ'' طالب علم نے کہا ''تم مجھے یہ کتاب پنیر کے بدلے دے دو۔''

پھر بھوت نے باتونی پن کا جادو کافی کپ پر ڈالا۔ کافی کپ بجنے لگا۔ پھر پنیر کا پیالہ بولنے لگا اور پھر گولک۔ تمام برتنوں نے ٹب کے خیالات کی حمایت کی۔

اس کے بعد بھتنا دبے قدموں اس چوبارے میں گیا جہاں طالب علم لیٹا ہوا تھا۔

کمرے کے اندر روشنی تھی۔ اس نے دروازے کے سوارخ سے جھانکا طالب علم پھٹی ہوئی کتاب کے اوراق پڑھ رہا تھا۔ اوہ! کمرے میں کس قدر چمک تھی۔

کتاب سے روشنی کی ایک شعاع پھوٹ رہی تھی۔

وہ کتاب بڑھتے بڑھتے درخت کا ایک تنا بن گئی۔

ایک تناور درخت جس کی شاخیں طالب علم پر پھیل رہی تھیں۔ ایک طرح کا سایہ کر رہی تھیں۔

درخت کی پتیاں تروتازہ اور سرسبز تھیں جس کا ہر پھول خوبصورت لڑکی کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ ان میں سے چند ایک لڑکیوں کی گہری پراسرار آنکھیں تھیں اور چند ایک کی نیلی نیلی چمک دار آنکھیں۔

درخت کا ہر پھل چمکتا دمکتا ستارہ تھا اور ہوا میں جیسے نقرئی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ بھتنے نے پہلے اس قسم کا حیرت کدہ نہ دیکھا تھا اور نہ سنا۔

وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ دیر تک وہ یونہی گھورتا رہا حتیٰ کہ روشنی بجھ گئی۔ طالب علم نے بتی بجھا دی تھی۔ وہ بستر پر عالمِ خواب میں چلا گیا مگر بھتنا دم بخود ساکت سا ہوگیا۔

نقرئی گھنٹیاں اس کے کانوں میں بازگشت کرتی رہیں۔ وہ بازگشت طالب علم کو لوریاں دیتی چلی گئی۔

شاید اس بھتنے کو بھی۔ ''یہ ناقابلِ یقین ہے۔ مجھے چوبارے میں طالب علم کے ساتھ رہنا چاہیے'' تب اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا:

''طالب علم نے دلیا نہیں کھایا۔''

''میں روکھی سوکھی روٹی سے گزارہ کرلوں گا۔''

''اچھا؟'' پنساری حیرت سے بولا۔

''تم ایک شاندار انسان ہو، ایک عملی انسان۔ تمہیں سامنے رکھے ہوئے ٹب اور شاعری کے درمیان کوئی فرق یا اندازہ نہیں۔''

طالب علم نے کہا۔ حالانکہ طالب علم کا یہ بات کہنا ناشائستہ تھا۔ خصوصاً ٹب والی بات۔

پنساری ہنسا شاید یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس نے طالب علم کی بات کا برا نہیں مانا لیکن ناٹے قد والے بھتنے کو طالب علم کی وہ بات بری لگی۔ آخر اس کو پنساری سے ایسی ناشائستہ بات کہنے کا کیا حق تھا جبکہ پنساری اس کا مالک تھا اور وہ کرایہ دار بھوت نے سوچا۔

اس کے نزدیک پنساری ایک اہم شخص تھا۔ مکان کا مالک اور بہترین معیار کا پنیر فروخت کرنے والا۔

اس رات جب پنساری کی دکان بند ہوگئی۔ سب سوگئے مگر طالب علم بستر پر جاگ رہا تھا۔ وہ بھتنا دبے قدموں اندر آیا۔ اس نے پنساری کی بیوی سے اس کا ''باتونی پن'' قرض لیا یعنی جب وہ شریر بھتنا کسی چیز کو بھی دیکھتا اس میں بولنے کی قوت پیدا ہوجاتی۔ اپنے خیال کے اظہار کے لیے ڈھیروں الفاظ مل جاتے۔

''تم نہیں جانتے کہ شاعری کیا ہے؟''

یہ تو اچھا ہوا کہ ایک وقت میں ایک ہی چیز باتونی بن جاتی (جو کہ ایک رحمت تھی) ورنہ قیامت سا ہنگامہ برپا ہوجاتا۔

سب سے پہلے بھتنے نے ٹب کو باتونی پن کی قوت بخشی۔ اس نے ٹب سے پوچھا

''تم نہیں جانتے کہ شاعری کیا ہے؟''

''بے شک جانتا ہوں'' ٹب بولا شاعری وہ چیز ہے جو کتاب کے ہر ورق میں لکھی ہوئی ہے۔''

''میرا خیال ہے مجھ میں طالب علم سے زیادہ شاعری موجود ہے مگر میں ایک عاجز ٹب ہوں پنساری کے مقابل۔'' بھتنا نیچے گیا۔ ٹب کی باتونی پن کی قوت ختم ہوچکی تھی۔

ٹب کا باتوں سے جی ابھی نہیں بھرا تھا کہ بھتنے نے اس کا باتونی پن پنساری کی بیوی کو واپس کردیا۔

جب کبھی پنساری کھیلوں اور کتابوں پر تبصرہ کیا کرتا تو دکان کی سبھی چیزیں یہ سمجھتی تھیں کہ پنساری کے سارے خیالات ٹب کے خیالات ہیں جنھیں وہ دہرائے

سفید جھوٹ

جھوٹ کی ایک قسم سفید جھوٹ ہے اور یہ جھوٹ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی بہت بڑی مصیبت میں پھنس جائے۔ ایسے موقع پر اس جھوٹ کا استعمال کر کے سچ کو توڑ مروڑ کر پیش کر دیا جاتا ہے اور خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے اکثر یہ کہا جاتا ہے ''یہ کام میں نے نہیں کیا۔'' یہ عادت بچپن سے انسان کی فطرت میں شامل ہو جاتی ہے لیکن اگر اس عادت پر جلدی قابو نہ پایا جائے تو عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ عادت پختہ ہوجاتی ہے۔ (انتخاب: اشتیاق مہر، اوکاڑہ)

جاتا ہے۔

ناٹے قد کا بھتنا ایک بار پھر چوبارے میں گیا اور دروازے کے سوراخ سے اندر جھانکنے لگا۔ کمرے کے اندر جھانکتے ہی اسے ایک ناقابل بیان شاہانہ پن کا احساس ہوا۔ ایسا شاہانہ پن جس میں تلاطم خیز سمندر کا منظر تھا جیسے کوئی خدائی طاقت اس تلاطم خیزی میں جھولنا چاہتی ہو۔

کیسی حیرت انگیز بات ہوتی اگر وہ اس طالب علم کے ساتھ اس حیرت انگیز درخت کے نیچے ہوتا مگر ایسا تو کبھی نہ ہوسکتا تھا۔

وہ بھتنا ہر رات اس دروازے کے سوراخ سے اندر جھانکتا حتیٰ کہ سرما کی ہوائیں اُسے منجمد سا کر دیتیں۔

پھر روشنی چوبارے سے غائب ہوجاتی۔ موسیقی ہوا کی غراہٹ میں معدوم ہوجاتی۔ اسے سردی کا احساس ہوتا اور وہ واپس جا کر دکان کے کسی گرم گوشے میں سونے کی کوشش کرتا۔

وہ تصور ہی تصور میں خود کو دلیے کا پیالہ ہاتھ میں لیے محسوس کرتا۔ پنیر کے موٹے ڈلے سمیت۔ ایک رات کے آخری پہر وہ بھتنا ایک خوفناک قسم کے شوروہنگامے کے باعث جاگ اٹھا۔

لوگ اپنی دکانوں کے کواڑ بجارہے تھے۔ رات کا پہرے دار سیٹیاں بجا رہا تھا۔ کہیں آگ لگی ہوئی تھی۔

کون سا گھر جل رہا تھا؟ یہ گھر یا وہ گھر؟

آگ کہاں لگی ہوئی تھی؟ وہ چیخیں کیسی تھیں۔

خوف وہراس پھیلا ہوا تھا۔

پنساری کی بیوی نے اپنی سونے کی بالیاں کانوں سے اُتاریں اور انھیں کسی محفوظ جگہ رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ پنساری کو اپنے اہم اقرار نامے کے کاغذ بچانے کی فکر تھی۔ کسی خادمہ نے اپنے ریشمی رومال کو جیسے کہیں چھپانے کی کوشش کی جیسے آگ کوئی بہت بڑی ڈاکو تھی۔

ہر کوئی اسی بھگدڑ میں اپنی قیمتی اشیا بچانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔

بھتنے نے بھی غالباً اسی قسم کی کوشش کی۔ اس نے ایک دو چھلانگیں ماریں۔ پہلے سیڑھیوں پر چھلانگ پھر دوسری چھلانگ طالب علم کے کمرے کے قریب۔

مگر طالب علم تو کھلی کھڑکی کے قریب اطمینان بھرے انداز میں کھڑا تھا یعنی وہ کہیں دور لگی آگ کو بے نیازی سے دیکھ رہا تھا۔

چپکے چپکے بھتنے نے طالب علم کی میز سے اس کی وہ خاص کتاب اُٹھالی، اپنی لمبوتری عنابی ٹوپی میں رکھا اور پھر اس کتاب کو اپنے دونوں بازوؤں سے بھینچا۔ اس نے سوچا کہ اس نے اس مکان کی سب سے قیمتی چیز بچالی۔ وہ چھت پر بھاگا پھر وہ چمنی والے بھوسے پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے عنابی ٹوپی کو زور سے کھینچ رکھا تھا جیسے اس کے اندر کوئی قیمتی خزانہ ہو۔ جب آگ بجھا دی گئی تو بھتنے نے اطمینان بھرے انداز میں سوچا اس کا دل کس جگہ اٹکا ہوا ہے......؟ طالب علم کے پاس یا پنساری کے پاس؟ اس نے کہا ”میں پنساری کو نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ وہ مجھے مزیدار دلیا کھلاتا ہے۔“ اس نے انسانوں کی طرح سوچا ”مجھے پنساری کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے مجھے اپنی بھتنے پَن کی شرارتیں ختم کرنا ہوں گی۔ طالب علم کی کتاب واپس کرنی ہوگی۔ علم کے دو بول سیکھنے سے بہرحال دلیے کا پیالہ زیادہ اچھا ہے اور ہاں اس کا پنیر بھی......“

○○○

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ تمیا کلوروف دروازہ کھول کر فلیٹ میں داخل ہوا۔ چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی سارے کمروں میں طوفان کے مانند بھاگنے دوڑنے لگا۔

تمیا کے والدین بستروں پر دراز تھے۔ چھوٹی بہن لیٹی ناول کا آخری ورق پڑھ رہی تھی۔ چھوٹے بھائی بھی سونے لیٹ چکے تھے۔ ماں باپ نے بڑے بیٹے کو بے چینی سے اِدھر اُدھر دوڑتے دیکھا، تو حیران پریشان ہوگئے۔ پھر چلا کر بولے "ارے کیا ہوا؟ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟ اور کل سے کہاں غائب تھے؟"

"اف، مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ میرے ساتھ یہ ہوگا۔ اف، میرے وہم و گمان میں نہ تھا۔ اب میں کیا بتاؤں......"

یہ کہتے ہوئے تمیا ہنسنے لگا اور آرام کرسی پر ڈھے گیا۔ وہ خوشی کے مارے اتنا بے دم ہو چکا تھا کہ ٹانگوں پر کھڑا نہ رہ سکا۔

"آج تو کرشمہ ہی ہوگیا...... ناقابل یقین!"

تمیا کی بہن اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر رضائی لپیٹی، بستر سے اٹھی اور بھائی کے پاس چلی آئی۔ اُسی دوران اس کے چھوٹے بھائی بھی جاگ گئے۔

ارے بات تو بتاؤ" تم اپنے حواسوں میں نظر نہیں آتے۔"

"اس لیے امی، کہ میں بہت خوش ہوں۔ آپ جانتی ہیں، اب سارا روس میرے نام سے واقف ہو چکا...... سارا روس! کل شام تک صرف آپ ہی ایک کلرک، تمیا کلوروف سے واقف تھا۔ آج پوری قوم مجھے جان چکی امی! اوہ میرے خدا!"

وہ پھر اچھل کر کھڑا ہوا اور خوشی سے ناچنے لگا۔ پھر دوڑ کر کمروں کا چکر لگایا اور کرسی پر آ بیٹھا۔

ارے ہوا کیا ہے، ہمیں بھی تو کچھ بتاؤ۔" تمیا کے والد

روسی کہانی

خوشی

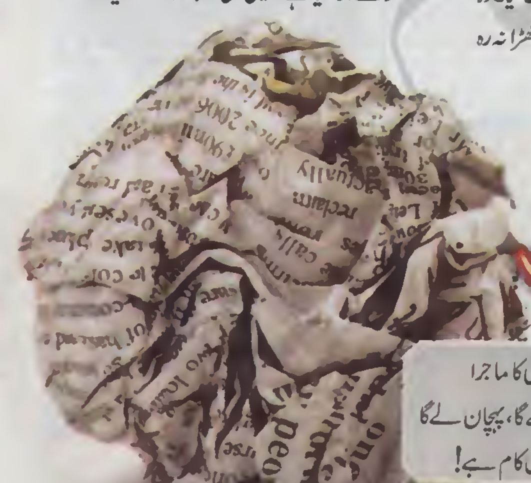

ایک کلرک کو ملنے والی انوکھی خوشی کا ماجرا

سے ملتا تھا کل سارا روس اسے جان لے گا، پہچان لے گا

انسانی نفسیات کو جاننا کوئی آسان کام ہے!

انطون چیخوف

"آپ سب تو نرے جاہل ہیں، اخبار ہی نہیں پڑھتے! ارے اخبار پڑھا کریں، اس میں کام کی کئی باتیں ہوتی ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی واقعہ ہو، تو اس کے متعلق سب کچھ چھپ جاتا ہے۔ کوئی بات چھپائی نہیں جاتی۔ اف آپ سوچ نہیں سکتے کہ میں کتنا خوش ہوں۔ اوہ میرے خدا! ارے اخباروں میں صرف مشہور لوگوں کی خبریں چھپتی ہیں اور اب انھوں نے میرا نام بھی چھاپ کر مجھے مشہور کر دیا۔"

"تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو، صاف بات بتاؤ؟"

بابا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ امی نے یسوع مسیح کے مجسمے پر نظر ڈالی اور سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ چھوٹے بھائیوں نے بستروں سے چھلانگ لگائی اور نیکر ہی میں بھائی کے پاس چلے آئے۔

"بھئی اخبار میں میرا نام بھی چھپ چکا۔ اب سارا روس مجھے جانتا پہچانتا ہے۔ امی! یہ یادگار موقع ہے، اخبار سنبھال کر رکھیے گا۔ کبھی کبھی مزے سے پڑھا کریں گے۔"

یہ کہہ کر متیا نے جیب سے تہ شدہ اخبار نکالا، اُسے کھولا اور باپ کے حوالے کرتے ہوئے اس خبر کی طرف اشارہ کیا جس پر نیلے قلم سے نشان لگا تھا۔

"پڑھیے۔" باپ نے نظر کی عینک پہن لی۔

"بلند آواز سے پڑھیے۔"

امی نے پھر یسوع مسیح کی طرف دیکھا اور عالم پریشانی میں سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ بابا نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پڑھنے لگا: "29 دسمبر کی رات گیارہ بجے متیا کلوروف نامی ایک رجسٹریشن کلرک......

"دیکھا، دیکھا، میرا نام ہے نا، آگے پڑھیے۔"

"متیا کلوروف نامی ایک رجسٹریشن کلرک کوزین بلڈنگ میں واقع ایک شراب خانے سے باہر نکلا۔ تب وہ نشے سے مدہوش تھا......"

بیٹا پھر بات کاٹ کے گویا ہوا" میرے ساتھ سیمون بستر وچ بھی تھا۔ خبر میں ہر بات واضح ہے۔ آگے پڑھیے۔"

"جب وہ سڑک پر پہنچا، تو اچانک پھسل گیا۔ تب دور یکینو نامی گاؤں سے تعلق رکھنے والا ایک کسان اپنی گھوڑا گاڑی چلا رہا تھا۔ گھوڑے نے جیسے ہی ایک انسان کو اپنی راہ پر گرا پایا، تو خوفزدہ ہو گیا۔ گاڑی بان، آئیون دروتوف نے اُسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ گر کے نوجوان پر جا چڑھا۔

"گاڑی توازن برقرار نہ رکھ سکی اور پہلو میں جا گری۔ اسی میں ماسکو کا ایک تاجر، سٹیفن لوکوف سوار تھا جسے راہ گیروں نے بچا لیا۔ کلوروف کو بے ہوشی کی حالت میں پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔ وہیں ایک ڈاکٹر آ پہنچا جس نے اس کا معاینہ کیا۔ اُسے سر پر چوٹ لگی تھی......"

ابو! یہ گاڑی کی کمانی لگنے سے آئی تھی۔ باقی خبر پڑھیے۔"

"ڈاکٹر نے سر کا معاینہ کرنے کے بعد بتایا کہ چوٹ زیادہ شدید نہیں۔ بہرحال واقعے کا اندراج ہوا۔ مضروب کو ابتدائی طبی امداد دی گئی۔"

متیا بولا" میرے سر پر روغن کی مالش کر کے بتایا گیا کہ ہلدی کا لیپ کرنا۔ آپ خبر پڑھ چکے۔ دیکھا، سارے روس میں میرا نام پھیل چکا۔ یہ اخبار مجھے پکڑائیے۔"

اس نے اخبار تھام کر پھر تہ کیا جیب میں رکھا اور اٹھتے ہوئے بولا" ابھی یہ خبر مجھے شولوکوف کو دکھانی ہے۔ نتاشا کو بھی دکھاؤں گا۔ پھر مطبوف بھی باقی ہے...... اچھا میں چلتا ہوں۔

متیا نے ٹوپی پہنی اور بڑے خوش باش اور فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

(ترجمہ: سید عاصم محمود)

گلابی ربن

بلند سماجی رتبہ پالینے والے ایک نوجوان افسر کا معصومانہ ماجرا

پنسل گھمانے اور بجانے کا فن
اُس نے خوب سیکھ لیا تھا

عمار مسعود

انٹرویو کے لیے جب وہ شہر سے کچھ دور ایک بیابان میں بڑی سی سنسان عمارت کے چھوٹے سے دروازے پر پہنچا، تو ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ شاید وہ کسی غلط پتے پر آگیا ہے۔ عمارت پر کوئی بورڈ نصب تھا نہ ہی کوئی کال بیل(CALL BELL) لگی تھی۔ دروازے پر کوئی دربان تھا اور نہ ہی دور دور تک کسی ذی روح کا نشان ملتا تھا۔ پارکنگ میں کوئی گاڑی یا موٹرسائیکل بھی نہیں کھڑی تھی۔ ٹیکسی والا اس کو چھوڑ کر جاچکا تھا۔ موٹرسائیکل وہ اس لیے نہیں لایا تھا کہ شادی کا سُوٹ جو اس نے زیب تن کیا تھا وہ شہر کے گرد وغبار میں میلا ہوسکتا تھا۔ اس کا یہ سوٹ اتنی دفعہ استری ہوچکا تھا کہ اب اس میں ایک عجیب سی چمک آگئی تھی۔ اس کے بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ برل کریم کی شیشی اُس نے اِسی دن کے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ بوٹ اگرچہ پرانے تھے مگر رگڑ رگڑ کر پالش کرنے سے خوب چمک رہے تھے۔ وہ پرفیوم جو مدتوں پہلے اسے بیوی نے دیا تھا وہ بھی آج اس نے خوب فراخ دلی سے اپنے کپڑوں پر چھڑکا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک نئی فائل پکڑی ہوئی تھی جس میں اس کی ذاتی دستاویزات، ایم اے میں گولڈ میڈل کی اعزازی سند، بائیوڈیٹا اور غیر نصابی سرگرمیوں کے سرٹیفکیٹس سلیقے سے لگے ہوئے تھے۔ فائل کے باہر سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی تتلی بنی ہوئی تھی۔ جسے اس کی چھوٹی بیٹی نے بنایا تھا۔ یہ اس کی وہی بیٹی تھی جسے گلابی رنگ کے ربن پہننے کا بہت شوق تھا۔ وہ انٹرویو

کے لیے پوری طرح تیار تھا بلکہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اس سنسان جگہ پر اکیلا ایک ویران عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔

ایک دفعہ تو اس نے دل میں سوچا کہ وہ واپس چلا جائے شاید کسی نے مذاق کیا ہے یا پھر اسے ہی کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ پھر جانے کیا سوچ کر اس نے سنسان عمارت کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ وہ پہلے تو جھجکا پھر حوصلہ کر کے اندر داخل ہوگیا۔ اس کے سامنے پرتعیش سامان سے سجا ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ چاروں طرف شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں اور شیشے ہی کی دیواریں تھیں۔ کمرے کے عین درمیان ایک کرسی دھری تھی۔ سامنے شیشے کی دیوار پر ایک بڑھیا اسکرین لگی ہوئی تھی۔ مگر اس کمرے میں کسی انسان کا وجود نہیں تھا۔ اچانک سامنے اسکرین پر کچھ حروف نمودار ہوئے۔ اس نے آنکھیں جھپک جھپک کر بار بار وہ لفظ پڑھے۔ صاف صاف لکھا تھا ''مسٹر فلک مراد، آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔ مہربانی فرما کر اپنی باری کا انتظار کریں۔'' حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ کیا طریقہ ہوا؟ یہ کس طرح کا انٹرویو ہے؟ یہ تحریر کس کی ہے؟ کون اسے دیکھ رہا ہے؟ اس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا مگر شیشے کی ان دیواروں میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سکرین پر لکھی تحریر بجھ گئی اور چند لمحوں کے بعد ایک اور تحریر نمودار ہوئی۔ '' اگر آپ پسند کریں تو کمرے میں موجود کیتلی کی مدد سے چائے بنا کر نوش کر سکتے ہیں،،ہم انتظار کی زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں'' اس نے دائیں طرف دیکھا، تو ایک کونے میں تھرماس رکھا تھا جس پر ہاٹ واٹر لکھا تھا۔ ساتھ ہی ٹی بیگز، خشک دودھ اور چینی دان پڑا تھا۔ وہ کسی معمول کی طرح اٹھا اور اپنے لیے چائے بنانے لگا۔

اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ شاید اس کے ساتھ کوئی مذاق کیا جا رہا ہو یا پھر یہ کسی حساس ادارے کا دفتر ہے۔ یا ہو سکتا ہے کوئی بڑی ملٹی نیشنل کمپنی ہو جس نے امیدواروں کی قابلیت کو جانچنے کا کوئی انوکھا طریقہ وضع کیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ چائے ختم کر کے نہایت آہستگی سے اٹھا اور خاموشی سے جا کر کپ میز پر رکھ دیا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ ذرا سی آہٹ بھی جادو کے اس منظر کو توڑ دے گی۔ اسے مسلسل یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کی جا رہی ہے۔ اس نے بار بار کن انکھیوں سے کمرے کی دیواروں کو دیکھا کہ کہیں کوئی سوراخ یا کیمرا نظر آ جائے مگر شیشے کی سب دیواریں سپاٹ تھیں۔ جانے کیوں ایک خوف سا اس کی رگوں میں سرایت کرنے لگا۔ کبھی وہ سوچتا کہ شاید انگلش فلموں کے کمرۂ تفتیش کی طرح کچھ لوگ دیوار کے پیچھے کھڑے اسے مسلسل دیکھ رہے ہیں۔ اس نے خود کو کچھ حوصلہ دیا اور سنبھل کر اپنی فائل دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی چیز بے ترتیب ہو تو انٹرویو سے پہلے درست کر لے۔ مگر فائل میں سب کاغذات نہایت سلیقے سے لگے ہوئے تھے۔ اس فائل میں ترتیب اس نے اور اس کی بیوی نے تین دن لگا کر کی تھی، غلطی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اسکرین پر'' ہم انتظار کی زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں'' کے الفاظ بدستور جگمگا رہے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ اس سحر زدہ ماحول کو چھوڑ کر بھاگ جائے۔ مگر ہر بار اس کے سامنے اپنی بیوی اور دو بچیوں کے چہرے

آجاتے جن کی آج کے انٹرویو سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ نوکری مل جانے پر اس نے اپنی بیوی کو پہلی تنخواہ سے سونے کے بُندے لاکر دینا تھے۔ بڑی بیٹی کو تصویروں والی کتابیں اور چھوٹی کے لیے ڈھیر سارے گلابی ربن لانے کا وعدہ پورا کرنا تھا۔ گولڈ میڈل کے اس ٹھیکرے کو سنبھالتے ہوئے اب وہ تھک چکا تھا۔ ایم اے میں اوّل آنے کے باوجود ٹیوشنز پڑھا پڑھا کر اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ نوکری کرنا چاہتا تھا۔ یونیورسٹی کے عرصے میں دیکھے ہوئے سب خواب پورے کرنا چاہتا تھا۔ مسلسل تین سال تک ہر نوکری کے لیے درخواست دینا، انٹرویو کا انتظار کرنا اور پھر انکار سننا ایک طویل اور صبر آزما دور تھا۔ اب وہ بیکاری کے اس دورانیے کا ہر قیمت پر اختتام چاہتا تھا۔ اسکرین پر ابھی تک وہی الفاظ روشن تھے۔ اس نے اپنے ذہن کو مصروف رکھنے کے لیے اس اشتہار کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں اسے آج یہاں انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔

آج سے ٹھیک ایک ماہ پہلے ملک کے تمام بڑے اخبارات میں اس طرح کا اشتہار چھپا تھا۔ ''درخواستیں مطلوب ہیں۔ ایسے تمام نوجوان جنھوں نے کسی مستند یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری میں اوّل پوزیشن حاصل کی ہو، ان کے لیے روزگار کے پُرکشش مواقع۔ دلچسپی رکھنے والے خواتین و حضرات اپنے کاغذات مع تصدیق شدہ اسناد اور پاسپورٹ سائز تصاویر کے درج ذیل پتے پر جلد از جلد ارسال کریں۔'' سارے اشتہار میں کام کی نوعیت کا ذکر تھا، نہ تجربے کی مدت کے بارے میں کچھ لکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اہلیت کی شرط صرف گولڈ میڈل ہے۔ وہ خود کو اس ملازمت کے لیے بہت اہل سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ اس کے پاس معاشیات میں گولڈ میڈل اور تین سالہ ناکام انٹرویوز کے تجربے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چھوٹی عمر میں کی گئی شادی کا نتیجہ اب تک دو بچیوں کی صورت میں نکل چکا تھا۔ اس کی بیوی اسکول میں پڑھاتی تھی اور وہ تین سال سے ہر روز نوکری کے لیے درخواستیں لکھتا، انہیں اٹیسٹ کرواتا اور پاسپورٹ سائز تصویریں بنواتے بیروزگاری کے دن کاٹ رہا تھا۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک سامنے اسکرین پر عبارت تبدیل ہوگئی۔ ''آپ کے انٹرویو کا وقت ہوگیا ہے براہِ مہربانی تشریف لائیے۔'' اس کے ساتھ ہی دائیں ہاتھ پر شیشے کی دیوار خودکار طریقے سے کھسک گئی۔ سامنے ایک اور کمرا تھا جس میں ایک کرسی، میز اور مائیک دھرا تھا۔ وہ گھبرایا سا اس کمرے میں داخل ہوا، تو اس کے عقب میں موجود شیشے کی دیوار اپنی جگہ پر واپس آگئی۔ وہ پھر سے ایک تنگ کمرے میں اکیلا کھڑا تھا۔ ''پلیز سٹ ڈاؤن۔'' اچانک کہیں اوپر سے آواز آئی۔ اس سنسان عمارت میں پہلی مرتبہ کسی انسانی آواز کو سن کر وہ ہڑبڑا سا گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، تو کوئی نہیں تھا۔ پھر آواز آئی۔ ''پلیز سٹ ڈاؤن۔'' اس بار بولنے والے کے لہجے میں تحکم بڑا نمایاں تھا۔ وہ جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے رکھے مائیک کی سرخ لائٹ خود بخود آن ہوگئی۔ نادیدہ شخص کی آواز آئی۔ ''نام''۔ وہ پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ''آپ کا نام'' آواز پھر گونجی۔ وہ مائیک کے قریب ہوکر بولا ''فلک مراد سر۔''

''تعلیم؟'' اگلا سوال ہوا۔ ''ایم اے معاشیات سر...... گولڈ میڈلسٹ۔'' اس نے اپنے سارے پتے

پہلے ہی ہاتھ میں دکھا دیے۔ ''کیا کرنا چاہتے ہو۔'' آواز پھر سے گونجی۔ ملک کی خدمت سے لے کر معاشیات میں ریسرچ تک ہر چیز اس کے ذہن میں آنے لگی مگر وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ''ملازمت سر۔'' دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ وہ اپنے جواب پر پچھتانے لگا۔ اس شخص کی آواز پھر آئی ''کوئی تجربہ؟'' اب تک وہ سنبھل چکا تھا۔ انتہائی سچائی سے بولا ''سر تین سال ہوگئے ایم اے کیے ہوئے ہر جگہ اپلائی کیا مگر......'' بھاری سی آواز نے اگلے سوال سے اس کے جواب کا گلا گھونٹ دیا۔ ''بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر کتنا کما لیتے ہو؟'' ٹیوشنوں کا ذکر تو اس نے کسی بھی کاغذ میں نہیں کیا۔ اس لمحے اس پر منکشف ہوا کہ وہ نادیدہ شخص اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔

''سر بس گزارا ہو جاتا ہے۔'' فلک مراد نے تھکے سے لہجے میں جواب دیا۔ ''کتنے پیسے چاہئیں؟'' سوال ہوا۔ وہ دل ہی دل میں حساب کرنے لگا۔ بجلی کا بل پندرہ سو، گیس کا بل کبھی نو سو کبھی دو ہزار، فون کا کارڈ، موٹر سائیکل کا پٹرول، بچیوں کی تعلیم، اس کے حساب کتاب سے پہلے ہی حکم صادر ہوا ''ایک لاکھ روپیہ، گاڑی اور مکان قبول ہے۔'' اس کا دل بلیّوں اچھلنے لگا یہ رقم اور مراعات، تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی تھیں۔ اس کے ماتھے پر پسینا آنے لگا۔ اس کے منہ سے صرف یہ نکلا ''جی سر! بہت کافی ہیں۔'' بھاری بھرکم آواز میں پھر کوئی بولا '' تمہارا انتخاب ہوگیا ہے۔ ملازمت کی شرائط میں سب سے اہم یہ ہے کہ تم اپنے دفتری معاملات کو مکمل طور پر صیغہ راز میں رکھو گے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے بولا ''سر! آپ مجھ پر اعتماد کرسکتے ہیں۔''

''اگر تمہیں یہ تنخواہ اور مراعات قبول ہیں، تو میز پر پڑے کاغذ پر دستخط کردو۔'' حتمی انداز میں حکم ملا۔ اس نے کاغذ کو پلٹ کر دیکھا، تو اس پر ملازمت کی شرائط، نئے مکان کا پتا اور گاڑی کا نمبر اس کے نام اور تمام تفصیلات کے ساتھ درج تھے۔ اس نے جلدی سے دستخط کیے اور تیزی سے باہر نکلنا چاہا۔ آواز پھر گونجی'' ملازمت مبارک ہو، تم ایک ذہین نوجوان ہو۔'' وہ شکریہ ادا کرتے کرتے پسینے سے شرابور گھر پہنچا۔ اس کی حالت دیکھ کر بیوی نے سمجھا کہ شاید آج پھر اس کی ڈگری پر ناکامی کی مہر لگا دی گئی ہے۔ بچیاں بھی اس کا موڈ دیکھ کر سہم گئیں۔ وہ سر درد کا بہانہ کرکے بستر پر جا لیٹا۔ وہ کسی سے کیا بات کرتا۔ سب کچھ بھونڈا سا مذاق لگتا تھا۔ اس نے انٹرویو کے احوال کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہا۔ مگر اگلے دن جب کوریئر کے ذریعے اسے اپوائنٹ منٹ لیٹر مل گیا، تو بیوی بچے اس سرپرائز پر بہت خوش ہوئے۔ دو ہی دن میں وہ ایک نئے گھر میں شفٹ ہوگئے۔ اُس نے گاڑی چلانا بھی سیکھ لی۔ مگر اب تک اس کو یہ سب خواب سا لگ رہا تھا۔

پہلے دن جب وہ ملازمت پر گیا، تو اس ویران بلڈنگ میں بے دھڑک داخل ہوگیا۔ سامنے ایک نیا کمرا سجا تھا۔ جس کے باہر اس کے نام کی نیم پلیٹ لگی تھی۔ فلک مراد۔ ایم اے معاشیات۔ گولڈ میڈلسٹ۔ ایک عالی شان دفتر اس کا منتظر تھا۔ دفتر میں وہ سب کچھ تھا جس کا وہ خواب دیکھ سکتا تھی۔ مگر آج بھی کوئی ذی روح اس عمارت میں نہیں تھا۔ وہ تنہا گولڈ میڈلسٹ کی نیم پلیٹ سجائے اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھایا، تو اسی نادیدہ شخص کی آواز کمرے میں گونجی ''تم فون کرسکتے ہو نہ سن سکتے ہو۔''

''کیوں؟'' وہ حیرت سے بولا ''لوگوں سے رابطہ رکھنا تمہارے لیے مناسب نہیں۔ تم چپ چاپ اپنا کام کرو۔'' وہی آواز پھر سے کمرے میں گونجی ''کیا کام کروں؟'' اس کے لہجے میں اب حیرت بڑھ گئی تھی ''ملازمت'' جواب آیا۔ اس بار اس آواز میں ایسی سختی تھی کہ اس نے مزید کوئی سوال کرنا مناسب نہ جانا۔ لیکن اس کو بالکل سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ گاڑی، گھر، عالی شان دفتر اور کوئی کام نہیں!۔ اس نے چھت کی جانب دیکھ کر سوال کیا ''میں چائے پی سکتا ہوں۔''

''کیوں نہیں۔'' وہ نا سمجھنے والے انداز میں اٹھا اور چائے بنانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ تو کسی سے رابطہ ہوسکتا ہے، نہ کسی انسان کا ادھر سے گزر ہے۔ نہ دفتر میں کسی اور کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ وہ آخر یہاں کیا کرے؟ وقت کیسے گزارے؟ چائے پینے کے بعد اس نے میز کی درازیں کھولیں تو وہاں بہت سی تراشی ہوئی پنسلیں پڑی تھیں۔ لیکن پورے دفتر میں کاغذ کا ایک بھی ٹکڑا نہیں تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لوگوں سے ملے، باتیں کرے، کام کرے مگر سب راستے مسدود تھے۔ وہ کبھی کرسی پر بیٹھ جاتا، تو کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ دوپہر کو اس نے پوچھا '' میں لنچ پر جا سکتا ہوں؟''

''نہیں! لنچ تمہیں یہیں ملے گا۔'' مختصر مگر فیصلہ کن جواب دیا گیا۔ ایک بجے کے قریب دیوار میں بنی کھڑکی سے مرغن کھانے سے بھری ایک ٹرے اس کے سامنے آگئی۔ اس نے کھانا خوب سیر ہو کر کھایا اور پھر کچھ دیر بعد وہ کرسی پر سو گیا۔ پھر اٹھا اور چائے بنائی۔ باتھ روم گیا۔ منہ دھویا اور پھر سو گیا۔ کبھی وہ کرسی پر بیٹھا پنسل سے میز بجانے لگتا۔ اس کام میں اسے عجیب طرح کی لذت محسوس ہوئی۔ پنسل کی آواز سے ایک طرح کا ترنم پیدا ہونے لگا۔ وہ دیر تک پنسل کی مدد سے میز پر دھنیں بجاتا رہا۔ پانچ بجتے ہی وہ آواز پھر آئی ''اب تم جاؤ آج کا کام ختم۔'' وہ گھر آیا تو کھویا کھویا تھا۔ مگر جب بیوی بچوں نے بہت اشتیاق سے پہلے دن کا حال پوچھا، تو جھوٹ موٹ سب کو بتانے لگا۔ آفس کے سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ بہت عزت کرتے ہیں۔ میرے باس نے مجھے اہم اسائنمنٹ دی ہے۔ وہ رات گئے تک سب سے جھوٹ بولتا رہا۔ مگر جواب دیتے اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ اس رات وہ ایک پل بھی نہ سو سکا۔

اگلے دن جب وہ ذرا تاخیر سے پہنچا، تو اس کے باس نے ناراض لہجے میں اس سے کہا ''وقت کی پابندی تم پر فرض ہے۔ تمہارے کام کا حرج ہو رہا ہے۔'' ''کام۔ کون سا کام؟'' اس نے اونچے لہجے میں کہا۔ باس خاموش رہا بہت دیر تک کوئی آواز نہ آئی۔ وہ خود ہی ڈر گیا کہیں اس کا باس اس سے ناراض ہی نہ ہو جائے۔ وہ سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گیا اور میز پر پنسل بجانے لگا۔ اس دن وہ نہایت دیانت داری سے صبح سے شام 5 بجے تک پنسل بجاتا رہا۔

شروع شروع میں وہ اپنے باس سے بہت سوال کرتا تھا کہ اس کے ساتھی ورکر کہاں ہیں؟ کام کب شروع ہوگا؟ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے؟ کچھ کرنا چاہتا ہے؟ مگر اس طرح کے ہر سوال کا اسے ہمیشہ یہی جواب ملتا رہا۔ ''تم اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو۔ بس اپنا کام کرتے رہو۔'' وہ پھر بے چارگی کے عالم میں پنسل بجانا شروع کردیتا۔ رفتہ رفتہ اس نے سوال کرنا چھوڑ دیے تھے۔ اب وہ ہر صبح نہایت

اہتمام سے اچھا لباس پہنتا، دفتر آتا اور دیر تک پنسل بجاتا تھا اور ٹھیک پانچ بجے دفتر سے چھٹی کرکے گھر روانہ ہوجاتا۔

اس کے گھر میں ملازمت کے بعد سے بہت تبدیلی آگئی تھی۔ وہ گھر پہنچ کر دیر تک سب کو دفتر والوں کے قصے سناتا تھا۔ نہایت تفصیل سے بتاتا کہ کس طرح اس کے اچھے کام کی وجہ سے کچھ لوگ اس سے جلنے لگے ہیں۔ اس کا باس کس طرح بہانے بہانے سے سب افسروں کے سامنے اس کی تعریف کرتا ہے۔ وہ سارا دن فائلوں میں غرق رہتا ہے۔ ایک میٹنگ کے بعد دوسری میٹنگ سے وہ بڑی ذہانت سے نمٹتا ہے۔ اب خوشحالی اس کے گھر میں قدم رکھ چکی تھی۔ نئے کارپٹ، نیا ٹی وی اور ڈی وی ڈی آگئے تھے۔ بیوی نے ملازمت چھوڑ کر ایک رفاہی ادارے کے ساتھ رضاکارانہ طور پر کام کرنا شروع کردیا تھا۔ اس کی سادہ لوح بیوی کو نئے سوٹ اور جیولری بنانے کا خبط ہوگیا تھا۔ بڑی بیٹی اب ایک انگریزی اسکول میں جاتی تھی۔ انگریزی بولتی اور نت نئی فرمائشیں کرتی تھی۔ چھوٹی بیٹی کو البتہ اب تک گلابی ربن پسند تھے۔ وہ اب بھی ان کے ڈھیر میں کھوئی رہتی تھی۔

اس کا سماجی رتبہ بہت بلند ہوگیا تھا۔ ملنے جلنے والے اب مختلف سفارشوں کے لیے ان کے گھر آنے لگے۔ حتیٰ کہ کچھ عزیز رشتے داروں نے قرض بھی مانگ لیا تھا۔ روزانہ صبح نو بجے اس کی انگلیاں تھرکنے لگتیں، پنسل اس کے ہاتھ میں مچلنے لگتی۔ چھٹی کا دن وہ بڑی مشکل سے کاٹتا تھا۔ گزشتہ ایک سال میں وہ اس زندگی کا عادی ہوچکا تھا۔ اس کے سوال اب تقریباً ختم ہوچکے تھے۔ ہاں البتہ ایک بار اسے اپنے باس کو ملنے کی آرزو ضرور تھی۔ گزشتہ سال میں ایک بار بھی اس کی تنخواہ لیٹ نہیں ہوئی تھی۔ اب اس کا ضمیر تنخواہ وصول کرتے ہوئے اسے کچوکے بھی نہیں لگاتا تھا۔

ملازمت کے ٹھیک ایک سال بعد جب اس کے باس نے اس کی بہترین کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے لیے ترقی اور نئی گاڑی کا اعلان کیا، تو ساتھ ہی کہا ”تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو، اپنے ساتھیوں کو دیکھنا چاہتے ہو۔“ اس نے دھڑکتے دل سے کہا ”یس سر!“ باس کچھ دیر خاموش رہا پھر اچانک اس کی پشت کی دیوار ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کے سامنے ایک زینہ تھا۔ وہ خوف اور حیرت سے لرزتے لرزتے زینہ چڑھ کر جب اوپر گیا، تو سامنے ایک بڑا ہال تھا۔ دیواروں پر سیکڑوں چھوٹی چھوٹی ٹی وی سکرینز لگی ہوئی تھیں۔ ہر اسکرین پر ایک نوجوان گولڈ میڈلسٹ کی تختی لگائے میز پر پنسل بجا رہا تھا۔ ساری فضا پنسلوں کے شور سے گونج رہی تھی۔ باس کی آواز فضا میں گونجی ”حکومت نے ملک کے قابل ترین نوجوانوں کو اہم قومی امور کا فیصلہ کرنے کی تربیت کا پہلا سال کامیابی سے مکمل کرلیا ہے۔“

ایک لمحے کے لیے اسے اس نادیدہ آواز اور اپنے آپ سے شدید نفرت کا احساس ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ سامنے رکھے تمام ٹی وی توڑ دے۔ مگر پھر اچانک ایک اسکرین پر اس کی چھوٹی بیٹی کا چہرہ ابھرا جس نے گلابی ربن لگائے ہوئے تھے۔ چھوٹی سی اسکرین بڑی ہوتے ہوتے سارے ہال میں پھیل گئی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر ہاتھ میں پکڑی پنسل کو زور زور سے میز پر بجانے لگا۔

ooo

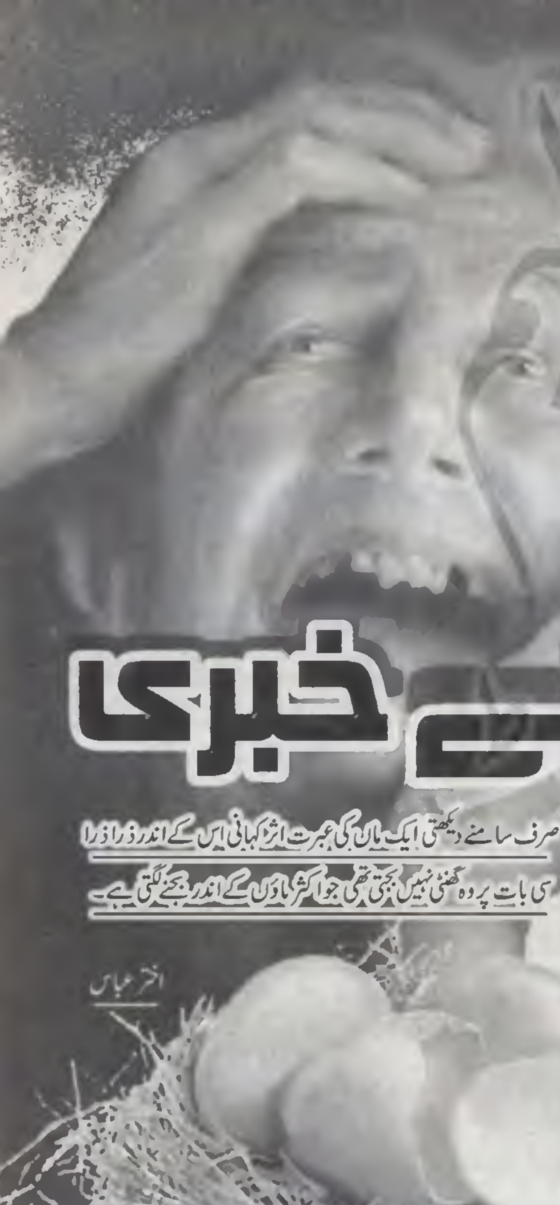

بے خبری

صرف سامنے دیکھتی ایک ماں کی عبرت اثر کہانی اس کے اندر ذرا ذرا سی بات پر وہ گھنٹی نہیں بجتی تھی جو اکثر ماؤں کے اندر بجنے لگتی ہے۔

اختر عباس

دوسرے [illegible] سے وائیلن کی دھیمی دھیمی سی آواز آرہی تھی۔ [illegible] تھا ہر تان ہی دکھ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بندہ خود دکھ سے بھرا ہو، تو پورا ماحول اسے ہم رنگ اور ہم آواز لگنے لگتا ہے۔ ثمینہ بی سجدے میں کتنی ہی دیر سے تھیں۔ کوئی ان کو اس حالت میں دیکھتا، تو یقیناً سوچتا کہ سر اٹھانا بھول گئی ہیں۔ مگر وہ جانتی تھیں کہ اس سمے ان کی حیثیت پلیٹ فارم کی طرف بھاگنے والے اس مسافر کی سی تھی جس کے سامنے سے گاڑی نکلی جاتی ہو۔ وہاں پہنچنے کے دوران راستے بھر جو اندیشے ڈرا رہے ہوں وہ سامنے مجسم ہو کر جان نکالے دیتے ہیں۔

بیٹے اور بہو کو گھر سے گئے کچھ گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ وہ تین بار رحمتے کے

گھر جا کر دیکھ آئی تھیں۔ اندر روشنی دیکھ دیکھ کر وہ کتنی ہی دیر گھنٹی بجاتی رہی تھیں۔ نہ کسی نے دروازہ کھولا، نہ اندر سے کوئی آواز ہی آئی تھی۔

ساتھ والے کمرے میں ثمینہ بی کے میاں چارپائی پہ لیٹے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ پی ٹی وی پہ پکے راگوں کا پروگرام لگا ہوا تھا شاید۔ اسی لیے وہ اونگھتے اونگھتے سو گئے تھے۔ وہ کب ٹی وی دیکھنے کے شوقین تھے، یہ تو ان کی بیٹی اور بہو کی فرمائش تھی جو وہ قسطوں پر چھوٹا سا 14 انچ کا ٹی وی سیٹ لے آئے تھے۔ اپنی تنخواہ سے ہر ماہ انسٹالمنٹ سنٹر کو تین سو روپے دینے کے لیے انھوں نے تین دن تک سوچ بچار اور منصوبہ بندی کی تھی۔ بیکری کا مالک، جہاں وہ کام کرتے تھے، لگی بندھی تنخواہ دیتا تھا اور اوور ٹائم لگوانے کے بعد بھی اوور ٹائم دینے کا قائل نہ تھا۔ اب انھیں اپنے اڑھائی ہزار میں سے بھی خطیر رقم ہر حال میں نکالنی تھی۔ نہ نکالتے تو کیا کرتے۔ روز روز شام کو رات گئے تک بیٹی اور بہو کو ہمسایوں کے گھر جا کر ٹی وی دیکھنے کی عادت سے وہ خوش تھے، نہ ثمینہ بی۔ ثمینہ بی نے کتنی ہی بار دونوں لڑکیوں سے کہا تھا کہ میری ماں کہا کرتی تھیں مغرب کے بعد اولاد کو گھر سے باہر مت جانے دیا کرو، اندھیرے کے ساتھ ہی شیطان اور اس کے چیلے چپاٹے گلیوں میں اتر آتے ہیں۔ تبھی تو اندھیرا پھیلنے سے پہلے گھروں کو لوٹ آنے کا حکم ہے۔

مگر وہ کیا کرتی، بہو سے پہلے بیٹی بول پڑتی تھی ''ماں! ساری عمر ترس ترس کر ہی گزارتے آئے ہیں۔ اسکول میں لڑکیاں، ڈراموں، اداکاروں اور نئے نئے اشتہاروں کی باتیں کرتی ہیں۔ میں ان کے کپڑوں، گھروں اور رویوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی پر تُو مجھے اتنا بھی مجبور اور معذور نہ کر کہ میں بات بھی نہ کر سکوں۔''

بہو اس موقع پر خاموش رہتی تھی۔ وہ اس گھر میں تین سال پہلے بیاہ کر آئی تھی۔ تب اس کا میاں فارغ تھا۔ اب وہ ہفتے کے ہفتے گھر آتا تھا۔ بہو سارا دن اپنے دو سال کے بچے کے ساتھ کھیلتی اور گھر کا چھوٹا موٹا کام نمٹاتی اور شام کو گڈی کے ساتھ ہی رحمتے کے گھر ٹی وی دیکھنے چلی جاتی۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کتنے دنوں سے وہ روز ان کے گھر جاتی ہے۔ بس شروع میں تھوڑی سی جھجک ہوئی تھی۔ وہ ماسی رحمتے کی بیٹی پینو نے دور کر دی تھی۔ وہ اکثر دوپہر کو بن سنور کر ان کے گھر آجاتی پھر اِدھر اُدھر کی خوب باتیں کرتی۔ اپنے گھر، پرانے محلے اور لوگوں کی اسے کتنی کہانیاں بنانی اور سنانی آتی تھیں۔

وہ کہتی تھی ''ہم تو یہاں کبھی نہ آتے، وہ تو پچھلی گلی میں گلزار کا گھر ہے۔ اس کی وجہ سے آ گئے ہیں ورنہ وہاں شاد باغ میں ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ماں بڑی مزے سے رہتی تھیں۔ گھر کا ایک حصہ کرائے پہ دیا ہوا تھا، دوسرے میں خود رہتی تھیں۔ اب دونوں کرائے پہ اٹھا دیے ہیں۔ بس بھائی کی بات ٹالی نہیں گئی۔ مجبوری ہے ایک ہی بھائی ہے۔ بھابی اور بھائی دونوں نوکری کرتے ہیں، ورنہ ان کو وہاں لے جاتے۔'' اس کی باتیں کسی کنڈی دار سنگل کی طرح تھیں، آپس میں مربوط اور بندھی ہوئی۔ زور بھی لگاؤ تو ربط نہ ٹوٹے، خدا

نہ چھوٹے۔ پینو نے پہلے گڈی سے دوستی کی پھر بہو سے۔ ٹی وی کی عادت بھی اسی نے ڈالی۔ وہ کہا کرتی کہ اکیلے دل نہیں لگتا، تھوڑی مہربانی کر کے شام کو تھوڑی دیر کے لیے آ جایا کرو۔ دل بھی لگا رہے گا اور ٹی وی کے ڈرامے، فلمیں بھی اکٹھے دیکھ لیا کریں گے۔

بہو یہی بات کرتی، تو ماں شاید کبھی نہ مانتی۔ وہ تو گڈی نے پوچھا تھا ''مائی! پینو کے گھر چلی جاؤں، جلدی آ جاؤں گی۔'' ماں کو سوچ میں پڑے دیکھا، تو بہو مدد کو آئی تھی ''ماں! گڈی اب بڑی ہو رہی ہے اور دو چار سال بعد اس کی شادی کرنی ہے، یوں کسی کے گھر اکیلی جانا ٹھیک نہیں، چاہے وہاں لڑکا ہے بھی یا نہیں۔ زمانہ ٹھیک نہیں، اگر تو اِجازت دے، تو میں اس کے ساتھ چلی جاؤں۔ ایک اکیلا دو گیارہ۔''

بس اس دن سے وہ دونوں ایک اکیلے دو گیارہ ہو گئیں۔ ماں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ دونوں نے کسی بریگیڈ آفس میں بیٹھ کر محاذ پہ لڑنے اور جیتنے کی منصوبہ بندی کرنے والے فوجیوں سے بڑھ کر ان ڈائیلاگوں کی منصوبہ بندی کی تھی۔ شروع میں تو وہ طیب کو ساتھ لے کر جاتیں، مگر وہ اکثر وہاں ریں ریں کر کے ان کا سارا مزہ خراب کر دیتا۔ اگلے ہی دن بہو ماں کی چارپائی پہ بیٹھی کہہ رہی تھی ماں! طیب تو مجھ سے زیادہ تیرا بیٹا ہی لگتا ہے۔ ذرا کی ذرا تجھ سے دور جاتا ہے، تو رو رو کر ہلکان ہو جاتا ہے۔ ثمینہ بی کیسے تڑپ اٹھی تھی۔ ''لا میرا پتر، ادھر مجھے دے تم دونوں بے ہدایتیاں؟ مرنے جوگیاں، جب پینو کے گھر جاؤ، تو میرے بچے کو آیندہ ساتھ لے کر نہیں جانا، میرا تو اپنا جی اس کے بغیر ہلکان ہوتا ہے۔''

ثمینہ بی کی بھی دو ہی آنکھیں تھی جو صرف سامنے دیکھتی تھیں۔ ان کے اندر شاید وہ کوئی گھنٹی نہیں لگی تھی جو اکثر ماؤں کے اندر ذرا سی بات پر بجنے لگتی ہے اور وہ مرغی کی طرح بھاگ کر اپنے بچوں کو پروں میں ڈھانپ لیتی ہیں۔

مائی رحمتے اس کے گھر کم آتی، ہاں پینو خوب آتی اور اس کا آنا اسے برا نہ لگتا۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح شوں شوں کرتی نہ پھرتی تھی۔ ثمینہ بی کے پاس بیٹھی باتیں کرتی، حال چال پوچھتی، پھر گڈی کے پاس دوسرے کمرے میں جاتی اس کمرے کے ساتھ ہی برآمدہ نما اسٹور جس کی چھت تو تھی مگر دیواریں بغیر پلستر اور دروازہ بغیر پٹ کے تھا۔ وہاں ثمینہ بی نے گھر کے کاٹھ کباڑ کے ساتھ ساتھ کچھ مرغیاں بھی رکھی ہوئی تھی۔ گڈی کے نام پہ وقف کالو، ان دنوں انڈوں پر بیٹھی تھی اور اس کے نیچے پورے 15 انڈے رکھے ہوئے تھے۔ آٹھ دس تو کالو کے اپنے تھے اور باقی ثمینہ بی دیسی مرغی کے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کہیں سے لے کر آئی تھیں۔ انھوں نے جب ایک دن پینو کو بتایا کہ بازاری انڈوں سے بچے نہیں نکلتے، تو وہ بڑی حیران ہوئی تھی۔

کیوں ماسی! اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ''بس پتر فارمی انڈے میں خدا جانے اندر کیا کچھ ہوتا ہے۔ باہر سے پورے ہی لگتے ہیں۔ شکل و صورت بھی اصلی ہی ہوتی ہے مگر اندر گُن نہیں ہوتے جن سے بچے نکلیں۔ جیسے انسانوں میں ہوتا ہے۔ لوگ شکل و صورت سے پورے ہوتے ہیں، واسطہ پڑے تو لگتا ہے فارمی انڈوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ پھر وہ خود ہنسی تھی۔ یہ تم نئی پیڑھی کی لڑکیاں ہو تمھیں کیا پتا مرغی کے انڈوں سے بچے لینے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

پورے اکیس دن مرغی کی سیوا کرنی پڑتی ہے۔ اسے انڈوں پہ بٹھایا جاتا ہے وہ انڈوں پہ یوں پر پھیلا کے بیٹھی ہے، جیسے ماں بچوں کو لحاف میں لپٹا کے چھپاتی ہے۔ اب دیکھو 18 دن ہو گئے ہیں۔ 21ویں دن انڈے پھٹنے شروع ہوں گے تب ننھے منے چوزے گردنیں نکال کر چوں چوں کرتے بند آنکھیں کھولتے ہیں اور پورے گھر کو خوشی اور زندگی سے بھر دیتے ہیں۔
پینو نے ہاتھ بڑھا کر مرغی کے نیچے پڑے انڈوں کو صرف چھونا چاہا تھا جب مرغی باقاعدہ غصے سے کڑکڑ کرتی اس کے ہاتھ پر جھپٹی تھی۔ ثمینہ بی کی ہنسی نکل گئی تھی۔ ''بے وقوف! یہ ماں بننے والی ہے۔ بھلا اپنی اولاد کو یوں چھونے دے گی۔ اسے پتا ہے ان انڈوں کو کسی کا ہاتھ بھی لگ گیا، تو اچھے خاصے انڈے بھی گندے بن جاتے ہیں اور ان سے بچے کے بجائے بدبودار سڑا ہوا مادہ نکلتا ہے۔ پھر وہ خود سے بڑبڑائی تھی، شکل تو ایک سی ہوتی ہے کیا خبر کسی چھونے والے کی بدنیتی ہی اندر تک سب کچھ جلا دیتی ہو۔''
انسانی زندگی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے، جن فیصلوں کو بدنیتی کا اثر چھو لے وہ ہمیشہ گندے انڈوں جیسے ثابت ہوتے ہیں۔ بظاہر سارے انڈے ایک سے لگتے ہیں۔ ان سبھوں سے بچوں کی توقع بھی ضرور ہوتی ہے۔ مگر کون جانے کب کب ان پہ پڑی نگاہیں ان کے وجود کی پوری کیمسٹری ہی بدل کے رکھ دیتی ہیں۔
ثمینہ بی کی سسکیاں اب کمرے سے باہر تک جانے لگی تھیں۔ یوں لگتا تھا اندر کوئی چھوٹی سی موٹر چل رہی ہے جو دُکھ اور افسوس کا پانی آنسوؤں اور آہوں کی صورت نکالے جا رہی ہے۔ اس کے میاں نے اندر جھانکا، تو بیوی کو جاں کنی کے عالم میں دیکھا۔ پہلے کھڑے دیکھتے رہے، پھر ہولے سے آگے بڑھے اور سجدے میں پڑی ثمینہ بی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولے۔ ''نیک بخت کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟''
ثمینہ بی کی دھاڑیں ہی تو نکل گئی تھیں، گڈی کے ابا! اس نیک بخت کے نصیب ہی جل گئے۔
''اللہ خیر کرے کیا ہوا؟ منہ سے شبھ شبھ نکالو کیا خبر کون سی گھڑی قبولیت کی ہوتی ہے۔''
ثمینہ بی کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔
''وہ گھڑی تو آ کے چلی بھی گئی نصیبوں کو جلا گئی۔ زندگی فنا کر گئی اور میں سوتی رہ گئی۔ مجھ سے تو میری مرغی اچھی، اپنے انڈوں کی حفاظت تو کرتی ہے۔ مجھ گرموں جلی سے تو اپنی اولاد نہ سنبھالی گئی۔''
ثمینہ بی کے میاں اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ بیٹی یا بہو نے کوئی بات نہیں مانی، کسی معاملہ میں ستایا ہے۔ ماں ہے اور مائیں چھوٹے دل کی ہوتی ہیں۔ بات دل پر لے بیٹھی ہے۔
رو رو کر کبوتر کی طرح آنکھیں سرخ کیے بیٹھی ثمینہ بی جیسے جیسے بیٹی اور بہو کی گمشدگی کا بتا رہی تھیں، ان کے میاں کے پاؤں سے زمین نکل رہی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے رحمتے کے گھر پہنچے تھے۔ سانس درست کیے بنا گھنٹی پہ ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ اندر ہی نہیں، گھنٹی ان کے تن بدن میں بھی بج رہی تھی۔ ثمینہ بی بھی ان کے پیچھے پیچھے طیب کو اٹھائے پہنچ گئیں تھیں۔ بچہ بے خبر سو رہا تھا۔ بے خبری کبھی تو رحمت ہوتی ہے اور کبھی ایسی زحمت جو کمر توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ اٹھنے اور آنکھ اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ اس لیے ایک زمانے تک مائیں اپنی بچیوں سے زیادہ، ان کی

...توں اور گھر والوں کے بارے میں متفکر ہوتیں، ...ہوتیں نہ ہی کسی سے دوستی کی اجازت ہوتی، نہ ...ب کے گھروں پہ جانے کا مرحلہ آتا۔ یوں مائیں مرغی ...نی اپنی اولاد کو سینت سینت کر اور سنبھال سنبھال کر ...حتیاط اور محبت کے پروں میں چھپائے بڑا کر دیتیں اور ...عزت سے اپنے گھر سے رخصت اور نئے گھر اور ...ریاست کی مالکن بنا دیتیں۔
کوئی جواب نہ ملنے پر ثمینہ بی اپنے میاں کو لیے تیز تیز قدموں سے پچھلی گلی میں واقع گلزار کے گھر جا پہنچیں۔ یہ رحمتے کے بھائی کا گھر تھا۔ ایک موہوم سی آس اور امید باقی تھی کہ بیٹی اور بہو شاید وہاں مل ...ئیں مگر جب یہ پتا چلا کہ گلزار تو رحمتے کا بھائی ہے ہی ...یں، وہ خاتون اپنی لڑکی پینو کے ساتھ ہفتہ بھر پہلے دو چار مرتبہ ملنے آئی تھی اور ماں باپ سے زیادہ ان کی دو جوان اور خوبصورت لڑکیوں سے تعلق بنانے، دوستی بڑھانے اور محبت جتانے میں لگ گئیں، تو گلزار نے ...نی بیوی سے کہا، بچیوں کو بتا دینا ''جو ماں سے زیادہ پیار جتائے پھپھے کٹنی کہلاتی ہے اور سگے رشتوں کو مار ...کھاتی ہے۔'' بچیاں یہ سن کر محتاط ہو گئیں اور انھوں نے ...بارہ ماں بیٹی کو منہ نہیں لگایا۔
''مگر معاملہ کیا ہے'' گلزار نے پریشان حال ...ے ہوئے میاں بیوی سے پوچھ لیا جو ایک شام میں ...ن بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ وہ کیا بتاتے کہ اپنی زندگی ...بھر کا کیش، اعتماد اور مروت کے نام پہ کیشیئر کو دے ...بیٹھے ہیں جو اسے جمع کرنے کے بجائے لے کر ہی ...بھاگ گیا ہے۔

واپس آتے ہوئے غصے اور بے بسی کا طوفان تھا جو ثمینہ بی اور ان کے اندر آیا ہوا تھا۔ تاسف اور پریشانی اسے اور بڑھائے دیتی تھیں۔ گزرنے والا ہر لمحہ، وقت کو خوف کی دھار اور تلوار بنانے پہ تلا ہوا تھا۔ اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ وقت کے تیور عجیب ہوتے ہیں۔ نہ ان کی پہلے سے خبر ہوتی ہے، نہ اندازہ۔ عام سی نگاہ سے تو یہ تیور جانے جا سکتے ہیں نہ پہچانے۔
کبھی وقت کسی پر مہربان ہو، تو دنیا لٹا دے اور نامہربان ہو، تو بھکاریوں کی طرح خالی ہاتھ لوٹا دیتا ہے۔ توجہ، امید اور آس کا ایک سکہ بھی جھولی میں نہیں ڈالتا۔ کبھی حادثوں سے بھری زندگی کو پھولوں کی سیج بنا دیتا ہے، سب کچھ بھلا دیتا ہے اور کبھی ایک حادثے کو زندگی پر بھاری بنا دیتا ہے۔ پھر حوصلے اور برداشت کی کمر ٹوٹنے کی آواز دور دور تک جاتی ہے اور کسی کے پاس ان کے جوڑنے کا سامان بھی نہیں ہوتا۔
ثمینہ بی کو یوں لگا جیسے وقت نے تباہی اور بربادی کے خون آلود خنجر کو ننگا کر کے ان کے کمزور سے جسم میں گھونپ دیا ہے۔ گزرنے والا ہر لمحہ درد اور خوف کو بڑھائے دیتا تھا ہائے میری بچی! کے بجائے اب ان کے منہ سے ہائے میری بچیاں نکل رہا تھا۔ یا اللہ تو ہی شرماں رکھنے والا ہے۔ ان نادانوں کی حفاظت فرما۔ کتنا کہا تھا کہ اب تو ٹی وی گھر پہ آ گیا ہے، اب شاموں کو کیوں پینو کی طرف جاتی ہو، تو گڈی نے کیسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے کہا تھا، ماں ان کے گھر کمپیوٹر آیا ہے۔ انٹرنیٹ بھی ہے، ماں! تجھے کیا بتاؤں اس پہ وہ کیسی چیزیں دکھاتی ہے، معلومات کے وہ دریا بہاتی ہے کہ جسم و روح کانپ کانپ جاتے

ہیں۔ اب ہمارے پاس، تو آنا نہیں ہے لہٰذا چار دن دکھ لینے دے۔ ماں یہ دنیا کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کیا کیا بتائے اور دکھائے جاتی ہے۔''

گڈی بولے جا رہی تھی جب بھابھی نے اس کا پاؤں دبایا تھا ''بس بھی کر، ماں کو کیا پتا کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کیا ہوتا ہے۔ اس پہ دوسروں سے چیٹنگ کیسے ہوتی ہے۔''

ثمینہ بی اپنے میاں کو تھانے بھجوا کر یوں ٹوٹی بیٹھی تھی جیسے قلعہ روہتاس کے کھنڈروں کی دیواریں ہوں۔ جن میں کوئی اینٹ بھی سلامت نہ رہی ہو۔ بوڑھے دریا کے پانیوں کی طرح آنسو اب رک رک کر آنے لگے تھے۔ طیب دو چار بار کسمسایا تھا۔ اس کو تھپک کر سلاتے ہوئے ثمینہ بی نے سوچا تھا کیا ان بوڑھی ہڈیوں پر اس معصوم کی پرورش کا بوجھ آنے والا ہے۔ وہ بے بسی اور خوف سے بھری کمرے میں یوں ٹہل رہی تھی جیسے PSO کا پٹرول بھرا ٹرک ہو، ذرا سی بے احتیاطی جسے بھک سے اڑا کے راکھ کر دے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بے یقینی اور ناامیدی سے بنی ماچس کی ان جلتی بجھتی تیلیوں کو اپنے وجود کو جلانے سے کیسے اور کیونکر روکے جو سب کچھ جلانے پہ ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔

پولیس کی ہوٹر بجاتی گاڑی کیا آئی ثمینہ کو یوں لگا جیسے رسوائی تو گھر آ گئی ہو۔ دونوں بچیوں کو غائب ہوئے آٹھ گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ رسوائی کا تو احساس ہی زہر بھری سرنج جیسا ہوتا ہے، جو سیدھا رگوں میں اترتا ہے۔ پہلے آگ لگاتا ہے پھر ساری خوشیوں اور خوش نامیوں کو کھاتا ہے۔

ثمینہ بی کے اس چھوٹے سے خاندان کی زندگی پہ ایسا برا وقت کبھی نہ آیا تھا کہ نہ پیچھے کچھ نظر آ رہا تھا نہ سامنے کوئی امید ہاتھ پکڑنے کو آتی تھی۔ پولیس کی پٹرولنگ پارٹی رحمتے کے گھر کے سامنے رکی، تو وہاں ایک ٹرالی کھڑی تھی۔ جس پہ چار پانچ مزدور اور ایک ٹھیکیدار گھر کا سامان لاد رہے تھے۔ پولیس کو دیکھ کر ان کے تو ہوش اڑ گئے۔ ٹھیکیدار فوراً صفائی دینے لگا۔

''سرکار میں چور نہیں، یہ میرا اپنا سامان ہے جو میں نے تین چار ہفتے پہلے بیچا تھا۔ مائی نے آج ہی مجھ کو دوبارہ بیچا ہے اور پیسے بھی لے گئی ہے۔ مجھے لالچ یہ تھا کہ دکان پہ بیٹھے سات آٹھ ہزار بچ گئے۔ اسی نے کہا تھا سامان لینے رات 10 بجے کے بعد آنا۔ چابی بھی دے گئی تھی۔ میں بڑا عزت دار آدمی ہوں۔ کوکا کولا فیکٹری کے ساتھ میرا فرنیچر اور گھر کے پرانے سامان کا نیلام گھر ہے۔''

محلے کے لوگوں کی آوازوں، باتوں اور تبصروں نے رات کو اور بھی تاریک کر دیا تھا۔ گلی میں دو چار مدھم مدھم سے بلبوں نے اسے حبشی کے چہرے کی طرح بنا دیا تھا۔ دونوں میاں بیوی کے کانوں میں ہی نہیں پیروں میں بھی بظاہر ہمدردی بھری باتوں کی کیلیں ٹھونکی جا رہی تھیں اور وہ دیوار سے لگے غم سے کانپے جا رہے تھے۔ ان کے کندھے جھکے جاتے تھے کہ ان پہ ایک نہیں دو بیٹیوں کے کھو دینے کا پہاڑ سا بوجھ تھا۔ یہ بوجھ تو اس رکشے والے کی وہ معلومات بھی کم نہ کر سکیں جو رش دیکھ کر اتفاق سے قریب آ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ شام سے ذرا پہلے وہ ایک مائی اور تین لڑکیوں کو بٹھا کر سوزو گولڈ سینما لے کر گیا تھا۔ مائی تو نہر والے پل پر اتر گئی تھی، لڑکیاں البتہ مال روڈ پہ سروسز ہوٹل سے ذرا

آگے اتر گئیں۔ مائی نے مجھ سے یہی طے کیا تھا کہ وہاں جا کر میرا رکشا خراب ہو جائے گا۔ رکشا خراب ہوا تو وہ اتر کر سڑک پہ کھڑی ہو گئیں۔ ایک کار قریب آ کر رکی، اس میں وہ مائی بیٹھی، مگر اس نے منہ پہ دوپٹا لیا ہوا تھا۔ ہاں یاد آیا وہ لڑکیاں راستے میں چیٹنگ چیٹنگ کی باتیں کر رہی تھیں۔ اس چیٹنگ کے دوران کسی لڑکے سے ان کی دوستی ہوئی تھی اور اس نے انھیں سوزو گولڈ پہ ملنے کا وعدہ کیا تھا وہ تینوں اسی سے ملنے جا رہی تھیں اور اس کے بارے میں اندازے لگا رہی تھیں، اندازہ تو میں نے بھی لگایا تھا، ہم تو جی سارا دن رنگ برنگی سواریوں کو دیکھتے ہیں۔ دو لڑکیاں ڈری ہوئی تھیں جب کہ تیسری لڑکی ان کو تسلی دیتی تھی کہ ماں کو نہیں بتایا، اچھا کیا ہے۔ ابھی گئے ایک آدھ گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔ پر جی ہمیں پتا ہوتا ہے، ایسے کیسوں میں واپسی نہیں ہوتی ہے۔

رکشے والے کو پولیس نے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔

ثمینہ بی کے میاں بھی بے دلی سے چلتے ہوئے پولیس وین میں بیٹھ گئے تھے اور اب محلے کے بہت سے لوگوں کی باتوں، تبصروں اور خوف ناک اندازوں کی زد پہ ایک اکیلی ثمینہ بی تھی جس کے کانوں میں کچھ جملے بار بار پڑ رہے تھے ''رحمتے شکل سے تو نہیں کام سے پوری بردہ فروش نکلی، جانے کس کس کے گھر اجاڑے ہوں گے۔ دو جوان لڑکیاں اچک کر یوں لے گئی جیسے چیل چوزے لے جاتی ہے۔''

ثمینہ بی نے وہاں سے اپنے گھر تک کا فاصلہ کتنی صدیوں میں طے کیا تھا یہ وہی جانتی تھی وہ قدم کہیں رکھتی تھی اور وہ پڑتا کہیں اور تھا۔ وہ جان سکتی تھی کہ ساری بھاگ دوڑ کے باوجود اس کی بیٹی اور بہو کی سلامت اور محفوظ واپسی کا امکان تھا، نہ کوئی امید۔

کوئی یوں دیکھتے دیکھتے جوان اولاد سے کب محروم ہوا ہو گا۔ جس بیٹی اور بہو کے لاڈ اٹھانے کو اس کی ساری بھاگ دوڑ تھی وہ تو ہاتھ سے یوں نکل گئی تھیں جیسے بچے کے ہاتھ سے بے دھیانی سے گیس بھرا غبارہ نکل جائے۔

اندر اسٹور سے مرغی کے کُڑ کُڑ کی تیز آواز آ رہی تھی یہی اس کے انڈوں سے بچے نکلنے کا دن تھا۔ ہر بچے کے نکلنے پر مرغی اکیلی خوشی منا رہی تھی ورنہ پہلے تو ثمینہ بی ہمیشہ ہر انڈے کے ٹوٹنے اور بچہ نکلنے کے موقع پر گواہ کے طور پر موجود ہوتی تھی۔ کالو نے زور زور سے کڑ کڑ کی تو ثمینہ بی جان گئیں کہ وہ اسی کو بلا رہی ہے۔ انھیں امید تھی اس بار سارے انڈوں سے بچے نکل آئیں گے مگر وہ کالو کے پاس کیسے جاتیں کیسے اس کی خوشی بڑھاتیں اور اسے کیونکر رو رو کر بتاتیں کہ کالو! بے خبری میں میرے تو اپنے انڈے خراب نکل آئے ہیں۔

طیب نے تین چار بار ماں ماں پکارا تھا۔ اس کی آنکھیں توجہ اور جواب کے لیے مچل رہی تھیں۔ اسے جواب کے بجائے ثمینہ بی کے آنسو مل رہے تھے جو یوں گر رہے تھے جیسے کسی پھٹی جھونپڑی سے بارش کا پانی گرتا ہے۔

طیب ہٹر ہٹر بوڑھی دادی اور اس کے آنسوؤں کو دیکھ رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس برساتی نالے میں اتنا پانی کہاں سے آ رہا ہے۔

○○○

وہ پڑھائی میں نکما تھا اس لیے اپنے ابا ماسٹر رحمت علی سے، جو تھے بھی ریاضی کے استاد، اکثر پٹتا رہتا تھا۔ ادھر ماسٹر صاحب سامنے کے دروازے سے گھر میں داخل ہوتے، ادھر وہ پچھلے دروازے سے فرنٹ ہو جاتا۔ گلی اس کی جنت تھی۔ بنٹے، گڈیاں، گلی ڈنڈا، بارہ ٹہنی......

یہ بڑا ہو کر کیا بنے گا۔ ماسٹر رحمت علی تاسف سے سوچتے۔ جو شخص عاد اعظم صحیح نہ نکال سکے وہ کیا خاک قائداعظم کے نقش قدم پر چلے گا۔ پڑھائی میں اچھا ہوتا تو کیا کچھ نہیں بن سکتا تھا۔ افسر، ڈاکٹر، انجینئر، ماسٹر جی فُٹے سے اس کی ہتھیلیاں لال کر دیتے۔ وہ اسکول میں اس کی ریاضی کی کلاس لیتے تھے اور اپنی اولاد ہونے کی وجہ سے انھیں اس پر دُہرا غصہ آتا تھا۔

......لیکن اپنی ماں اور محلے والیوں کا وہ آنکھ کا تارا تھا۔ گورا رنگ تھا، کوئی اسے بگا کہتا۔ بال بھورے، کوئی ککا کہتا۔ سر پر گھنگھریالے بالوں کا چھتا۔ کوئی کنڈلاں والا اور کوئی شربتی آنکھوں کے حوالے سے بلا کہہ دیتا۔ لیکن اس کا اپنا نام بھی تھا۔ ماسٹر جی اسے ہمیشہ محمد اکبر بلاتے تھے۔

جب بالغ ہوا، تو اس کے حسن نے گلی میں دھوم مچا دی۔ کسی کھڑکی سے گنگنانے کی آواز آتی...... بگیا بگیا...... اوئے کنڈلاں والیا...... لیکن وہ سیدھا تھا، سیدھا گزر جاتا۔ محلے والیاں اسے اپنا سمجھتی تھیں۔ کیونکہ وہ کھلنڈرا ہونے کے باوجود محلے کے باقی لڑکوں کی نسبت فرمانبردار تھا۔ محلے سے گزر رہا ہوتا، تو کوئی ٹماٹر لانے کا کہہ دیتی، کوئی دہی کا برتن تھما دیتی، کسی کو سوڈے کی بوتل منگوانا ہوتی۔ اکثر نے دل ہی دل میں اسے اپنی بیٹیوں کے لیے پسند کر لیا تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتیں۔ موازنے پر وہ ان کی بیٹیوں سے زیادہ خوبصورت نکلتا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کی ماں کی خاطر داریوں میں کسر نہ چھوڑتیں۔ کہیں سے ساگ پک کر آ جاتا کہیں سے کڑھی۔ ماں کو بیٹے پر

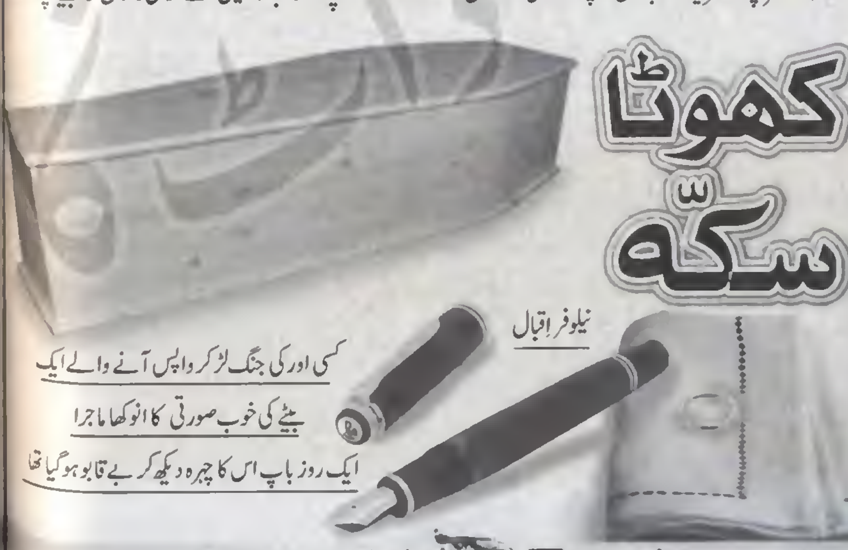

کھوٹا سکّہ

نیلوفر اقبال

کسی اور کی جنگ لڑ کر واپس آنے والے ایک بیٹے کی خوب صورتی کا انوکھا ماجرا

ایک روز باپ اس کا چہرہ دیکھ کر بے قابو ہو گیا تھا

ناز تھا اور اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ آخر اس کا باپ اس کی قدر کیوں نہیں کرتا؟

''سوہنی شکل کو آگ لگانی ہے'' ماسٹر جی کہتے۔ ''دو سوال تو ٹھیک نکلتے نہیں اس سے۔''

آخر بگے نے گھسٹ گھسٹا کر میٹرک کر لیا۔ لیکن کسی کالج میں داخلہ نہ ملا۔ وہ اور اس کے جیسے دوسرے، کالجوں کے میرٹ سے میلوں دور تھے۔ ماسٹر جی سر پیٹ کر رہ گئے۔ دوبارہ امتحان دلوایا گیا۔ پہلے سے بھی کم نمبر آئے۔ ماسٹر جی نے اسے فُٹے کے ساتھ بہت مارا اور پھر صبر کر کے بیٹھ گئے اور سنجیدگی سے سوچنے لگے کہ اسے منیاری کی دکان کرا دیں۔

لیکن بگا خود بھی ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور ایک روز اس نے گھر والوں کو خبر دی کہ وہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔ ماں بہت خوش ہوئی اور اس نے محلے میں شکر پارے بانٹے۔ ماسٹر جی بھی ٹھنڈا سانس بھر کر صبر شکر کر گئے کہ چلو کھوٹا سکہ کسی طرف تو لگا۔ ان سے اس کا گلیوں میں بے مقصد پھرنا دیکھا نہیں جاتا تھا۔

جس دن بگا وردی پہن کر آیا، یوں لگا جیسے گھر میں سورج اتر آیا۔ ماسٹر جی کو بھی دل ہی دل میں اس کی وجاہت کا اعتراف کرنا پڑا۔

''چلو شکل کسی طرف تو کام آئی'' انھوں نے آواز میں حتی المقدور طنز بھر کر کہا۔ انھیں یقین تھا کہ اسے بھرتی صرف صورت کی وجہ سے ملی ہے۔ حسرت تھی کہ کاش کچھ اور پڑھ گیا ہوتا تو فوج میں کمیشن مل جاتا۔ افسر بن جاتا۔ گھر کے حالات بدلتے۔ بگا یونٹ میں چلا گیا۔ اس کے خط باقاعدگی سے آتے تھے، باپ کو بہت کم لکھتا۔ جب لکھتا تو میٹرک کی گرائمر کی کتاب سے یاد کیے گئے القابات استعمال کرتا۔ بہنوں سے خطوں میں ہنسی مذاق کر لیتا۔ چھٹی پر آیا، تو ماں نے منگنی کر دی۔ بگے نے گھر کی نشاندہی کر دی تھی۔ اُسی گنگنانے والی شوخ کے گھر کی۔ وہ خوش خوش واپس گیا۔ اس نے یونٹ کے ساتھیوں کو منگنی کے لڈو کھلائے۔

بگا تنخواہ کا کچھ حصہ گھر ضرور بھیجتا۔ ماسٹر جی ریٹائر ہونے والے تھے اور بڑی لڑکی کی شادی کی تیاریاں شروع تھیں۔ منی آرڈر آنے پر کچھ نہ کچھ سامان خرید لیا جاتا۔ وہ خود بھی بارڈر پر تھا۔ آتے ہوئے یا آتے جاتوں کے ہاتھ کمبل، تھرموس یا بجلی کی کوئی چیز بھجواتا رہتا۔ فیصلہ یہ تھا کہ پہلے بہن رخصت ہو پھر بہو گھر میں آئے۔ چھوٹی لڑکیوں کا وقت ابھی دور تھا۔

بہن کی شادی پر بگا چھٹی آیا۔ بارات والے دن اس نے نیا سوٹ اور ٹائی پہنی اور جیب میں لال رومال لگایا تو شور مچ گیا۔ ماں نے نظر اتاری، سسرال والیاں بھی دیکھتی رہ گئیں۔ بگا پوز بنا بنا کر دوستوں سے فوٹو کھنچواتا رہا۔ اس کی منگیتر چپکے چپکے دیکھ کر جلتی رہی۔

''ہونہہ! بڑے دماغ ہو گئے ہیں۔'' جب آمنا سامنا ہوا تو اس نے جھٹکے سے منہ پھیر لیا اور بگا سوچتا رہ گیا کہ یہ عورتیں چیز کیا ہوتی ہیں۔

اس پھیرے میں بگا، بہن کے ساتھ ساتھ اپنی دلھن کے لیے بھی ریشمی سوٹ لایا تھا۔ ماں نے فوراً سنبھال کر صندوق میں رکھ دیے۔ بہنوں نے خود اپنے لیے سلوانے کی ضد کی تو ماں نے ڈانٹ کے بٹھا دیا کہ وہ جس کے لیے لایا ہے اسی کے لیے سلیں گے...... اب اگلی باری اس کی تھی۔ بگے نے وعدہ کیا کہ وہ چھ مہینے

بعد پھر چھٹی آئے گا۔ شادی کے تیسرے دن وہ واپس چلا گیا۔

ایک دن فجر کے وقت ماں کو صحن سے کھڑ پڑ کی آوازیں آئیں۔ کسی نے گھڑے سے پانی نکال کر پیا۔ بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ پھر صحن سے ہلکی ہلکی باتوں کی آواز آنے لگی۔ وہ جلدی سے اٹھی اور کمرے سے نکل آئی۔ ہلکے ہلکے دھندلکے میں اس نے بگے کو پہچان لیا۔ وہ اور اس کا باپ صحن میں بچھی چارپائی پر برابر برابر بیٹھے دھیمی آواز میں باتیں کررہے تھے۔

”تو کب آیا اکبر؟“ ماں کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور ساتھ ہی خوشی کی لہر سی اس کے دل میں اٹھی کہ شاید شادی کی چھٹی پر وقت سے پہلے ہی آگیا ہے۔

بگے نے ماں کو سلام کیا اور دوبارہ باپ کے برابر بیٹھ کر سرگوشیوں میں بات کرنے لگا۔

”کوئی بات ہوگئی ہے؟“ ماں سراسیمگی سے بولی۔

”کوئی بات نہیں۔ چائے بناؤ جلدی سے۔ ساری رات سفر کرتا آیا ہے۔“ ماسٹر جی نے کہا۔

ماں چولہے میں لکڑیاں ٹھیک کرنے لگی اور سوچنے لگی کہ کوئی بات ضرور ہے۔ پھر یکدم ایک خیال سے اس کا دل ڈوبنے لگا...... بس گئی اس کی نوکری۔ ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہے کہ اس کی نوکری چلی گئی۔ اس سے رہا نہ گیا۔

”پُتر خیر سلا تو ہے؟“

”اس نے دوپہرے واپس چلے جانا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے آیا ہے ملنے۔“ ماسٹر جی بولے۔

”ہیں! کیوں؟“

ماسٹر جی کچھ کہنے والے تھے کہ بگا اپنی جگہ سے اٹھا اور آکر ماں کے برابر پیڑھی پر بیٹھ گیا۔

”ماں میں نے بہت دور جانا ہے سفر پر۔ بس ملنے آیا ہوں۔ کل صبح سرگی ہمارا یونٹ دور جا رہا ہے۔ دوسرے ملک، ہوائی جہاز پر“ بگے نے ہاتھ سے ہوائی جہاز اُڑنے کا اشارہ کرکے دکھایا۔

”کدھر؟ کیوں؟ خیر سے جا رہے ہونا؟“ ماں کو اتنا اطمینان، تو ہوا کہ کم از کم نوکری تو نہیں گئی۔ پھر دوسرے ملک جانے کا مطلب، تو زیادہ کمائی ہے۔ اس نے دیگچی میں دودھ اور پتی ڈالی اور مزید تفصیل کے لیے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”وہاں جنگ لگی ہے۔“

”اللہ خیر کرے“ ماں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

”پر تیرا کیا کام ہے اُدھر۔“

”ہم نے اُدھر جا کر...... بس آرڈر ہے نا ماں۔ لیکن ایسی کوئی فکر والی بات نہیں۔ دوسرے ملکوں کی فوجیں بھی ہیں اُدھر...... ایسے فکر والی کوئی بات نہیں۔“ بگا ہنس کر بولا۔

ماں اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ وہ اس کی ہنسی کی تہوں میں فکر والی بات ڈھونڈ رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کا بیٹا کئی سال بڑا ہوگیا۔ اس کی ہنسی میں ہنسنے کھیلنے والے بگے کا کھلنڈرا پن نہیں تھا۔

”تُو کہتا ہے جنگ لگی ہے اُدھر اور فکر والی بات کوئی نہیں۔ فکر والی بات کیوں نہیں۔“

”بس ہے نا ماؤں والی بات۔ ساری مائیں کہتی ہیں بس جنگ نہ لگے۔ ان کے فوجی پُتر مفت کی تنخواہیں لیں، ویلیاں کھائیں۔ ہیں نا؟ بگا ہنس کر بولا۔

”تو ہنس رہا ہے، میرا دل ڈوب رہا ہے؟ میں کہتی ہوں یہ معاملہ کیا ہے۔ کون سی کھسموں کو کھانی جنگ لگ گئی ہے۔ اِدھر تو کوئی جنگ نہیں لگی ہوئی۔ آخر تو کدھر جا رہا ہے لڑائیاں لڑنے ہوائی جہازوں پر بیٹھ کر۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

اب ماسٹر جی بولے۔ ”تمھیں کیا سمجھ ہے ان باتوں کی۔ محمد اکبر بھوکا ہے رات کا۔ جلدی پراٹھے بناؤ۔ لڑکیوں کو بھی اٹھاؤ۔ تمھیں کیا پتا ہے دوجی ہوں گا۔ کون سا تاریخ جغرافیہ پڑھا ہے تم نے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، تمھیں کچھ خبر نہیں۔ تمھارا کام دعا منگنا ہے، سوال جواب کرنا نہیں۔“ لیکن ماسٹر جی کی آواز میں معمول والی سختی نہ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بیوی کو تسلیاں دے رہے ہیں۔

وہ چولہے میں لکڑیاں ٹھیک کرکے توا صاف کرنے لگی۔ بگا اٹھ کر دوبارہ باپ کے پاس بیٹھ گیا اور دونوں پھر دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ ماں بڑ بڑانے لگی...... ”لو جی میرا کام نہیں سوال جواب کرنا۔ جس نے جنا، جس نے پالا، جس نے پوسا اس کا کام ہی نہیں سوال جواب کرنا...... سڑنے جوگی دنیا میں کیا ہو رہا ہے مجھے کیا......“

بگے کی بہنیں بھی آوازوں کا شور سن کر باہر نکل آئیں۔ بھائی کو اچانک دیکھ کر خوشی سے چلا اٹھیں۔ سب کا خیال تھا کہ وہ شادی کے لیے آیا ہے۔ وہ جلدی جلدی بھائی کی خاطر داری میں لگ گئیں۔ ماں سے ان کی خوشی برداشت نہ ہوئی اور وہ بول اٹھی۔

”جا رہا ہے یہ تتر یو......! جانے کے لیے آیا ہے“ پھر شاید لکڑیوں کا دھواں اس کی آنکھوں میں گھس گیا اور آنسو بہنے لگے۔

”کہاں؟ کیوں؟“ لڑکیاں اسکول میں پڑھتی تھیں، اس لیے باپ نے انھیں بتانے میں حرج نہ سمجھا۔ چھوٹی بہن دوڑ کر اپنے بستے سے معاشرتی علوم کی کتاب نکال لائی۔ اس میں دنیا کا نقشہ تھا۔ وہ اس ملک کو ڈھونڈنے لگی جہاں اس کا بھائی جا رہا تھا...... ہوائی جہاز پر......

”ہمارے لیے کیا لاؤ گے؟“

”لکھ کر دے دو جو منگوانا ہے۔“

ماں کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ آنسو چھپا رہی تھی...... لڑکیوں نے دیکھ لیا، تو وہ بھی رونے لگیں گی اور پھر بیٹے کا دل دکھے گا۔ جہاں جا رہا ہے خوشی خوشی جائے۔ خیری خیری آئے......

ناشتے کے بعد بگا محلے والوں سے ملنے نکل گیا۔ ہر طرف خبر پھیل گئی کہ بگا یونٹ کے ساتھ باہر جا رہا ہے ہوائی جہاز پر۔

جونہی دن کا کھانا کھایا بگے کو نکلنے کی جلدی ہوگئی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا، کنگھی کی اور میلی ٹاکی سے بوٹ چمکا کر جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اب بہنوں کو احساس ہوا کہ بھائی جا رہا ہے...... اور ان کے دل بھاری ہوگئے اور آنکھیں چھلکنے لگیں۔ چھوٹی بہن ثومی جلدی سے اندر گئی اور اپنے بستے سے جیومیٹری بکس نکال کر کچھ ڈھونڈنے لگی۔ پھر ایک چینی کا لال رنگ کا چھلا نکال لائی۔

”بھائی میری نشانی۔“ اسے دیکھ کر بڑی کچھ سوچنے لگی اور پھر اس نے اپنا سلائی کڑھائی کا تھیلا دیوار کی کیل سے اتارا اور ایک کڑھائی کیا ہوا رومال نکالا۔ وہ کہنا چاہتی تھی ”میری نشانی“ لیکن اس کا گلا رندھ گیا۔

ماں نے سردیوں میں اسے دینے کے لیے سبز کنی والی گرم چادر لے کر رکھی تھی۔ صندوق میں سے نکالی۔ فنائل کی کئی گولیاں زمین پر لڑھک گئیں۔ کپکپاتی آواز میں بولی۔

''رکھ لے ساتھ۔ خدا جانے وہاں کون کون سے موسم آجائیں۔''

بگا باری باری سب سے گلے ملنے لگا۔ دروازے سے نکلنے لگا، تو ماسٹر صاحب بولے ''ٹھہرنا محمد اکبر۔'' وہ اندر کمرے میں چلے گئے اور اپنی واسکٹ کی جیب سے کچھ نکال کر لائے اور سب حیران رہ گئے۔ یہ وہ تاریخی فاؤنٹین پین تھا جس کے ساتھ ماسٹر صاحب نے خود میٹرک کیا۔ خدا جانے کون سا امتحان دیا تھا اور اسے چھیڑنے پر تقریباً سب کو مار پڑ چکی تھی۔ کسی کو اسے استعمال کرنے یا ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔

''اس کے ساتھ خط لکھتے رہنا'' انھوں نے مضبوط آواز میں کہا اور بہنیں اور ماں ضبط نہ کر سکیں۔ اپنی آوازیں اور آنسو اوڑھنیوں میں چھپانے لگیں۔ ماسٹر صاحب کا سختی سے حکم تھا کہ گھر کی آواز باہر نہیں جانی چاہیے۔

☆......☆

جب ایک روز کچھ فوجی جوان اور افسر ماسٹر جی کے گھر لکڑی کا بہت بڑا بکس، بہت سے اچھے اچھے لفظ اور بہت سارے روپوں کا چیک چھوڑ گئے، تو پہلی دفعہ محلے والوں نے ماسٹر جی کے گھر کی آوازیں باہر سنیں۔

ماسٹر جی نیم غشی کے عالم میں تابوت پر گر پڑے۔ محلے والوں کے سنبھالنے پر کچھ ہوش میں آئے۔ بیٹے کا چہرہ دیکھ کر بے قابو ہوگئے۔ اس کی پیشانی سے گھنگھریالے بال ہٹا ہٹا کر بے تحاشا چومنے لگے۔

''میرا سوہنا...... میرا کنڈلاں والا۔''

ماں یہ آوازیں سن کر اور تڑپ گئی اور بین کرتے ہوئے پڑسنوں سے بولی۔

''جب تک زندہ رہا باپ کی جھڑکیاں ہی کھاتا رہا۔''

کسی نے ماسٹر صاحب کو تابوت پر سے اٹھایا۔

''صبر صبر! صبر کرو...... شہیدوں پر رویا نہیں کرتے......'' شہید!......اس ایک لفظ نے سحر سا پھونک دیا۔ دکھتے ہوئے دل پر جیسے مرہم کا پھاہا رکھ دیا۔ بیٹے کے عظیم مرتبے کے احساس نے ان کے اندر نئی روح پھونک دی۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور باقی لوگوں کے ساتھ مل کر انتظامات میں لگ گئے۔

قبر پر مٹی ڈالنے اور دفنانے کے بعد وہ گورکن سے بات کر رہے تھے۔ خدا جانے کس کی آواز ان کے کان میں پڑ گئی۔ کوئی کسی سے کہہ رہا تھا...... ''دین اور وطن کے لیے مرنے والے تو شہید ہوتے ہیں۔ خبرے ایسی موتیں کس کھاتے میں جائیں گی؟''

ماسٹر جی کے دل میں کسی نے بھالا گھونپ دیا۔ وہ تڑپے اور بیٹے کی قبر پر گر پڑے اور پھر بچوں کی طرح بلکنے لگے۔ لوگوں نے ''صبر صبر'' کہتے ہوئے انھیں اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن چار آدمی بھی انھیں اٹھا نہ سکے۔ وہ بہت دیر تک یونہی پڑے سسکتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے رومال سے چہرہ اور آنکھیں صاف کیں اور قبر کی پائنتی بیٹھ کر یوں بے بسی سے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگے جیسے بگے نے انھیں ایک بار پھر مایوس کر دیا تھا۔

OOO

چھٹا ووٹر

ایک ووٹر کا ماجرا
اس نے شیر والے بابے کو
مشکل میں گھرا دیکھ لیا تھا

بشیر احمد بھٹی

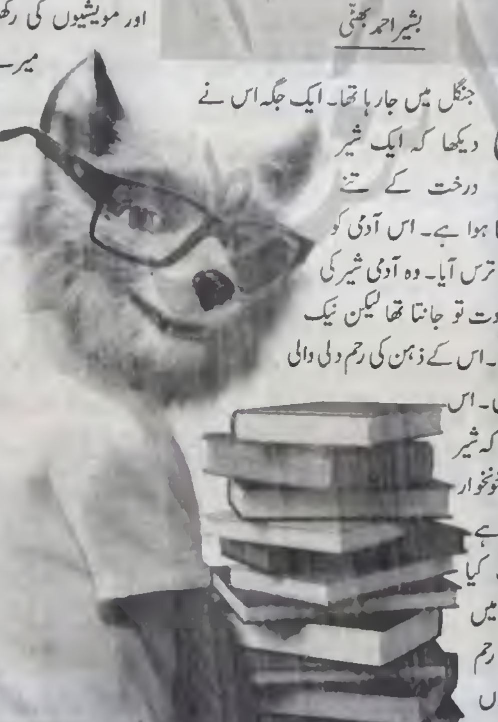

آدمی جنگل میں جا رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے دیکھا کہ ایک شیر درخت کے تنے سے بندھا ہوا ہے۔ اس آدمی کو شیر پر بڑا ترس آیا۔ وہ آدمی شیر کی خونخوار عادت تو جانتا تھا لیکن نیک فطرت تھا۔ اس کے ذہن کی رحم دلی والی رگ پھڑکی۔ اس نے سوچا کہ شیر ایک خونخوار جانور ہے پہ خوب کیا معلوم میں اس پر رحم کھاؤں اور یہ بھی عقل کا استعمال کرے اور شاید مجھے کچھ نہ کہے۔ پیروں میں سر رکھ کے سیس نوائے اور میرا دوست بن جائے۔ جب میں اس دوست کو لے کر انسانی آبادی سے گزروں گا۔ لوگوں میں میری واہ واہ ہوجائے گی۔ مارے خوف کے لوگ گھروں کو بھاگ جائیں گے۔ میں شیر کے سر پر ہاتھ پھیروں گا۔ یہ میرے ہاتھ چاٹے گا۔ مجھ سے اُلفت کرے گا۔ محبت کرے گا۔ میں شیر والا بابا مشہور ہوجاؤں گا۔ جب شیر میرے ہمراہ ہوگا۔ کوئی دشمن مجھے زک، گزند یا نقصان نہیں پہنچائے گا۔ ڈاکو میرے قریب نہیں آئیں گے۔ رات کو شیر کو گھر کے صحن میں کھلا چھوڑ دوں گا۔ لوگ گھر اور مویشیوں کی رکھوالی کے لیے کتے پالتے ہیں۔ میرے گھر کی رکھوالی شیر کرے گا۔ پھر کس میں جرأت پیدا ہوگی کہ وہ میرے گھر کی دیوار پھلانگ کے چوری کرنے آئے گا؟ شیر جب چور کی تکا بوٹی کردے گا، تو لوگوں میں اتنا خوف پیدا ہوجائے گا کہ میرے گھر کا کوئی رُخ بھی نہیں کرے گا۔ کوئی چور غلطی سے آگیا تو ظاہر ہے وہ میرے دوست شیر کا نشانہ بن جائے گا۔ اس طرح پھر کسی چور، ڈاکو کی جرأت نہ ہوگی کہ وہ میرے

گھر کا رُخ کرے۔ میں جب شیر والا بابا مشہور ہوجاؤں گا،تو رات کو جب سب گاؤں والے گھروں میں سوجائیں گے۔ میں شیر کے ہمراہ گاؤں کے اطراف میں چکر لگایا کروں گا۔ جہاں کوئی مشکوک شخص نظر آیا وہ میرے دوست شیر کی خوراک بن جائے گا یا بھاگ جائے گا۔ اس طرح میرا سارا گاؤں چوروں ڈاکوؤں، اٹھائی گیروں سے محفوظ ہوجائے گا۔ گاؤں کے بہت سے لوگوں نے جانور پال رکھے ہیں۔ کسی کے پاس بکریاں ہیں، کسی کے پاس گائیں ہیں،تو کسی کے پاس بھینسیں۔ میں اِن سب سے اعلانیہ کہہ دوں گا کہ میاں میرا شیر دوست تمھارے جانوروں کی رکھوالی کرتا ہے۔تم پر لازم ہے کہ اس کی خوراک کا اہتمام کرو۔ ہفتے میں ایک دو جانور شیر کی شکم سیری یعنی پیٹ پوجا کے لیے دیا کرو۔ وہ نہ مانے،تو میں کچھ دنوں کے لیے شیر کو جنگل میں چھوڑ آؤں گا۔ جب چوروں کو معلوم ہوگا کہ گاؤں میں شیر نہیں ہے،تو وہ دھاوا بول دیں گے۔ جانور چوری ہونا شروع ہوجائیں گے۔اس طرح زِچ ہوکر لوگ میرا مطالبہ مان لیں گے کہ ہم ہر ہفتے میں دو جانور دینے کو تیار ہیں۔اس طرح ہر ہفتے میرے گھر میں دو جانور ذبح ہوا کریں گے۔ بہترین گوشت علیحدہ کرکے میں پکا کر کھا لیا کروں گا۔ باقی شیر کو ڈال دیا کروں گا۔ اس طرح آئے دن میرے گھر گوشت پکا کرے گا۔ میری بیوی بھی خوش ہوگی۔ بچے بھی نہال ہو جائیں گے۔ آہا۔بڑا مزہ آئے گا۔ وہ آگے بڑھا اور شیر کو آزاد کردیا۔ شیر بھوکا تھا۔ وہ آزاد ہوا،تو اس آدمی سے کہنے لگا۔ میرے محسن میں بھوکا ہوں۔ دنیا کا دستور ہے۔ احسان کا بدلہ برائی سے دیتے ہیں۔ میں بھی مجبور ہوں اب تجھے کھاؤں گا اور اپنی بھوک مٹاؤں گا۔ چل تیار ہوجا کہ میں تمھاری تکا بوٹی کرکے ضیافت اُڑاؤں۔اس آدمی نے یہ سنا،تو بہت سٹپٹایا۔ آدمی عقل مند تھا۔اس نے شیر سے کہا بھائی شیر! مجھے بعد میں کرنا ڈھیر۔جنگل کے جانوروں سے رائے یعنی ووٹ حق دہی لے لیتے ہیں۔ اگر تمھارے ووٹ زیادہ ہوجائیں،تو مجھے کھا لینا اور میرے ووٹ زیادہ ہوجائیں،تو مجھے چھوڑ دینا۔

شیر بولا۔ٹھیک ہے۔ آؤ جانوروں سے رائے لیتے ہیں۔ وہ دونوں چل پڑے۔ جنگل میں ایک گائے گھاس کھارہی تھی۔ شیر کو دیکھا،تو وہ بھاگنے لگی۔ شیر بولا۔ بُوا بھاگو مت۔ ہماری کہانی سُن کے ووٹ دو۔ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ گائے رُک گئی۔ بولی شیر بھتیجے۔تم نے مجھے بُوا کہا ہے۔اب میں اپنے ووٹ کا درست استعمال کروں گی۔ بولو۔کیا مسئلہ ہے؟

شیر بولا۔ میں جنگل میں بندھا ہوا تھا۔اس آدمی نے میرے ساتھ نیکی کا برتاؤ کیا۔ مجھے آزاد کردیا۔ مجھے بھوک لگی ہوئی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اس دنیا میں نیکی کا بدلہ برائی سے دیا جاتا ہے۔ میں تجھے کھانا چاہتا ہوں۔ بُوا گائے تم بتاؤ۔ دنیا میں اچھائی کا بدلہ اچھائی سے ملتا ہے یا برائی سے!

گائے بولی۔ بھتیجے۔اس دنیا میں اچھائی کا بدلہ برائی ہے۔ مجھے دیکھو۔انسان دودھ پیتے ہیں۔ میرے بیٹے جب بچھڑے سے بیل بن جاتے ہیں،تو انسان ان سے خوب کام لیتے ہیں۔ پھر ہمیں ذبح کرکے کھا جاتے ہیں۔اس دنیا میں اچھائی کا بدلہ برائی ہے۔تم اسے کھا جاؤ۔میرا ووٹ تمھارے حق میں ہے۔اس طرح گائے کا ووٹ شیر کے حق میں کاسٹ ہوگیا۔

وہ دونوں کسی اور ووٹر کی تلاش میں آگے بڑھے۔ جنگل میں اُن کو ایک لنگڑا بیمار گدھا نظر آیا۔ شیر نے

گدھے سے کہا۔ گدھے میاں یہ بتاؤ۔اس دنیا میں اچھائی کا بدلہ برائی ہے یا نیکی؟ گدھا بولا۔شیر ماموں۔ اس دنیا میں اچھائی کا بدلہ برائی ہے۔ مجھے دیکھ لو۔ میں دنیا والوں کے لیے نشانِ عبرت ہوں۔ انسان تمام عمر مجھ سے کام لیتا ہے۔ میری استطاعت سے زیادہ بوجھ لاد دیتا ہے۔ ڈنڈے مارتا ہے۔ میری پیٹھ اور رانیں زخمی ہوجاتی ہیں۔ جب میں لنگڑا اور لاغر ہوجاتا ہوں۔ مجھے جنگل میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے۔ روکھی سوکھی گھاس پر گزارہ کرتا ہوں۔ اس دنیا میں اچھائی کا بدلہ برائی ہے۔ میرا مشورہ ہے اس انسان کو فوراً کھا جاؤ۔ یہ بڑا ظالم ہے۔ تاخیر نہ کرو۔ ورنہ کسی سیاست سے یہ تمھیں پھرچت کردے گا۔

گدھے کا ووٹ بھی شیر کے حق میں کاسٹ ہوگیا۔ شیر نے اس آدمی سے کہا۔ دو ووٹ میرے حق میں کاسٹ ہوچکے ہیں۔ اب تم زمین پر لیٹ جاؤ تاکہ میں آرام سے تمھیں کھا سکوں۔

وہ آدمی بولا۔ شیر میاں۔ دس ووٹ کاسٹ کرائے جائیں۔ اگر چھ ووٹ تمھارے حق میں ہوں اور چار میرے حق میں تو میں اپوزیشن جماعت بن جاؤں گا۔تم مجھے کھا لینا۔ اگر چھ ووٹ میرے حق میں کاسٹ ہوگئے چار تمھارے حق میں ہوئے،تو تم ہار گئے۔ اگر دونوں کو دس جانوروں کے ووٹ مساوی ملے یعنی پانچ پانچ ووٹ۔" تو الیکشن نئے سرے سے ہوگا۔

شیر بولا۔ ٹھیک ہے۔ وہ دونوں ایک بار پھر آگے بڑھے۔ درخت کی ایک ڈال پر بندر جھولا جھول رہا تھا۔ بندریا قریب بیٹھی اپنے خاوند کی اچھل کود دیکھ رہی تھی۔ شیر نے کہا۔ اوئے۔ ککوری نسل۔ اچھل کود بند کر اور میری بات غور سے سن۔ بندر نے اچھل کود بند کردی۔

یہ بتا بھورے خاں۔ اس دنیا میں نیکی کا بدلہ اچھائی ہے یا برائی؟

بندر دور اندیش تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ معاملہ اس انسانی حق کی نجات کا ہے۔ وہ فوراً بولا۔ دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں۔ سب ہمارے دشمن ہیں۔ پچھلے مہینے یہاں چند شکاری آئے۔ میری بیوی اور میں نے ناریل توڑ کر اُن کی طرف پھینکے تاکہ ناریل کھائیں اور ناریل کا پانی پی کر پیاس بجھائیں۔ انھوں نے ہماری نیکی کا بدلہ یہ دیا کہ ہمارے بچوں کو اُٹھا کر لے گئے۔ یہ انسان ہمارے بچوں کو چڑیا گھر میں بند کردیتے ہیں یا پھر اُن کو بازاروں میں نچاتے ہیں۔ جب سے ہمارے بچے اغوا ہوئے ہیں۔ میری زوجہ اُن کے غم میں اچھل کود بھول گئی ہے۔ جنگل کے بادشاہ فوراً میرے سامنے اس انسان کی تِکا بوٹی کرڈالو۔ میرا ووٹ آپ کے حق میں ہے۔ یہ سن کر شیر
6 بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے محسن سے کہا۔ سُن لیا تم نے۔ بندر نے کیا کہا ہے؟ چلو چوتھا ووٹر ڈھونڈتے ہیں۔ وہ آگے بڑھے۔ انھیں جنگل میں ایک ہرنی نظر آئی۔ شیر کو دیکھ کر ہرنی بھاگنے لگی،تو شیر نے حکم دیا۔ رُک جاؤ۔ میں جنگل کا بادشاہ تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ صرف یہ بتا دو کہ اس دنیا میں نیکی کا بدلہ اچھائی ہے یا برائی؟

ہرنی بولی۔ یہ پرسوں کی بات ہے۔ چند شکاری جنگل میں آئے۔ میرے سرتاج کو گولی ماری۔ ذبح کیا اور ساتھ لے گئے۔ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے اس کے ذائقے دار گوشت کے تِکے بنا کے کھائیں گے۔ کھال کے خوبصورت جوتے بنائیں گے۔ یہ انسان بڑے ظالم ہیں۔ جنگل کے بادشاہ اس دنیا میں نیکی کا بدلہ برائی ہے۔ آخر میں نے اِنسانوں کا کیا بگاڑا ہے۔ جو انھوں نے مجھے جوانی میں بیوہ کردیا۔ میں تو کہتی

ہوں۔ یہ انسان جو تمھارے ساتھ کھڑا ہے اسے فوراً ہڑپ کرو۔ شیر نے جب یہ سنا، تو وہ بہت خوش ہوا۔ چار ووٹ اس کے حق میں کاسٹ ہو چکے تھے۔ دو ووٹ پر اس نے الیکشن جیتنا تھا۔ وہ آگے بڑھے۔ ایک ڈال پر انھیں طوطا نظر آیا۔ شیر نے طوطے سے کہا۔ طوطے میاں۔ یہ بتاؤ۔ اس دنیا میں نیکی کا بدلہ اچھائی ہے یا بُرائی؟

طوطا بولا۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ اچھے اچھوں کو بغیر قصور کے قیدی بنا لیتی ہے۔ میری بیگم کو قدرت نے کئی بیٹے بیٹیاں عطا کیں۔ ظالم اِنسانوں کے بیٹے آتے ہیں اور درخت میں بنے سوراخ سے میرے بچوں کو نکال لے جاتے ہیں اور تمام عمر کے لیے پنجروں میں قید کر دیتے ہیں۔ آخر ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟ جنگل کے بے تاج بادشاہ یہ جو اِنسان تمھارے ساتھ کھڑا ہے اسے فوراً معدے کا قیدی بناؤ۔ اس کے چکر میں آ گئے، تو شہر میں جو سرکس دکھائی جاتی ہے۔ وہاں پہنچ جاؤ گے اور روز ہنٹر کھاؤ گے۔ دیر مت کرو۔ میرے تایا۔ جو دیر سے آیا۔ اس نے زیادہ کھایا......'' طوطے کا پانچواں ووٹ شیر میاں کے حق میں کاسٹ ہوا، تو وہ پھولے نہیں سمایا۔ اب ایک اور ووٹ اسے ملنا باقی تھا۔ شیر نے اپنے محسن سے کہا۔ آگے بڑھو۔ چھٹا ووٹر ڈھونڈتے ہیں۔ بس یوں سمجھو۔ تمھاری موت کا وقت قریب آ چکا ہے۔ میں چاہتا، تو تجھے اسی وقت ہڑپ کر جاتا۔ تمھارے کہنے پر یہ الیکشن ہوا ہے۔ پانچ ووٹ میرے حق میں کاسٹ ہو چکے ہیں۔ اب تو وہ آدمی بہت گھبرایا اور سوچنے لگا۔ گوشت کی لالچ نے مجھے پھنسا دیا۔ پھر اس نے شیر سے کہا۔ مجھ سے دوستی کر لو۔ تم بھی عیش کرو گے اور میں بھی عیش کروں گا۔ تمھاری دوستی سے مجھے گاؤں والے ہفتے میں دو بکریاں دیں گے۔ ہم پیٹ بھر کے گوشت کھایا کریں گے۔ پھر اس نے وہ ساری کہانی شیر کو سنا دی جو دل میں سوچ رکھی تھی۔ شیر بولا۔ تم مجھے چکمہ دینے کی کوشش نہ کرو۔ میں کیا جنگل کے سارے جانور تم جیسے اِنسانوں کی چالاکیوں سے تنگ ہیں۔ تم اب کوئی نئی چال چل کے مجھے پھنسانے کے چکر میں ہو؟ دوستی کرنی تھی، تو شروع میں کرتے۔ الیکشن مہم میں خوار کر کے اب جب تم الیکشن ہارنے والے ہو تو نئی چالبازی پر اُتر آئے ہو۔ آگے بڑھو۔ چھٹا ووٹر ڈھونڈتے ہیں۔ اس آخری ووٹ پر تمھاری زندگی کا دارومدار ہے۔ ہاں اگلے پانچ ووٹ تمھارے حق میں کاسٹ ہوئے، تو الیکشن نئے سرے سے ہوگا۔ ہمت سے کام لو۔ تمھارا جسم کیوں کانپ رہا ہے؟ شیر اپنے محسن کی ڈھارس بندھاتے ہوئے بولا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چھٹے ووٹر کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ وہ چند ہی قدم چلے تھے کہ بی لومڑی سے اُن کا سامنا ہو گیا۔ شیر نے لومڑی سے کہا۔ بی لومڑی یہ بتاؤ۔ دنیا میں اچھائی کا بدلہ برائی ہے یا اچھائی؟

لومڑی شیر کا سوال سن کر کسی سوچ میں گم ہو گئی! شیر بولا۔ جواب دو۔ بی لومڑی اور یہ بھی بتاؤ کہ تم اتنا عرصہ کہاں غائب رہی ہو؟

لومڑی بولی۔ عالی جاہ! میں نے جب گریجوایشن تک تعلیم حاصل کر لی، تو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلی گئی تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کل ہی اپنے ملک پہنچی ہوں۔''

واہ۔ تم بہتر فیصلہ کر پاؤ گی کیوں کہ تم تعلیم یافتہ ہو نا۔ شیر بولا۔

دماغی طور پر میں کچھ تھکی ہوئی ہوں۔ عالم پناہ آپ کا سوال غور سے نہیں سُنا۔ براہِ مہربانی اپنا سوال

دہرائیں، لومڑی بولی۔

شیر بولا۔ بی لومڑی! سوال یہ ہے کہ اس دنیا میں اچھائی کا بدلہ برائی ہے یا اچھائی؟

لومڑی بولی۔ اس سوال کا جواب میں اس وقت تک دینے سے قاصر ہوں جب تک اچھائی، برائی کا بہ چشم خود معاینہ نہ کر لوں۔

شیر بولا۔ پچھلے دن میں نے کافی پرانا اور باسی گوشت کھا لیا تھا۔ جو میری سرشت کے خلاف تھا۔ گوشت کھا کے میں بے ہوش ہو گیا۔ شکاری آئے اور انھوں نے مجھے درخت سے باندھ دیا۔ وہ ٹرک لینے چلے گئے تاکہ مجھے پنجرے میں ڈال کر شہر لے جائیں اور سرکس والوں کے حوالے کر دیں۔

ان کے اس ارادے کا آپ کو کیسے علم ہوا؟ لومڑی نے سوال کیا!

شیر بولا۔ شکاری مجھے باندھ کے باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔ ایک چیونٹی نے اُن کی گفتگو سُن لی اور میرے کانوں میں اُن کے ارادوں کی بھنک ڈال دی۔ میں بہت پریشان تھا کہ مضبوط رسیوں سے کیسے چھٹکارا حاصل کروں؟ اتنے میں یہ آدمی آیا اور مجھے آزاد کر دیا۔ یوں میری پریشانی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس نے میرے ساتھ نیکی کی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میں تمھاری اس نیکی کا بدلہ بُرائی سے دوں گا۔ یہ دنیا کا دستور ہے۔ میں تجھے کھاؤں گا اور بھوک مٹاؤں گا۔ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس نے مشورہ دیا کہ دس جانوروں کی رائے لے لیتے ہیں۔ اگر دس میں سے چھ نے تمھارے حق میں فیصلہ دے دیا، تو تم مجھے کھا جانا۔ پانچ جانوروں نے میرے حق میں فیصلہ دیا ہے کہ اس دنیا میں اچھائی کا بدلہ برائی ہے۔ اب یہ چھٹا ووٹ تم اگر میرے حق میں دو گی، تو سمجھو۔ میں الیکشن جیت گیا۔ میں ابھی اسے کھا لوں گا۔

لومڑی بولی۔ عالم پناہ! آپ واپس چلیں۔ اس درخت کے ساتھ یہ آدمی آپ کو اسی طرح باندھے گا۔ جس طرح آپ بندھے ہوئے تھے۔ پھر یہ آپ کو میرے سامنے کھولے گا۔ میں اپنی آنکھوں سے اس نیکی کا نظارہ دیکھوں گی۔ پھر فیصلہ کروں گی۔

شیر بولا۔ بصدق شوق۔ چلیے!

شیر، اس کا محسن اور لومڑی اس درخت کے پاس پہنچے۔ شیر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور درخت سے ٹیک لگا لی۔ لومڑی نے اس آدمی سے کہا۔ عالم پناہ کو اُسی طرح باندھو جس طرح یہ بندھے ہوئے تھے۔ رسیاں نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ اس آدمی نے بڑی مضبوطی کے ساتھ شیر کو درخت سے باندھ دیا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ گیا اور لومڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ عالم پناہ اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔ آپ نے دیکھ لیا۔ اب اجازت ہو، تو آپ کو کھول کے دکھاؤں!

لومڑی بولی۔ اب عالم پناہ کو اسی حال میں رہنے دو۔ تم تو جانتے ہو۔ اس دنیا میں نیکی کا بدلہ برائی ہے۔ اب اگر تم نے عالم پناہ کو کھولا تو یہ تمھیں کچا چبا جائیں گے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ لومڑی نے شیر کے محسن سے کہا۔ وہ سامنے دیکھو۔ دھول اُڑ رہی ہے۔ لگتا ہے۔ شکاری آ رہے ہیں۔ میاں اب کھسک لو۔ میں کل ہی تو آکسفورڈ یونیورسٹی امریکا سے تعلیم حاصل کر کے لوٹی ہوں۔ سیاسی تعلیم جس میں امریکا دنیا بھر میں عروج پر ہے۔ لومڑی وہاں سے کھسک گئی۔ شیر کو باندھنے والا بھی ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ شیر نے دیکھا۔ شکاریوں کا ٹرک دھول اُڑاتا ہوا اس کی طرف آ رہا ہے۔ وہ سمجھ گیا۔ چھٹے ووٹر نے دھوکے سے اُسے ہرا دیا ہے۔''

○○○

روپہلا عشق فسانہ ہے

ایک طوفانی محبت کا عبرت اثر ماجرا۔ اس نے عین موقع پر اپنا ارادہ بدل دیا تھا

رابعہ شاہ

"یہ کس کا ہے؟"

میں اپنی جھلنگا چارپائی میں دھنسی مزے سے ٹیگور کا اُردو ترجمہ پڑھ رہی تھی جب امی جی نے گرجدار آواز کے ساتھ رجسٹر کا ایک بڑا سا ورق میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

اُچھل تو میں امی کی غضب ناک آواز سُن کر ہی پڑی تھی مگر جب میں نے رجسٹر والے ورق کی تحریر کو پہچاننے کی کوشش کی، تو میرے پیروں تلے سے زمین بھی سرک گئی۔

"کس کا ہے یہ؟" امی جی نے پھر پوچھا پہلے سے بھی زیادہ غصے سے۔ جج...... جج...... جی...... م...... میرا نہیں ہے یہ؟" میرے حلق سے ہکلاتی ہوئی آواز بمشکل برآمد ہوئی۔

"یہ تمہارا ہی ہے......" امی جی نے کاٹ دار آواز میں ایک ایک لفظ یوں ادا کیا کہ میرے شریر کے روم روم سے پسینہ چھوٹ پڑا۔ "کیا میں تمہاری لکھائی نہیں پہچانتی...... میں نے تمہیں ہاتھ پکڑ کر لکھنا سکھایا ہے۔ سیکڑوں بار ایک ایک لفظ پر قلم پھروایا ہے۔ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو تم......؟"

"ام...... امی جی...... میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" میں منمنائی بالکل اپنی سفید ٹیڈی بکری کے ننھے والے میمنے کی طرح۔ اور پھر دل میں بڑبڑائی۔

"امی جی آپ نے جھوٹ بولنا سکھایا بھی کہاں ہے۔"

میں دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی جب میں نے اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ مجھے لکھنے کی لت شروع ہی سے تھی،

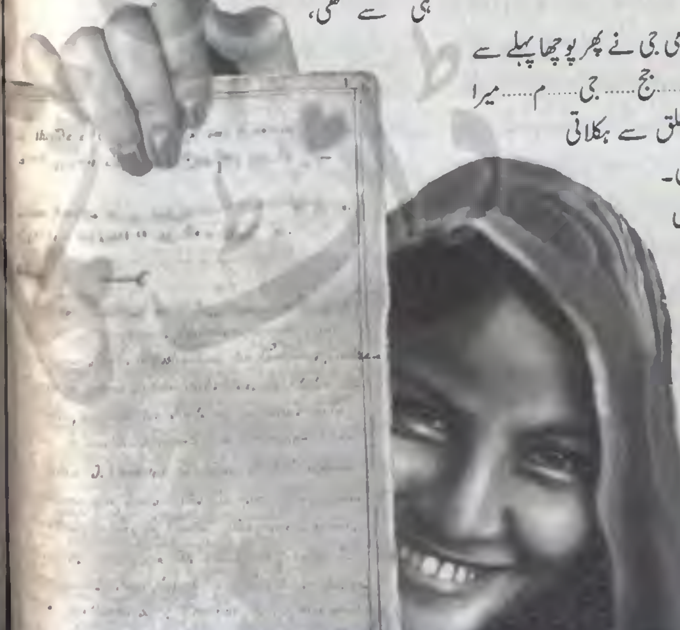

کہانیاں، مضامین، شاعری...... مگر رجسٹر کا یہ ورق نہ میری کسی کہانی کا پارٹ تھا نہ محض شاعری تھی۔ یہ ورق اُردو "ب" کے رجسٹر سے پھاڑا گیا تھا جس میں مضمون، درخواستیں، چچا، دوست وغیرہ کو خطوط لکھے گئے تھے۔ مگر یہ "محبت نامہ" ہرگز ہرگز چھٹی جماعت کے سلیبس میں شامل نہ تھا" اگر اب ہوگیا ہو تو کچھ خبر نہیں۔"

جی ہاں یہ ایک عدد "لَو لیٹر" تھا۔ اور امی جان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ آج مجھے سمجھ آیا کہ عملی طور پر چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا کیا مطلب ہے اور اس قسم کی سُوسائیڈ کمٹ (Suicide Commit) کرنے کا مقام کب اور کیسے آتا ہے۔

اس وقت میں نے اپنے دماغ میں کلبلانے والے کیڑے کو جو مجھے کاٹ کاٹ کر لکھنے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ بڑا لعن طعن کیا دل چاہ رہا تھا اگر وہ کیڑا میرے ہاتھ میں آجائے، تو اسے دادی کی مرغیوں کے آگے ڈال دوں جو اسے چٹ پٹ کھینچا تانی کر کے نگل جائیں اور دوبارہ کبھی قلم کو ہاتھ ہی نہ لگاؤں۔ امی حضور کے سامنے ایسی ذلت میں نے آج تک محسوس نہ کی تھی۔

لکھنا اور پڑھنا دو ہی شوق تھے میرے اور شاید اسی کی بنا پر آج ایک چھوٹی سی غلطی بہت بڑی بن گئی اور مجھے خوابوں کی دنیا سے نکال کر حقیقت میں لا پٹخا...... بلکہ آسمان سے زمین پر گرا دیا۔

ہمارے گھر میں پڑھنے لکھنے والا ماحول تھا۔ ہوتا بھی کیوں نا؟ میرے ابو جان مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ امی ہائی اسکول کی ٹیچر تھیں۔ دادی جان نے انگریزوں کے زمانے میں پڑھا تھا اور ساری عمر ٹیچنگ کی تھی۔ میرے پردادا یہاں کی مسجد کے پہلے امام تھے (شاید اسی لیے ابو جان کو حلوے اُوجھڑی، سری پایوں سے خاص رغبت تھی) اور دادا جان بھی کافی بڑے اِسکالر رہے تھے۔ حکمت بھی جانتے تھے۔ سو ہمارے گھرانے کو شہر بھر میں بڑی عزت و اکرام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

ہمارے آباؤ اَجداد کی اسی علم سے محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ گھر میں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ بے پناہ کتابیں...... ہر موضوع اور ہر سائز کی کتاب ہمارے گھر میں موجود تھی۔ طب اور حکمت سے لے کر ہومیو پیتھی کی کتب، اقبال، غالب اور حالی کے کلام سے لے کر فیض کی شاعری تک، انگریزوں کے زمانے کی خانہ داری کی کتابوں سے لے کر اسکاؤٹنگ تک، ابنِ بطوطہ کے سفرناموں سے نسیم حجازی کے ناولوں تک، قصص الانبیا سے لے کر حکایات رومی تک، سنن ابی ماجہ و داؤد سے لے کر لولو والمرجان تک، کرشن چندر، ممتاز مفتی، منٹو، ٹیگور، انشا وغیرہ سب موجود تھے۔

تازہ ترین اضافہ اشتیاق احمد کے جاسوسی ناولوں علی عمران سیریز اور سائنسی ڈائجسٹوں کا تھا۔

اس خزانے میں بڑی پُرانی پُرانی اور شاہکار و نادر و نایاب کُتب بھی موجود تھیں۔ دادا پردادا کی ہاتھ سے لکھی فارسی اور عربی کی ڈھیروں کتابیں اور نسخے رکھے تھے۔ جن کا رنگ بتدریج زردی مائل بھورا ہوتا جارہا تھا۔ بہت سی کُتب پر کپڑے کے بدرنگ بوسیدہ کور چڑھے تھے جو ذرا سخت ہاتھ لگنے سے پھٹ جاتے۔ کبھی کبھار دادی جان آٹے کی لئی بنا کر موٹا سا سوئی دھاگا لیے کسی کتاب کی جلد کردیا کرتی تھیں، تو کبھی گتے کے کور پر اُبری چپکاتی نظر آتیں۔ گرمی میں ہم چھٹیوں کے کام والے دستے بھی دادی جان سے جلد بند کروایا کرتے تھے۔

بے پناہ کتابوں کا ذکر سن کر آپ کے ذہن میں

یقیناً ایک منظم گھریلو لائبریری یا خوبصورت بڑی سی اسٹڈی کا تصور آیا ہوگا جس کے اندر پرانی لکڑی کی دیوار گیر الماریاں سجی ہوں گی شیشے کے پٹوں والی اور ان میں ڈھیروں کتابیں بھری ہوں گی اور......

لیکن نہیں ایسا کچھ بھی نہیں تھا ہمارے گھر میں۔ یہاں تو ہر کونے میں کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ الماریوں میں میزوں کے اوپر، دادی کے تخت پر، ابو کے سرہانے، طاقوں میں، بڑی چھتی پر، یہاں تک کہ باورچی خانے کی آدھی الماری بھی کتابوں سے بھری تھی۔ صندوقوں اور پیٹیوں میں بھی کتابیں ہی کتابیں بھری تھیں۔

ایک بار ہمارے گھر میں چور گھس آئے۔ سارے بکس، پیٹیاں کھولنے پر بھی انھیں کچھ نہ ملا اتنے شرمندہ اور بدحواس ہوئے کہ اپنی سائیکل بھی چھوڑ گئے بے چارے۔ غرض یہ کہ کتابیں ہی ہمارے گھر کا اثاثہ اور سرمایہ تھیں۔ اور فخر بھی۔ اور کتابوں کا اصل خزانہ تو ایک اسٹور میں موجود تھا۔ اسٹور بھی کیا تھا۔ کسی زمانے میں پرانا سا برآمدہ ہوا کرتا تھا جس کے سامنے دیوار چن کر لکڑی کا دروازہ لگا دیا گیا تھا اور دونوں اطراف کے جھروکوں میں اینٹوں کے ٹکڑے پھنسا کر لیپائی کر دی گئی تھی اور چوتھی طرف پہلے ہی بند تھی۔

اس اسٹور میں جست کے بڑے بڑے پتیلے، پیتل کی قلعی شدہ پراتیں اور تسلے، کانسی کی گاگریں، بڑے بڑے جناتی سائز کے سُرخ مٹکے، چھوٹے چھوٹے کوزے اور پرانے گھڑے، تنکوں کے چھاج، گندم کے توڑے، آٹے کا ڈرم، ایک مٹی کا تندور، بڑی سی چکی کے بھاری بھاری پاٹ، آٹے کی سویاں بنانے والی ''گھوڑی'' جسے میٹھی عید پر نکالا جاتا تھا اور چارپائی کے سیروا میں پھنسا کر میدے کی سویاں بنائی جاتیں پھر ان سویوں کو خشک ہونے کے لیے چارپائیوں پر دھلی چادریں بچھا کر ڈال دیا جاتا۔

اس اسٹور میں ضرورت کی ہر چیز مل جایا کرتی تھی (ڈھونڈنے پر) جیسے درانتیاں، بسولے، کھرپے، کڑچھے، بوریاں اور گٹو، بانس مدھانی، رسیاں وغیرہ وغیرہ۔

یہاں لکڑی کی دو پرانی پیٹیاں اور ایک بڑا جستی صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کچھ گتے کے ڈبوں میں بھی کتابیں ٹھنسی تھیں۔ جن میں زیادہ تر نصابی کُتب اور ڈائجسٹ رسالے وغیرہ تھے۔

یہ اسٹور گرم لمبی دوپہروں میں میرا اور بھڑوں کا پسندیدہ ٹھکانہ ہوتا تھا۔ میں یہاں ایک جھلنگا سی چارپائی پر پڑ کر کتابیں چاٹا کرتی اور وہ زوں زوں کرتی اپنے چھتے بڑھایا کرتی تھیں۔ چھوٹے وقتوں میں......میرا مطلب ہے جب ہم بچے ہوا کرتے تھے تو چپل لے کر بھڑ مارنے اور نفل ثواب کمانے کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ اب مجھے بھڑوں سے کوئی خاص عداوت یا رغبت نہیں رہی تھی کیونکہ ان کے کاٹنے کی اتنی عادت ہو چلی تھی کہ گرمیوں میں کبھی میری آنکھیں سوج کر بند ہوئی ہوتیں کبھی چہرا چینیوں جیسا لگتا کبھی میرے لیے پلنگ یا چارپائی پر تشریف رکھنا ممکن نہ ہوتا......

بس مجھے چڑ تھی تو اس اسٹور میں کُھسر پُھسر کرتے چوہوں سے جو میری محبوب کتابوں کے دشمن تھے۔ معاف کیجیے گا بات چلی تھی لکھنے پڑھنے اور محبت نامے سے اور آن پہنچی چوہوں تک۔ حالانکہ چوہوں کا محبت سے تو کوئی تعلق نہیں (کیا پتا ہو بھی......وہ بھی آپس میں محبت کرتے ہوں......آخر کو اللہ کی مخلوق ہیں نا انھیں بھی محبت کرنے کا پورا حق ہے)۔

قصہ مختصر اسی اسٹور سے مجھے پڑھنے کی لت لگی۔

ہیں لکھنے کا کیڑا جاگا۔ شاعری اور انشا پردازی کی کتب پڑھ پڑھ کر۔ بچپن ہی میں قافیہ، ردیف، وزن، بحر اور مشکل ترین الفاظ سے اچھی خاصی شناسائی ہو گئی تھی جبھی تو اُردو کے پیپر میں مجھے سو بٹا سو نمبر ہی ملا کرتے تھے جو کسی اور کو نہیں ملتے تھے)۔

اسی اسٹور میں مطالعہ کرتے کرتے لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور انہی کتب نے مجھے اپنی دنیا میں یوں سمو لیا کہ مجھے کائنات کی سب سے پیاری چیز کتاب لگا کرتی تھی۔ یہ دوستی آج بھی چھوڑے نہیں چھٹتی۔ انہی کتابوں کی بدولت میرا علم ہم عمر بچوں اور ہم جماعتوں سے کہیں زیادہ تھا۔ میری ٹیچرز مجھ سے نوٹس لکھوا کر باقی کلاس میں بانٹا کرتی تھیں۔

ویسے بھی
کتابوں کے جنگل میں
بسنے والے
تخیل کی آلتی پالتی مارے
کنول آسن میں بیٹھے
سادھو صفت من چلے سودائی
کتنی جلدی
وقت سے پہلے
بوڑھے ہو جاتے ہیں......

......☆......

''یہ صلہ دیا تم نے ہمارے اعتبار اور پیار کا......؟ تمھاری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی؟'' امی جان بھگو بھگو کر مار رہی تھیں اور میں آنکھوں میں آنسو لیے کانپتی ٹھر رہی۔

میں تو اپنے والدین کا اعتبار توڑنے کا تصور بھی نہیں رکھتی تھی۔ ''باپ دادوں کی عزت کو مٹی میں ملانے سے پہلے کچھ تو سوچا ہوتا؟'' ہائے امی جی......میں تو اس وقت شرم سے زمین میں گڑ گئی۔ اپنے والدین کا سر نیچا ہونے کا تصور ہی مجھے روح تک لرزا گیا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ نظریں اُٹھا کر اپنی والدہ کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ سکوں۔ مجھ سے تو بولا بھی نہ جا رہا تھا۔ بھلا امی کو کتنا بڑا شاک لگا ہوگا۔ کتنا دکھ ہوا ہوگا۔ جب اُنھوں نے یہ خط میرے رجسٹر میں پایا ہوگا۔ میں نے اس وقت اتنی ذلت محسوس کی جتنی زندگی بھر نہ کی تھی۔ میں اس وقت کو پچھتائی جب میں نے یہ خط لکھا تھا۔

میرے گھرانے کو تو شہر بھر میں بڑی عزت اور تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی ماں، بیٹی، بہو یا بہن میری والدہ کی شاگرد رہ چکی تھی۔ ورنہ گھر کا کوئی نہ کوئی لڑکا، بھائی، بیٹا میرے والد کا شاگرد تھا۔ ان کے حوالے سے سب مجھے بھی جانتے تھے اور میری بھی عزت کرتے تھے۔ حالانکہ میں بچی ہی تھی تب میں اسکول سے پیدل آیا کرتی، تو گلی کے لوفر ترین لڑکے بھی راستہ چھوڑ کر تمیز سے کھڑے ہو جاتے اور ایک دوسرے کو چُپ کرواتے۔

''خاموشی سے کھڑے ہو جاؤ ماسٹر صاحب کی بیٹی آ رہی ہیں۔'' کبھی امی کے ساتھ تانگے، رکشے میں بیٹھتی تو کوچوان یا رکشے والا امی کو ان کے رعب یا شاید برقع ہی سے پہچان جاتا اور پھر پیسے نہ لیتا کہ ''جی آپ میری بیٹی کی استانی ہیں میں یہ بے ادبی کیسے کر سکتا ہوں؟ آپ کا تو جی میرے پر بڑا احسان ہے۔''

اس زمانے میں علم اور عالم کی قدر اور رتبہ بہت زیادہ ہوا کرتا تھا۔ ویسے یہ کچھ زیادہ پُرانی بات بھی نہیں ہے۔ بیس، پچیس سال ہی تو ہوئے ہیں۔ اب تو بس عزت اسی کی ہے جس کے پاس پیسہ ہے، عالیشان

بنگلوز ہیں، لش لش کرتی گاڑیاں ہیں۔

''سچ امی...... جھوٹ نہیں...... یہ میرا نہیں......'' میں نے ہمت مجتمع کی اور مَری ہوئی آواز میں صفائی دینے کی کوشش کی۔ مجھ سے اب اور ذلت برداشت نہیں ہورہی تھی۔

امی کا ہاتھ اُٹھا اور انھوں نے میرا کان پکڑ لیا۔ شدتِ ضبط کی لرزاہٹ میں اُن کے ہاتھ میں بھی محسوس کرسکتی تھی۔

میں کبھی تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ میری بیٹی...... میری بیٹی...... میری اولاد...... ایسا...... ایسا بھی کرسکتی ہے۔

بولو یہ سب کیا ہے؟ کون ہے وہ......؟''

آہ...... میں مزید کٹھنائیوں میں آگری...... یہ سننا بھی باقی تھا۔

''امی میرا یقین کریں یہ میں نے لکھا ضرور ہے مگر یہ میرا نہیں؟''

اب کے سچ میرے منہ سے نکل ہی آیا۔ امی میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا یہ کسی اور کے لیے لکھا تھا میں نے۔''

ماں باپ کا سر نیچا کرنے کا میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ ان کی محبت اور اعتبار کو میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی تھی۔

''میں کوئی ایسا کام کر ہی نہیں سکتی امی جس سے آپ لوگوں کے مان کو ٹھیس پہنچے؟'' میں نے امی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''پھر کس کا ہے؟'' کسی کو لکھ کر دیا ہے؟'' امی کا لہجہ قدرے نرم ہوا۔ میں نے سر ہلایا دائیں بائیں بھی اور اوپر نیچے بھی۔ مگر معلوم نہیں ہاں میں پہلے ہلایا ناں میں۔

''بتاؤ مجھے کس کا ہے؟ کسی کلاس فیلوز کے لیے لکھا ہے؟'' ''وہ امی جی میں نے وعدہ کیا ہے'' میں ڈرتے ڈرتے بولی جیسے وہ ابھی جوتا اُٹھا کر میرے سر پر مار دیں گی۔

وعدے کی پاسداری بھی تو اُنھوں نے مجھے سکھائی تھی۔

''ٹھیک ہے'' امی نے ایک حتمی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور کان چھوڑ کر بولیں۔

''میں کل یہ تمھاری ٹیچر کے پاس لے کر جاؤں گی اور اُسی سے پوچھ لوں گی۔''

اس دھمکی پر میرے اوسان ہی نہیں اور بھی کچھ خطا ہوتا نظر آیا۔ میں نے پاؤں پر پاؤں رکھ کر جڑے ہوئے ہاتھوں کو اُونچا کیا۔

''نہیں امی پلیز...... ایسا نہیں کرنا...... پلیز امی۔''

اسکول میں کتنی عزت تھی میری، ساری کلاس فیلوز پر رعب تھا۔ اُستانیاں تک مجھ سے امتیازی سلوک کرتی تھیں کہ وہ سب میری والدہ کی شاگرد رہ چکی تھیں۔

اس خطرناک بلیک میلنگ پر آخر میں نے امی کو سچ بتا ہی دیا۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ امی کے پاس بہت سی لڑکیاں پڑھنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ جب سے امی نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لی تھی وہ اب گھر پر سارا دن لڑکیوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ ان لڑکیوں میں زیادہ تر تعداد ان غریب لڑکیوں کی ہوتی تھی جنھوں نے اسکول کی شکل تک نہ دیکھی تھی، امی انھیں گھر پر پانچویں، مڈل اور میٹرک کی تیاری کرواتیں اور پرائیویٹ امتحان دلوا کر ان کا مستقبل سنوارا کرتیں۔

ان میں ایک لڑکی لالی بھی تھی۔ اسے کچھ ہی دن ہوئے تھے امی کے پاس آتے۔ مجھے اس کا چہرہ یاد کرنے کے لیے ذہن پر زیادہ زور نہیں دینا پڑتا۔

آنکھیں بند کیے بنا ہی اس کا چہرہ دیکھ سکتی ہوں۔

موٹی موٹی آنکھیں رنگت بہت سفید تو نہ تھی مگر ٹھیک ہی تھی۔ چہرے پر بھورے ننھے ننھے تل تھے۔ بال بھی سیاہ اور سلکی نہ تھے مگر لمبے ضرور تھے۔ ان میں پراندے ڈالا کرتی تھی وہ۔ لباس کبھی تو بہت عام سا، مسلا ہوا ہوتا، اس سے عجیب مہک آتی، جیسے ابھی تندور سے روٹیاں پکا کر ہٹی ہو اور کبھی شوخ رنگ کے ریشمی کپڑے جو نہ قیمتی ہوتے نہ نئے لگتے۔ مگر صاف ستھرے ضرور ہوتے۔

وہ مجھ سے پانچ چھ سال بڑی ہوگی مگر جب بھی اسے موقع ملتا مجھ سے دوستی گانٹھنے کی کوشش کرتی۔ کبھی میرے لیے باجرے کی چُوری لے آتی۔ کبھی کٹوری میں مچھلی کا سالن لے آتی۔ کبھی سرسوں کا ساگ خوب سارا مکھن ڈال کر اور میں بھی بڑے شوق سے کھا جاتی۔ اس کے ہاتھ کی کڑھی بہت مزے کی ہوتی تھی۔ امی نے ایک دن اس کو خاص طور پر میرے لیے بلوایا کہ میں اس سے کڑھی بنانا سیکھنا چاہتی تھی۔ وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ فوراً آگئی۔ ساتھ میں بالٹی بھر گاڑھی لسی لیتی آئی کہ بقول اس کے کھٹی اور گاڑھی لسی کی کڑھی، دہی والی کڑھی سے زیادہ مزے کی ہوتی ہے۔ اور یہ سچ بھی تھا۔ وہ لسی کو ایک سہ پہر کے لیے یونہی رکھ چھوڑتی پھر اس کا پانی نتھار کر پھینک دیتی اور اس میں بیسن گھول لیتی۔ کڑھی بنانے کے لیے اس نے بس ایک پیاز اور ٹماٹر کا مسالحہ بنایا اس میں پسی سُرخ مرچیں، نمک، موٹی کُٹی سرخ مرچ، سفید زیرہ، کُٹا ہوا دھنیا اور کافی ساری ہلدی اور ڈھیر سارا کُٹا ہوا دانہ، کٹوری جتنے پانی میں مکس کر کے ڈال دیا۔ پھر بالٹی بھر لسی میں پانچ چھ چمچ بیسن کے اچھی طرح گھولے اور اسے مسالحے میں ڈال کر دو تین گھنٹے ہلکی آنچ پر پکنے دیا۔ ساتھ آلو کی باریک ورقیاں کاٹیں اور بیسن میں اجوائن، نمک، لال مرچ گھول کر پکوڑے تل کر پکی ہوئی کڑھی میں ڈال دیے۔ میں آج بھی اسی طرح سے کڑھی بناتی ہوں جو بہت اچھی بنتی ہے۔ اس دن کے بعد سے میں بھی لالی کے ساتھ بے تکلف ہوگئی۔ اگرچہ ایک امتیاز اور فاصلہ پھر بھی باقی تھا۔ مگر اس نے ثابت کردیا تھا کہ جس طرح میں پڑھائی میں اس کی مدد کیا کرتی تھی۔ وہ بھی مجھے کچھ سکھا سکتی ہے۔ پھر میں نے اُس سے کروشیے کے پھول اور پراندے بھی بنانے سیکھے۔ امی جان نے بھی اس پر اعتراض نہ کیا ورنہ مجھے بچپن ہی سے محلے کے بچوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ ہمارے گھر کا ماحول عام لوگوں سے بہت مختلف تھا۔ محلے کی خواتین اور بچیاں ہمارے گھر روز آیا کرتی تھیں مگر میں کبھی کسی کے گھر نہیں گئی تھی۔ امی جان خود ہی لوگوں کے دکھ سکھ پر دادی جان کے ساتھ ہو آتیں۔

لالی اس محلے میں میری پہلی اور آخری سہیلی تھی۔ وہ تو مجھ سے بہت بے تکلف تھی اپنی اور میری عمر کے فرق کو بھی خاطر میں نہ لاتی مگر میری طرف سے پھر بھی ابھی ایک جھجک باقی تھی۔ کبھی کبھی وہ پڑھتے ہوئے مجھ سے عجیب سوال کرنے لگتی۔

''بیا...... تمھارے خیال میں محبت کیا ہے؟''

''محبت'' ...... میں سوچ کی طنابیں کستی۔

''محبت
لوک داستانوں کی
وہ کتاب ہے
جس میں کہیں مور پنکھ

کہیں سوکھے گلاب رکھے ہوں
محبت
گورے چٹے ہنس راجوں میں
کالے کلوٹے کوے کو بھی
مجبور کر دیتی ہے
جون بدل کر...... سفید ہنس راج بننے پر
محبت
آنکھوں کو دل بنا دیتی ہے
جو کبھی تو خوب برستے ہیں
اور پھر...... دھوپ چھاؤں کی آنکھ مچولی میں
پانی کو بھی ترستے ہیں۔''

اس کے سوال پر مجھے اپنی ایک آزاد نظم یاد آ گئی جو میں نے اپنے کتابی و مطالعاتی تجزیے کے بعد لکھی تھی۔ حالانکہ مجھے خود تو اس کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ سو میں نے وہی اِسے سنا دی۔ ''بیا...... کبھی تم نے محبت کی ہے؟'' وہ پھر سوال کرتی۔

''ہاں ناں کی ہے ناں......'' میرے جواب پر لالی کی آنکھیں حیرانی سے بڑی ہو جاتیں۔

''اپنے امی ابو سے، اپنے اللہ سے اور اپنے مُلک سے...... امی کہتی ہیں میں بہت محبتی لڑکی ہوں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بہت پسند کرتا ہے جو اس کی مخلوق سے محبت کریں۔ اس کے بندوں کے کام آئیں اور محمد ﷺ سے محبت تو ہر مسلمان کا سرمایہ ہے۔''

میرا لیکچر شروع ہوتا، تو لالی کی توجہ پھر سے کتابوں اور پڑھائی کی طرف مبذول ہو جاتی۔ کبھی کبھی وہ پڑھائی کرتے کرتے کہیں کھو جاتی اور مجھے اُسے خیالوں کی دنیا سے زبردستی واپس لانا پڑتا۔ جیسے تیسے اس نے پرائمری کا امتحان پرائیویٹ دیا اور پاس کر لیا۔ اب وہ چھٹی جماعت کے سلیبس کی تیاری کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ مشکل اُسے انگریزی سیکھنے میں پیش آ رہی تھی۔ مہینا لگا کر اُس نے اے، بی، سی پوری لکھنا سیکھی۔ حساب بھی اُس کا قدرے کمزور تھا۔

امی کے کہنے پر اور خود سے بھی میں اس کی پڑھائی میں خاص مدد کیا کرتی۔

ایک دن میں اِسے چار لائنوں والی کاپی پر انگلش کے چھوٹے چھوٹے الفاظ خوش خطی کے لیے لکھ کر دے رہی تھی۔

''سنو...... بیا!'' اس نے مجھے پکارا، تو میں نے کاپی سے سر اُٹھا کر اِسے دیکھا۔

''ہاں بولو...... لالی۔'' میں بھی اسے اس کے نام سے بُلایا کرتی تھی۔

''یہ...... یہ تو بتاؤ اِس میں کیا لکھا ہے؟'' اس نے جھجکتے ہوئے اپنی حساب کی کتاب سے ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے کارڈ کو اُلٹا پلٹا۔ دیکھنے میں تو وہ عید کارڈ ہی تھا مگر عید گزرے مہینا بھر سے زیادہ ہو گیا تھا۔

میں نے کارڈ کھولا، تو انگلش میں کافی لمبی عبارت اور دو چار عشقیہ شعر لکھے تھے اس پر۔ کارڈ کسی ''صدف'' کے نام تھا اور آخر میں ''اسد'' لکھا ہوا تھا۔

''یہ کس کا ہے اور تمھارے پاس کہاں سے آیا؟'' سرخ گلاب اور تیر میں ترازو دو دِلوں والا کارڈ...... پھر اس پر لکھی ہوئی عامیانہ سی عبارت مجھے پسند نہ آئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ کارڈ لالی کو واپس کر دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کہیں امی میرے ہاتھ میں یہ کارڈ دیکھ لیں۔

''دیکھو یہ پڑھ دو...... سہیلی نہیں ہو؟'' لالی التجائیہ

...از سے بولی۔

''تمھیں بھلا کہاں سے یہ؟ اور یہ صدف کون ہے؟ تمھاری کوئی سہیلی یا کزن وغیرہ ہے؟'' میرا اندازہ ...ندرے مشکوک ہو گیا۔

''یہ......'' لالی ایک دم سے محتاط ہو گئی۔

''یہ ہمارے گھر کے سامنے جو خالی پلاٹ نہیں ہے ...ہاں لوگ کوڑا کرکٹ وغیرہ پھینکتے ہیں۔ وہ...... وہیں ...ے اُٹھایا ہے۔'' کراہت سے میرا منہ بن گیا۔ مجھے ...دیکھ کر اس نے فوراً بات بدلی۔

''شاید وہیں سے اُڑ کر گلی میں آ گیا تھا۔ مجھے اچھا لگا میں نے اُٹھا لیا۔ بتاؤ ناں اس میں لکھا کیا ہے؟''

...زبانی اسے بتا دیا اور پھر سے پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔

میں شاید اس واقعے کو بھول جاتی مگر صرف تین دن بعد ہی لالی نے مجھے ایک اور چیز دکھائی جس سے میرا شک یقین میں بدل گیا۔

اس دن امی کسی کی طرف فوتیدگی پر گئی ہوئی تھیں۔ ...لی ان کے لیے ''بوہلی'' لائی تھی (زچہ گائے یا بھینس کا پہلے چند دن کا دودھ جو رنگت اور ذائقے میں مختلف ہوتا ہے) اور میرے لیے بیسن مکھن اور دیسی گھی سے بنا ہوا حلوہ لے کر آئی تھی۔ اس نے موقع پاتے ہی اپنی ایک کتاب میں سے دُہرا تہرا کیا ہوا ورق نکالا اور مجھے تھما دیا۔

اس سے پہلے کہ میں اس کاغذ کو کھولتی۔ لالی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھ تھام لیے۔

''دیکھو...... بیا پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو...... قسم کھاؤ کہ تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی۔ دیکھو میں تمھاری ...ت کرتی ہوں تم میری اچھی سہیلی ہو نا...... پکی ...ائی...... دیکھو پہلے قسم اُٹھاؤ۔''

اس نے اس طرح سے میری منت کرنا شروع کر دی کہ مجھے وعدہ کرتے ہی بنی۔ قسم اُٹھانے سے میں نے انکار کر دیا تھا کہ میں قسم نہیں اُٹھاتی تھی۔

اور جناب جب میں نے وہ کاغذ کھولا، تو یہ دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ وہ ''محبت نامہ'' تھا۔ اُسی ''اسد'' کی طرف سے اُسی ''صدف'' کے لیے......

یہ کیسے اتفاق ہو سکتا تھا کہ لالی نے یہ خط بھی کوڑے سے اُٹھایا ہو...... انہی فریقین کا...... ناممکن......

''لالی مجھے سچ سچ بتاؤ ورنہ میری تمھاری دوستی ختم۔'' یہ سُن کر لالی تو جناب دھواں دھار رونے لگی۔

''ہائے بیا میں کیا کروں...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی، اب تو میں واپس بھی نہیں جا سکتی۔ اتنا آگے بڑھ چکی ہوں......'' لالی کی حالت دیکھ کر مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ پھر اس نے مجھے الف سے یے تک پوری داستان سُنا ڈالی۔

وہ لڑکا اس کے ساتھ والے گھر میں رہتا تھا۔ یہ چکر کئی مہینوں سے چل رہا تھا۔ ابھی تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ لڑکا اس شہر نوکری کی غرض سے آیا تھا اور اس گھر میں کرائے پر رہ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک موٹر سائیکل بھی تھی۔ لالی اس لڑکے کی محبت میں اتنی ڈوب چکی تھی کہ اس کے بغیر زندگی کا تصور اس کے لیے محال تھا۔

''دیکھو...... اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں مر جاؤں گی...... سچ میں کچھ کھا کر اپنی جان دے دوں گی۔'' لالی نے اتنے دکھی لہجے میں کہا کہ مجھے اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ میرا دور دور تک اس قسم کی محبت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ نہ کبھی اس قسم کی کوئی بات سنی تھی۔ بس کتابوں، رسالوں میں پڑھا تھا۔

"لالی...... تمھیں پتا ہے تم کیا کر رہی ہو؟ یہ بہت غلط بات ہے؟" میں نے "تین عورتیں تین کہانیاں" میں جتنی محبت اور عشق میں ناکامی کی داستانیں پڑھی تھیں ان کی رو سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ جھجک کے باعث مجھ سے محبت اور عشق جیسے الفاظ تک زبان پر نہ لائے جا رہے تھے کہ ہمارے گھر میں بڑی شائستہ زبان بولی جاتی تھی اور اس قسم کی باتوں کا سایہ تک ہماری سوچ اور سماعت پر نہ پڑا تھا۔

"اب تو میں یہ غلطی کر چکی ہوں...... اب میں اس کے بغیر نہیں جی سکتی۔ اب میں کیا کروں؟ کچھ سمجھ نہیں آتا۔"

"بھئی اس سے کہو رشتہ بھیجے تمھارے گھر اور سیدھے سادھے رائج طریقے سے تمھیں دلھن بنا کر اپنے گھر لے جائے۔"

"یہی تو مشکل ہے۔ اس کی اور ہماری ذات بالکل مختلف ہے۔ نہ اس کے گھر والے مانیں گے نہ میرے......"

"تو بھئی یہ تو تمھیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

(ہم...... جہاں ذات پات کا مسئلہ ہو تو لڑکے لڑکیوں کو آنکھ مٹکانے سے پہلے دوسرے کی ذات پوچھنی چاہیے یہاں تک کہ نام پوچھنے سے بھی پہلے۔ تاکہ جو مسئلے بعد میں کھڑے ہوتے ہیں ان سے پہلے ہی دوسری جانب رُخ موڑ لیا جائے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟)

"تو بھئی جب تمھاری شادی ہی نہیں ہو سکتی تو پھر دو حرف بھیجو...... اب کیا چاہتی ہو تم؟"

"تم نہیں سمجھ سکتیں بیا...... میں اس کے بغیر نہیں جی سکتی...... وہ بھی کہتا ہے کہ اگر میں اسے نہ ملی تو وہ خودکشی کر لے گا۔ ہم نے سچا پیار کیا ہے؟"

اس وقت میری عمر بھی کچھ اتنی زیادہ نہ تھی کہ میں سچے پیار کی سچائی تلاش کر سکتی یا اسے کوئی اور راہ سمجھا سکتی۔ اپنی طرف سے تو میں نے اسے سمجھایا مگر وہ اب سمجھنے سمجھانے کی حدود سے نکل چکی تھی۔ میں بھی اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کی "سچی محبت" پر ایمان لے آئی۔ مجھے واقعی فکر لگ گئی کہ لالی کچھ کھا مرے گی یا ٹرین کی پٹڑی پر جان دے دے گی جو اس کے گھر کے بالکل پیچھے تھی۔ سمجھ نہ آئی کہ کیسے اس کی مدد کروں؟ کیسے اس کا گھر آباد کروں؟ خیر خانہ آبادی تو ذرا بعد کی بات تھی فی الحال تو لالی نے مجھ سے دوستی کے نام پر وعدے کے بعد ایک اور مدد مانگی۔

"میری بہن تمھیں پتا ہے میری لکھائی اتنی اچھی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے شعر و شاعری آتی ہے۔ تم تو اتنا خوش خط لکھتی ہو کہ لگتا ہے کاغذ پر موتی پروئے ہوں لفظ لفظ میں...... کتنی کتابیں پڑھتی ہو...... کتنے ہی شعر تمھیں زبانی یاد ہیں......"

یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے نئی نئی شاعری شروع کی تھی، چھوٹی چھوٹی کہانیاں تو میں بچپن ہی سے لکھتی آ رہی تھی۔ لالی کی تعریف پر میں پھولے نہیں سمائی۔ دس منٹ میری تعریف میں رطب اللسان رہنے کے بعد وہ اپنے مطلب پر آگئی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ لوہا گرم ہے اب چوٹ لگانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

"میری پیاری سہیلی...... میری اچھی بہن تم مجھے ایک خط لکھ دوناں...... صرف ایک خط۔ تم تو بہت اچھی ہو۔"

عام حالات میں یہ سُن کر مجھے چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگنا چاہیے تھا مگر اس نے اپنی چرب زبانی سے یوں چوپڑ چوپڑ کر مجھے مکھن لگایا تھا کہ میں فوراً مان

گئی۔ ویسے بھی اب مجھے لالی کی لَو اسٹوری میں مزا آنے لگا تھا۔ یہ سب میں نے کہانیوں رسالوں میں پڑھا تھا۔ اب اس سچی محبت کے حقیقی کردار کو میں آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں اس وقت خود کو مستقبل کی بہت بڑی رائٹر اور شاعرہ کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ لالی کے لیے "لَو لیٹرز" لکھنا مجھے اپنے لیے ایک چیلنج کی طرح لگا۔ میں نے اپنی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کر لیا۔ دو دن لگا کر میں نے تین صفحوں پر مبنی ایسا زبردست لیٹر لکھا کہ کسی ادب کے شائق نے بھی کیا لکھا ہوگا۔ بہت ساری کتابیں ٹٹولیں، رسالوں کی شامت آئی۔ اپنے دماغ کی گراریاں گھمائیں۔ اپنے اوپر کیف آگیں اور خوبصورت سی کیفیت طاری کر کے کچھ شعر اور غزلیں لکھیں۔ واہ کیا "لیٹر" لکھا میں نے! کہ اگر لالی کے اماں ابا کے ہاتھ لگ جاتا، تو اپنی بیٹی کے جذبات سے متاثر ہو کر ذات پات، سماج، معاشرے کو بھول کر لڑکے کو جلدی سے پکڑتے اور فوراً ہی نکاح کروا دیتے۔

اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا پہلے کے بعد دوسرا خط، دوسرے کے بعد تیسرا...... لالی اس لڑکے کا جواب مجھے دکھاتی اور میں اسے دو دن میں نیا خط لکھ دیتی میں اپنی شاعری اور ادب دانی کی پذیرائی پر بہت خوش تھی جس کا اظہار "اسد" اپنے خطوط میں کیا کرتا۔ میرے لیے یہی کافی تھا۔ ورنہ لالی کا محبوب اسے ہی مبارک، میں تو ایسے معاملات سے کوسوں دور بھاگتی تھی۔ اپنی ذات کے لیے ایسا سوچنا بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ مجھے کبھی موقع نہ ملا تھا کہ شہر بھر کے لڑکوں کے لیے میں باجی تھی، بہن تھی، چاہے وہ مجھ سے سولہ سال ہی عمر میں نہ بڑے ہوں۔ کوئی اسے خوش نصیبی سمجھے یا ستم ظریفی میں نے تو اس سے پہلے کبھی محبت وحبت کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ اب مجھے خود پر رشک آتا کہ میرا دماغ کیسا زرخیز ہے۔

لالی، اسد کے موٹر سائیکل کی آواز تک پہچانتی تھی۔ وہ مقررہ وقت پر گیٹ کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور اسے اپنی جھلک دکھا کر خط باہر ڈال دیتی۔ وہ بھی مخصوص وقت پر اپنا جواب گیٹ کی درز سے اندر ڈال دیا کرتا۔ لالی نے اصل نام کے بجائے اسے اپنا نام "صدف" بتایا تھا۔ یہ بات میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی جو پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھی۔

یہ چوتھے خط کی رَف کاپی تھی جو امی حضور نے پکڑی تھی۔ میں نے بھی شاید اس خیال سے سنبھال رکھی تھی کہ اپنی کہانیوں والی فائل میں رکھوں گی پھر ان سب شاہکار خطوط کو اُٹھا کر ایک کتاب کی شکل میں چھپواؤں گی۔ لیکن اس سے پہلے ہی میرے خواب چکنا چور ہو گئے۔ (اور یہ اچھا ہی ہوا)۔

ساری حقیقت جان کر امی جان نے لالی کا اس گھر میں آنا اور میرا گھر میں آنے والی تمام لڑکیوں سے ملنا اور بات کرنا بند کر دیا۔

ویسے یہ پابندی وقتی ثابت ہوئی تھی۔ شاید امی کے خیال میں میرے لیے اتنا ہی سبق کافی تھا۔ مگر میں نے ان کے تھوڑے کہے کو بہت سمجھ لیا تھا۔

میں نے اپنی اس چھوٹی سی غلطی کو اپنا اتنا بڑا جرم سمجھا کہ خود ہی اپنے پر کئی پابندیاں عائد کر لیں۔ میں نے زندگی بھر کے لیے کسی ایسی محبت کے بارے میں سوچنے سے بھی توبہ کر لی۔ اپنی اُس جرأت کا خیال مجھے آج بھی شرمندہ کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے والدین کا اعتبار اپنے اوپر پھر سے مضبوط کرنے کے لیے کڑی محنت

کی۔ پڑھائی میں بھی اور والدین کی خدمت و فرمانبرداری میں بھی۔ میں نے اپنی شاعری کا رُخ محبت سے موڑ کر مزاح اور تصوف کی طرف کرلیا۔ فضول بے سروپا کہانیاں لکھنے کے بجائے ایسی تحریریں لکھنے لگی جو نوجوان نسل کو بے راہ روی اور غلط راستوں سے بچا کر معاشرے کا مفید اور کارآمد انسان بنائیں۔ میں نے اپنے والدین کو ایک بہت اچھی، قابل فخر اور فرمانبردار بیٹی ثابت کر کے دکھایا۔ آج میں جس مقام پر ہوں۔ میری فیملی مجھ پر فخر کرتی ہے۔ اور مزے کی بات سارے قصے کی جڑ وہ خط، وہ واقعہ، وہ میری غلطی امی کو آج یاد ہی نہیں جس نے میرا راستہ یکسر بدل ڈالا۔ یہ اُن کے مان اور پیار کی انتہا ہے۔ (بچے جس غلطی سے سبق حاصل کرلیں شاید والدین اُس غلطی کو بھول جانا ہی مناسب خیال کرتے ہیں۔)

بس اس ایک محبت کے سوا میں نے سب محبتیں کی ہیں۔ بہت سی محبتیں اپنے اللہ سے محبت، اپنی امی اور ابو جی سے محبت، اپنے بہن بھائیوں اور دادی سے، اپنی سہیلیوں، اپنی ٹیچرز سے، علم اور کتابوں سے، اپنے مذہب اور اپنے وطن سے یہاں تک کہ اپنے پالتو جانوروں سے بھی۔

اتنی محبتوں اور چاہتوں کے بعد مجھے نہ دوسری طرح کی محبت کی خواہش ہوئی نہ کوئی ہوک اُٹھی، میں اتنی سرشار ہوں کہ خود کو خوش قسمت سمجھتی ہوں۔ ہاں خوش قسمت کہ جہاں بھی مجھے اُس محبت کا سایہ نظر آیا میں نے دس گز دور سے اپنا راستہ بدل لیا۔ آپ قطعاً یہ نہ سمجھیں کہ یہ امی حضور کی عزت افزائی کا نتیجہ اور ان کا ڈر تھا۔ اب تک تو آپ کو یہ بات سمجھ آگئی ہوگی۔ ہاں بس میں نے ابھی اپنا قصہ ختم نہیں کیا۔

"اس خط کے پکڑے جانے اور لالی کی گھر میں آمد پر پابندی کے بعد جہاں مجھے شرمندگی کے احساس نے گھیرا (معلوم نہیں اُسے خود بھی کوئی شرمندگی ہوئی تھی یا نہیں) وہاں مجھے ایک دُکھ نے بھی آن دبوچا۔ ایک انجانا سا احساس تھا۔ ایک فکر سی تھی کہ لالی اب کس حال میں ہے۔ دو سچی محبت کرنے والوں کا کیا ہوا؟

کبھی دُعا کرتی یا اللہ ان دو محبت کرنے والوں کا مسئلہ حل کردے۔ انھوں نے تو ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہیں۔ وہ تو ایک دوجے کے بنا مر جائیں گے۔ بے چارے معصوم......

امی سے تو میں نے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کے گھر والوں کو نہیں بتائیں گی اور مجھے امی کے وعدے پر پورا بھروسا تھا۔

مجھے لالی کی طرف سے ڈر لگا تھا کہ کہیں وہ ایسی ویسی بات ہونے پر جان نہ دے دے۔ کتنے دعوے کیے تھے اُس نے۔ کسی اور سے شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی اس نے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کوئی ایسا نہ تھا جس سے میں لالی کے بارے میں پوچھ سکتی۔ لالی کی کوئی خبر نہ تھی۔ جانے اِسے اس کی محبت مل گئی تھی یا ابھی تک اس روگ کے چکر میں پڑی تھی۔

پھر ساڑھے تین سال بعد وہ مجھے ایک محفل میلاد میں نظر آئی۔ اُسے دیکھ کر میرے سارے سوال پھر سے جاگ اُٹھے۔ میرے اندر بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ ذہن میں خدشات پر خدشات آرہے تھے۔

مگر اس کا ہنستا مسکراتا شوخ سا چہرہ کچھ اور ہی کہانی سُنا رہا تھا۔ سلک کے پرپل سوٹ میں وہ پہلے سے بھی صحت مند لگ رہی تھی۔ البتہ چہرے پر چھائیاں اور بھورے تل زیادہ ہوگئے تھے۔ اس کا پرپل دوپٹا بار بار اس کے بھورے پڑتے بالوں سے سرک رہا تھا۔ کانوں میں موٹے موٹے موتیوں والی بڑی بڑی بالیاں تھیں اور ہاتھ میں ایک لال نگ والی بھدی سی سونے کی انگوٹھی۔

اس کی ڈریسنگ اور چہرے کی بشاشت سے تو لگ رہا تھا کہ اس کے مَن کی مُراد پُوری ہوگئی ہے۔ لیکن میں پھر بھی اس کے بارے جاننے کے لیے بے تاب ہورہی تھی۔

میں یہاں اپنی پھوپھو کے ساتھ آئی تھی۔ میلاد ختم ہوا، تو لوگ گھروں کو جانے کے لیے اٹھنے لگے۔ میزبان خاتون پھوپھو کو ایک طرف لے جا کر ان سے کچھ مسئلے مسائل پوچھنے لگیں۔ میں نے موقع مناسب جانا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر لالی کے پاس جا بیٹھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ حال احوال کے بعد میں نے چھوٹتے ہی اس سے سرگوشی کی۔

"تمھارے قصے کا کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں...... حلوہ" وہ بے فکری سے ہنسی۔ مجھے بے حد اچنبھا ہوا۔

"کیا مطلب......؟"

"کھیل ختم پیسہ ہضم......" اُس کی گفتگو کا انداز بدلا نہ تھا۔

"بھئی کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو......سیدھی طرح بتاؤ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" مجھے نہیں پسند تھا کہ میلاد کے بعد میں اس قسم کی باتیں کرنے بیٹھ جاؤں مگر مجھے یہ بھی پتا تھا کہ وہ مجھے دوبارہ نظر نہیں آئے گی اور میرا تجسس ویسا ہی رہ جائے گا۔ آج پھوپھو کی وجہ سے گھر سے باہر نکلی تھی پھر جانے کبھی جا سکوں یا نہیں۔ "وہ تو قصہ ہی ختم ہوگیا اب تو دو سال بھی ہوگئے۔"

"ہائیں مگر کیسے؟" میری حیرانی دو چند ہوگئی۔

"وہ بے ایمان، جھوٹا اور دھوکے باز نکلا۔" وہ میرے کان میں اپنا منہ گھسا کر بولی کہ کوئی سُن نہ لے میں بھی ہمہ تن گوش تھی۔

"اچھا ہی ہوا کہ پتا چل گیا۔ حقیقت کھل گئی اس دغا باز کی...... ہوا یوں کہ ہم گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اک دن بھائی نے اسے خط ڈالتے پکڑ لیا...... اس کی وہ چھترول کی کہ اس کو نانی یاد آگئی مگر وہ پھر بھی صاف مکر گیا کہ جی یہ میرا خط نہیں ہے مجھے تو پتا ہی نہیں صدف کون ہے؟ نہ ہی میرا نام اسد ہے۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر دکھا دیا جس پر اس کی تصویر کے ساتھ نام "منظور حسین" لکھا تھا۔

اس نے قسموں پر قسمیں کھانا شروع کردیں کہ آپ کی بہن کو تو میں اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ میں بڑا شریف عزت دار اور بیوی بچوں والا بندہ ہوں۔ اگلے ہی ہفتے اس کا ثبوت اس نے گاؤں سے اپنی بیوی اور تین بچوں کو لاکر دے دیا اور اسی ڈھٹائی سے آج تک ہمارے پڑوس میں رہ رہا ہے۔ بے غیرت......" لالی نے لاپروائی سے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لالی کو بھی بھائیوں سے جوتے پڑے تھے۔ بڑی بے عزتی ہوئی اس کی۔ مگر اس کے چہرے پر تو کوئی افسوس کوئی پشیمانی ہی نہ تھی۔ نہ ہی کوئی ملال۔ کمال تھا نا! اس کی کہیں اور منگنی ہوگئی تھی اور وہ اس پر بہت خوش تھی......ہاہ......تو یہ ہوا اُس "سچی طوفانی محبت" کا انجام۔

لالی سے محبت اور جان دینے کا دعویٰ کرنے والا اسد عرف منظور حسین تین بچوں کا باپ اور شادی شدہ نکلا۔ جھوٹا اور دھوکے باز......اور آج وہی لالی...... کسی اور سے شادی نہ کرنے کی قسمیں کھانے والی لالی، اپنے عاشق کی خاطر زہر کھا کر مر جانے کی دعوے دار لالی، کسی اور کا گھر بسا کر......اس کے نصف درجن بچوں کی ماں بن کر خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ لالی بھی، تو خوش قسمت تھی کہ اپنے دغا باز عاشق کے ساتھ بھاگی نہیں تھی، نہیں تو جانے بے چاری کہاں رُل رہی ہوتی۔"

ننھا مانجھی

محمد خالد اختر

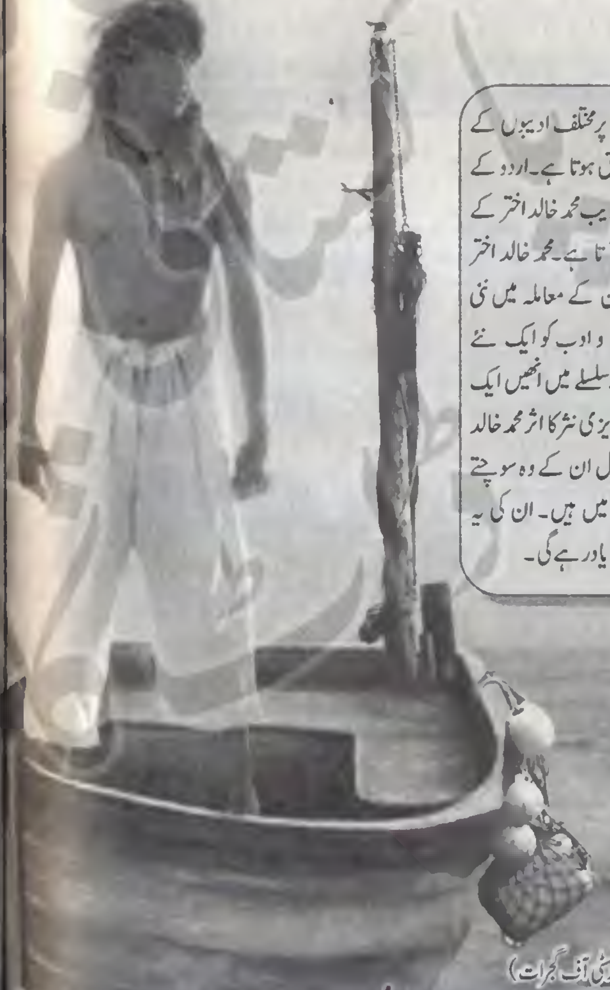

اپنے شوق اور مزاج کی بنا پر مختلف ادیبوں کے افسانے اور کہانیاں پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اردو کے صاحب اسلوب اور منفرد بیان ادیب محمد خالد اختر کے افسانے پڑھ کر ایک عجب مزہ آتا ہے۔ محمد خالد اختر نے بحیثیت ادیب زبان و بیان کے معاملہ میں نئی راہیں تلاش کیں اور اردو زبان و ادب کو ایک نئے محاورہ سے روشناس کروانے کے سلسلے میں انھیں ایک مجتہد کی حیثیت حاصل ہے۔ انگریزی نثر کا اثر محمد خالد اختر کی تحریروں پر گہرا ہے۔ بقول ان کے وہ سوچتے انگریزی میں ہیں اور لکھتے اردو میں ہیں۔ ان کی یہ کہانی ''ننھا مانجھی'' آپ کو دیر تک یاد رہے گی۔

انتخاب: شیخ عبدالرشید
(ڈائریکٹر میڈیا اینڈ پبلی کیشنز یونیورسٹی آف گجرات)

میں نے اپنے ننھے مانجھی کو پہلی بار چھوٹی گھونگھے جیسی کشتی کے پاس جون 1938ء کی ایک سہ پہر کو دیکھا۔ دریا اپنے پاٹ میں چار دریاؤں ستلج، سندھ، جہلم اور راوی کے پانی لیے، بل کھاتی اور پھنکارتی موجوں اور بھنوروں کا سمندر ہو رہا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، پانی ہی پانی اور تم پرلا کنارہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چھوٹی دم کٹی سی ریل نے ایک گھنٹا پہلے مجھے گنبدوں اور کھجوروں والے ٹرمینس ریلوے اسٹیشن پر اتارا تھا اور میں وہاں سے اپنا تھیلا کندھے پر رکھے اور ایک سوٹ کیس اٹھائے ایک دیہاتی باتونی لڑکے کی راہنمائی میں ریلوے لائن کی پٹڑی پر چلتا ہوا (کیونکہ اردگرد طغیانی کی وجہ سے پانی تھا اور پٹڑی ہی سب سے اونچی جگہ تھی) پی ڈبلیو ڈی کی فیری لانچ کو پکڑنے دریا کے کنارے پہنچا تھا۔ میری بدقسمتی کہ میں فیری لانچ کو نہ پکڑ سکا۔ ابھی ہم ان سے دو فرلانگ دور تھے کہ کنارے سے ایک بانک سنائی دی اور ایک سبز اور سفید مکان نما چیز حرکت کرتی نظر آئی۔

''سائیں!'' الجھے ہوئے بالوں والے دیہاتی لڑکے نے، جس کا نام گامن تھا، کہا ''بیڑی ویندی پئی اے۔ تساں ہُن کل فجر ای ونج سکدے او۔''

میں نے خواہ مخواہ غصے میں سارا الزام اس پر دھرا۔ اس نے اپنی باتوں میں مجھے دیر کرا دی ورنہ میں لانچ کو پکڑ لیتا۔ ہم کنارے پہنچے۔ فیری لانچ اب کافی دور جا چکی تھی۔ میں اس کے انجنوں کی چگ چگ کی آواز سن سکتا تھا۔ مچھیروں کی مستولوں والی دو تین کشتیاں سورج میں چمکتے پانیوں پر اچھل رہی تھیں اور چٹائیاں بننے والے خانہ بدوش اپنی سرکنڈوں کی جھونپڑیوں میں کنارے پر پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ موسم زدہ جھریوں والے بوڑھے اور چمکیلے سیاہ جسموں والے بے پروا نوجوان اور رنگ دار چھٹی ہوئی چھینٹ کے گھگھروں میں صحت مند جسموں اور کھرے پیتل کی سی رنگت والی عورتیں، جن کو دیکھنے سے دل میں گویا ایک پھانس سی اٹک جاتی تھی اور لاتعداد الجھے ہوئے بالوں والے چھوٹے بچے جو اپنے بڑوں کی مصروفیات اور دھندوں سے بے خبر، شور مچاتے، پانی میں کھیل رہے تھے۔

مجھے اس شام اپنے دریائی چچا احمد یار کے پاس پہنچنا تھا۔ اس گھر میں سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں واپس اس سبز گنبدوں اور کھجور کے جھنڈوں والے گاؤں چاچڑاں میں رات بسر کرنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر فیری لانچ جا چکی تھی اور دریا کے دوسرے کنارے پر جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔

''سائیاں!'' گامن نے کہا ''رات اساڈے گھر رہو۔ تساڈی خدمت کریساں تے مٹھ مروڑے دیساں۔ میرا بابا فرید سائیں دیاں کافیاں خوب ئے نال گاندا اے۔ تے ساڈی ہک بکری اے۔ سائیں کوں اودا کھیر پویساں۔ ڈھاڈا مٹھا اے۔ فجر ہن ٹال میں سائیں کوں بیڑی تے چڑھا دیساں۔''

میں نے مستولوں والی کشتی کے ایک لمبی مونچھوں اور پٹوں والے بوڑھے مچھیرے سے دریافت کیا کہ آیا وہ مجھے دوسرے کنارے پر مٹھن کوٹ لے جائے گا۔ اس نے اپنا سر ہلایا اور دریا کے سمت اشارہ کیا جو اپنی ناچتی شوریدہ لہروں سے واقعی خطرناک اور جان لیوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا ''سندھ بھی بہت زیادہ ہے اور ہوا اُلٹے رخ کی ہے۔ اس وقت کوئی تمھیں مٹھن کوٹ نہیں

لے جائے گا۔"

میں مایوس ہوگیا۔ میرے چچا نے میرے آنے کی خوشی میں اپنی ضرب المثل دریا دلی سے بڑا تکلف کر رکھا ہوگا اور اسے مایوسی ہوگی۔

تب میں نے اپنے ننھے مانجھی کو دیکھا۔

وہ اپنی اچھلتی ہوئی گھونگھے نما کشتی کے پاس ایک لمبا بانس لیے کھڑا تھا۔ بمشکل بارہ تیرہ برس کا لڑکا، صرف لنگوٹی پہنے، اس کے بال گھنے گھنگھریالے اور بدن چمکیلا، لچکیلا اور سنہری تھا۔ وہ اپنے بانس کے ساتھ ایسی بے پروائی اور ایسے بانکپن سے کھڑا تھا جیسے وہ ایک چھوٹا سا دیوتا ہو۔ اس کی آنکھوں میں دلیری اور خود اعتمادی تھی اور اس کا چہرہ خوبصورت اور مسکراتا ہوا تھا۔ جنگلوں، دریاؤں اور کھلے خطوں کی ایک مخلوق!

ایک لمحے کے لیے میں نے تاسف سے اپنے ناقص خوراک پر پلے ہوئے، پلپلے، توندیلے، آرام کے عادی جسم کے بارے میں سوچا۔ شہروں میں رہتے ہوئے، انسان نے خود کو غالباً خدا کی بدصورت ترین مخلوق بنا لیا تھا۔ آہ! یہ تہذیب کی نت نئی بڑھتی ہوئی آسائشیں! شہری آدمی کو آخر کس بات کا ناز تھا؟

ننھے مانجھی نے خود یہ مجھ سے پوچھا "سائیاں، پار جاسیں؟"

"تمھاری کشتی کمزور ہے۔ یہ ڈوب جائے گی چھوٹے لڑکے۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی لوک گیتوں کا سُر تھی۔ اس کے موتیوں کی لڑی جیسے سفید دانت چمکے۔ اپنے تمباکو سے میلے کچیلے پیلے دانتوں کا سوچ کر حسرت کی چھری سی میری سینے میں اتر گئی۔

"واہ سائیاں واہ!" وہ بولا "میری بیڑی نہیں بُڈدی۔ ایہہ پانی دی مچھلی اے۔ دریا دی چھل تے اُتوں پکھی وانگوں اُڈ جاندی اے۔"

اس نے بتایا کہ وہ ہر روز پرلے ساحل سے مچھلیاں پکڑتے پکڑتے اس کشتی میں یہاں آتا ہے اور سرِ شام لوٹتا ہے۔

"دریا میرا گھر ہے" اس نے سادگی سے کہا "سائیاں میں دریا وچ پڑھیا ہویا آں۔ دریا میرا سنگی ہے۔ وہ میری اور میری کشتی کی حفاظت کرتا ہے۔"

ایک جنگلی وحشی لڑکے سے اتنی عقل کی باتیں سن کر میں حیران رہ گیا۔ کس نے اس کو یہ باتیں سکھائی تھیں؟

"تم اسکول میں پڑھتے ہو؟" میں نے پوچھا..... یہ سوچتے ہوئے کہ ایسی دانائی صرف اسکول میں سیکھی جا سکتی ہے، یہ بھولتے ہوئے کہ مادرِ فطرت خود بہترین اُستاد ہے۔

وہ پھر ہنسا اور اس کے جواب نے مجھے حیران کر دیا "میرا اسکول، سائیاں! زمین ہے اور دریا ہے۔"

گامن مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ کبھی میرے کوٹ کو اور کبھی میرے بازوؤں کو کھینچتا۔ وہ خلوص سے چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ شہر میں اس کے کچے مکان میں رات گزاروں، اس کی بکری کا تازہ سجرا دودھ پیوں اور اس کے بابا سے فرید کی کافیاں سنوں۔

"سائیاں! دریا ایک دم خطرناک ہے۔ میرے ساتھ آؤ....." گامن بولا۔

اس پر ننھا مانجھی زور سے ہنسا "خطرناک!" اور چھلانگ لگا کر اپنی کشتی میں سوار ہوگیا۔ "میں اب جا رہا ہوں۔ تم آنا چاہتے ہو، تو آسکتے ہو۔"

میں نہیں جانتا کہ اس وقت میرے دل میں کیا

ئی۔ نہ جانے یہ اپنے ہنس مکھ، شکرے کی آنکھ والے چچا کی میرے نہ پہنچنے پر مایوسی کی فکر تھی اور اس بھنے ہوئے مرغ کا خیال تھا جو وہ اپنی خاص نگرانی میں پکوا رہا ہوگا یا یہ دریا کا وسیع حسن و جمال تھا یا پھر یہ اس جنگلی لڑکے کی خود اعتمادی سے بھری ہنسی تھی۔ میں نے ینت اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ زندگی میں یے بہادر لمحے آتے ہیں، جب آدمی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔

"ٹھہرو! میں تمھارے ساتھ آرہا ہوں۔"

"نہ نہ سائیاں! کملا نہ بنو ہا۔ ایہہ چھوکرا چوڑا ہے۔ کشتی بُڈ دیسی۔" مگر میں تو اب اپنے تھیلے اور سٹ کیس کے ساتھ کشتی میں تھا اور کنارے پر حواس باختہ گامن کو احتجاج کرتے چھوڑ کر ننھا مانجھی اپنی مچھلی جیسی کشتی کو بھنور لیے، لپٹتے پانیوں میں لے جا رہا تھا۔ وہ یک یونانی دیوتا کی طرح حسین لگ رہا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کچھ دیر کے لیے میں اس کے اس دم سادھ دینے والے انسانی حسن میں کھو گیا اور اس خطرے کو بھول گیا جس میں کود پڑا تھا۔

جب میں نے اچھی طرح اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو خوف نے مجھے جکڑ لیا۔ پانی کی لہریں غصیلے سانپوں کی طرح کشتی کے کناروں پر شوکتی ہوئی آتی تھیں۔ میں پانچ منٹ کے اندر سر تا پا بھیگ گیا۔ کشتی میں بھی پانی بھرنا شروع ہوگیا۔ مگر ننھا مانجھی صرف مسکراتا رہا۔ اس کے چہرے پر فکر یا خطرے کی کوئی علامت نہ تھی۔ کشتی یک نازک گھونگھے کی طرح کبھی ادھر لڑھکتی جاتی کبھی ادھر اور کبھی سر کے بل اپنی دو سواریوں سمیت پانی کی گہرائیوں میں غوطہ لگاتی معلوم ہوتی۔ لیکن پھر یہ صحیح سلامت لہروں پر سوار نکل آتی۔ پہلے پندرہ بیس منٹ تک میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہا اور میری ہڈیوں کا گودا تک ڈر اور سہم سے گویا جم گیا۔ پھر لڑکے کی خود اعتمادی اور مسکراہٹ اور اس عجیب و غریب کشتی کی خطرے کے مقابلے میں چستی کو دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہونے لگا۔ میں نے اس عرصے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا اور نہ ہی لڑکا کچھ بولا۔ اپنے مطمئن انداز کے باوجود اس کی رگ رگ چوکنا تھی آنے والے خطرے کی بو وہ ایک جنگلی جانور کی طرح پا لیتا اور اپنے چپو کی مناسب جنبش سے اس پر قابو حاصل کر لیتا۔ اپنے خوف سے کچھ خلاصی پا کر میں نے دریا کے منظر کو دیکھا۔ یہ ایک پُرتجمل، ہولناک اور بے حد خوبصورت منظر تھا...... سہ پہر کے سونے سے رنگے، اچھلتے، بپھرتے اور شوکتے پانی۔ ہم ایک دو 'جزیروں' کے پاس سے گزرے۔ سیلاب میں آدھی ڈوبی ہوئی بستیاں، لوگ ڈھکیوں پر چارپائیوں پر لیٹے ہوئے کھجوروں کی چوٹیاں پانی پر جھومتی ہوئی۔ میں نے سوہنے (یہ اس ننھے مانجھی کا نام تھا، اور کتنا مناسب!) سے پوچھا کہ یہ لوگ ڈرتے نہیں؟ اس نے کہا "نہیں! یہ لوگ دریائی ہیں اور دریا پر وہ اتنے ہی محفوظ ہیں جتنے زمین پر۔"

اس وقت دریا میں سوائے سوہنے کی چھوٹی کشتی کے اور کوئی کشتی نہیں تھی۔ ہم کبھی بانس اور کبھی چپو کی مدد سے پہلے ہوا اور بہاؤ کی مخالف سمت گئے، پھر ننھے مانجھی نے کشتی کے پیندے میں ایک مخصوص جگہ اپنا بانس گاڑ دیا اور سرکنڈوں سے بنا ہوا ایک بادبان، جو اس نے کہیں تختوں کے نیچے رکھا تھا، نکال کر اسے مہارت سے اس بانس پر باندھ دیا۔ اس نے یہ سب کچھ مکمل

اطمینان اور بے پروائی سے کیا جیسے یہ دنیا کی آسان ترین چیز ہو، محض بچے کا کھیل۔ اس کے لیے واقعی یہ کھیل تھا۔ اس کے بعد وہ چین سے بیٹھ گیا۔ میں نے اسے ایک سگریٹ سلگا کر دیا۔ وہ بڑا خوش ہوا اور اسے ایک جوان کی طرح پینے لگا۔

''اب کوئی فکر کی بات نہیں، بیڑی ہمیں خود بخود دریا پار لے جائے گی سائیاں۔ دریا میرا بھی سنگتی ہے اور میری بیڑی کا بھی۔ سائیاں، تم اب تک تو سمجھ گئے ہو گے۔''

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس ملک سے آیا ہوں اور مٹھن کوٹ کس کے پاس جا رہا ہوں۔ میں نے اسے اپنے چچا کا نام بتایا، تو اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آیا، لیکن پھر اس پر پہلی سی چمک عود آئی۔

''اساں سوہنے سائیں دی رعیت ہاں۔ میں تینکوں اُتھے لے جاساں۔''

شام پڑنے لگی تھی اور پرلا کنارہ جس کی طرف ہم جا رہے تھے، کھجوروں اور گنبدوں کی ایک دھند سا بن رہا تھا۔ دریا کے بہاؤ کی سمت ایک دو میل دور۔ سوہنا کبھی کبھی اپنے گھونگھے کو سیدھی سمت پر رکھنے کے لیے چپو چلا دیتا اور بس۔

وہ گانے لگا۔ اس کی آواز میں ایک وحشیانہ تموج تھا، ایک آزاد الاپ تھی...... اپنے دریا سے مستعار لی ہوئی الاپ۔ یہ اس کے دیس کا نغمہ تھا جہاں آدمی قدرت کے ساتھ ہم آہنگی سے رہتا تھا اور تنومند اور دلیر اور جیالا ہو کر پروان چڑھتا تھا:

میری بیڑی ویندی پئی اے
نچدی کھلدی ویندی پئی اے
دریاواں دی مچھی اے
سوہنی اے تے سسی اے

میری بیڑی ویندی پئی اے
بھلّن تے سنسار دریا دے
تر کندے سنگھاڑ دریا دے
بیڑی دے ہن یار سبھانے

''یہ بڑا اچھا گیت ہے سوہنا۔ یہ گیت کس کا ہے؟''

میرے یہ کہنے سے وہ بڑا خوش ہوا ''یہ گیت میں نے خود بنایا ہے۔ میں نے اور کئی گیت بنائے ہیں۔ جب میں مچھلی کے شکار پر آتا ہوں تو گیت خود بخود میری زبان پر آجاتے ہیں۔ بہت سے تو مجھے بھول بھی گئے ہیں۔ مگر کیا ہوا، نئے گیت میں آسانی سے بنا لیتا ہوں۔''

سوہنے میں ایک شاعر کی روح تھی اور جب شام گہری ہوئی، تو میں نے اپنے خوف کو بالکل بھلا کر اس سے مختلف سوال پوچھنے شروع کیے۔ اس سے زیادہ پرکشش اور حیران کن لڑکا میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک چوہڑے کا بیٹا ہے اور اس کا باپ مر چکا ہے۔ اس کی ماں ٹوکریاں بن کر پیٹ پالتی ہے اور وہ اپنی چھوٹی کشتی میں مچھلیاں پکڑتا ہے۔ وہ بہت غریب ہیں اور دنوں تک ان کی خوراک میں ابلی ہوئی مچھلی اور بھنے ہوئے باجرے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ انھیں ہفتوں تک کھانا نصیب نہیں ہوتا۔

یہ کشتی جس میں ہم اس غصیلے پانی پر سفر کر رہے تھے، سوہنے نے خود اپنے ہاتھ سے ایک کھجور کے تنے کو کھوکھلا کر کے اور کچھ تختے جوڑ کر بنائی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ اکیلا مچھلی پکڑنے جاتا...... کانٹے اور ڈور کے بغیر۔ اس کے پاس ایک پھٹا پرانا جال تھا جو ایک شناسا مچھیرے نے اسے دیا تھا۔ اسے ایسی آوازیں نکالنی آتی تھیں، خاص قسم کی سیٹیاں اور کلکاریاں اور لوریاں، کہ جن کو سن کر مچھلیاں خود بخود کشتی کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔

''سائیاں! میکوں مچھی آون دا آپے آپ پتا چل ویندا اے۔'' اس نے کہا۔

سوہنے میں وہ چھٹی حس تھی جو قدرت کے سب جنگلی جانوروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی حس سے ہوا کے پرندے طوفان کے آنے سے گھنٹوں پہلے خبردار ہو جاتے ہیں اور شکاری کتے خرگوش کے قدموں سے اس کی بو پا کر اپنے کان کھڑے کر لیتے ہیں اور چمگادڑ اپنی آنکھوں کے بغیر سب رکاوٹوں سے بچتی بچاتی اڑتی ہے۔ ابھی روہی میں ایسے لوگ ہیں جو زمین کے نیچے پانی کو سونگھ لیتے ہیں اور کبھی ایسے ریڈ انڈین بھی ہوتے تھے جو ایک ٹہنی کی ہلکی سی چیخ سے یہ بتا سکتے تھے کہ ان کی کھوج میں کون دشمن آ رہا ہے۔ سب مخلوقات جو قدرت کے ساتھ یکجان ہو کر رہتی ہیں، اس چھٹی حس کی مالک ہوتی ہیں اور یہ باعث حیرت نہیں کہ ننھے مانجھی کو یہ پتا چل جاتا تھا کہ مچھلی آ رہی ہے۔

جب مچھلی نزدیک آ جاتی، تو وہ اپنے منہ میں چاقو اور ہاتھ میں جال لیے دریا میں چھلانگ لگا دیتا۔ وہ کبھی کشتی میں سے جال نہیں پھینکتا تھا کیونکہ جال پھٹا پرانا تھا اور اس میں سے مچھلی کے نکل جانے کا خطرہ تھا۔ پانی میں وہ مچھلی کو جال میں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ یہ کوشش اکثر بار آور ہوتی، لیکن اگر مچھلی جال میں کسی وجہ سے نہ آتی، تو وہ اپنے ہاتھ استعمال کرتا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ مچھلی کے شکار کے وقت منہ میں چاقو کیوں دابے رکھتا ہے؟ اس نے کہا، دریا میں ایک بڑی مچھلی بھلّن ہوتی ہے۔ جب مچھلیاں اس کی کشتی کی طرف آتی ہیں، تو بعض دفعہ یہ بھلّن ان کے پیچھے پیچھے آ پہنچتی ہے۔ یہ گدھے جتنی بڑی ہوتی ہے اور بہت طاقتور ہوتی ہے۔

''ایہہ چاقو، سائیاں! بھلّن کو مارنے کے لیے ہے۔ میں بھلّن کے پیٹ کے نیچے تیر کر جاتا ہوں اور دو تین بار اس کے پیٹ میں چاقو گھونپتا ہوں۔ اپنے قد و قامت کے باوجود یہ آسانی سے مر جاتی ہے۔''

سوہنے نے مجھے اپنی بائیں ٹانگ دکھائی۔ یہاں گھٹنے سے لے کر ایڑی تک ایک ایک گھاؤ کا نشان تھا۔

''سائیاں، بوجھو یہ کیسے ہوا؟''

''مجھے معلوم نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم کو یقین نہ آئے گا سوہنے سائیاں! ایک دفعہ میں پار کے علاقے میں بیڑی میں مچھلی پکڑنے گیا۔ بڑی دیر تک کوئی مچھلی نہ آئی اور میں سمجھا کہ اس حصے کی سب مچھلیاں کہیں چلی گئیں ہیں۔ پھر جب میں گھر کا رخ کرنے لگا، تو مچھلیوں کا لشکر بیڑی کی طرف تیرتا ہوا آیا۔ لیکن اس کے پیچھے گدھے جتنی بڑی بھلّن تھی۔ میں چاقو منہ میں دابے پانی میں اتر گیا۔ اب بھلّن مچھلیوں کو کھاتی ہے اور سنسار بھلّن کا شکار کرتا ہے۔ اس وقت بھلّن کے پیچھے پیچھے ایک سنسار بھی بھلّن کو کھانے چلا آیا تھا۔ یہ مجھے پتا نہ تھا۔ میں بھلّن کے پیٹ میں چاقو گھونپنے لگا تھا کہ نیچے سے سنسار نے اپنے جبڑے میں میری ٹانگ کو پکڑ لیا۔ سائیاں، تم یقین نہیں کرو گے۔ میں نے اپنے ہوش و حواس بجا رکھے۔ میرے باپ نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ سنسار کی آنکھیں اگر اندھی کر دو تو وہ بے بس ہو جاتا ہے۔

بس سائیاں، میں تیر کر سنسار کے دہانے کے سامنے آیا اور اس کی آنکھوں میں چاقو سے دو گھونپے دیے۔ بڑا لہو بہا۔ سنسار تکلیف سے تڑپنے لگا اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں بچ کر اپنی کشتی میں چڑھ آیا مگر میری ٹانگ بالکل لوتھڑا ہو گئی۔ ہسپتال میں وہ اسے کاٹنے لگے تھے، پر بڑے ڈاکٹر نے کاٹنے نہ دیا۔ مجھے ہسپتال میں چار پانچ مہینے رہنا پڑا اور میری ٹانگ اب سوائے اس نشان کے بالکل ٹھیک ہے۔''

ننھا مانجھی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس کے چمکیلے چہرے پر صاف صاف لکھا تھا: میں سچ بول رہا ہوں!

پھر اس نے کہا ''سائیاں! میں مچھلیاں کوں سڈاں؟ ایس ڈار وچ مچھلیاں نیں۔'' وہ سیٹیاں مارنے اور اپنے ہاتھوں کو ایک خاص انداز میں بجانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پانی میں مچھلیوں کے اچھلنے کی حرکت پیدا ہونے لگی۔ ننھے مانجھی کو پانی میں نہ اترنا پڑا کیونکہ ایک مچھلی چھلانگ لگا کر کشتی میں آ کر گری، تڑپتی ہوئی۔

میں یہ بتانا بھول گیا کہ ہم پرسکون پانی میں تھے...... دریا کی چھل کے بنائے ہوئے ٹاپو میں۔ ہم اس پتن سے گزر آئے تھے جہاں فیری لنگر ڈالے کھڑی تھی اور اب ہم کھجوروں کے جھنڈوں میں سے اندھیرے سبز راستوں میں شپ شپاتے گزر رہے تھے۔ کشتی میں سے کھجوروں کے گچھے توڑتے ہوئے ہم آخر خشکی پر آئے۔ مغرب کی سمت ایک سفیدی نے ہمیں بتایا کہ چاند ابھر آیا ہے۔

ننھے مانجھی نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور ہم سونی سڑک پر چل پڑے۔ میرا دریائی چچا شہر کی دو منزلہ حویلی میں رہتا تھا۔ میں وہاں پہلی دفعہ آیا تھا لیکن سوہنے کو اس جگہ کا پتا تھا۔ وہ مجھے وہاں لے گیا۔

میرے چچا نے مجھے خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا۔ اس کا چہرہ مسکراہٹوں سے شکن آلود ہو گیا، کیونکہ اب تک وہ میرے آنے سے مایوس ہو چکا تھا۔

جب میں اس سے مل رہا تھا، تو سوہنا دروازے میں کھڑا تھا۔ میں سوہنے کو دو روپے دینے لگا، تو میرے چچا کا مسکراتا چہرہ درشت اور سخت ہو گیا۔ وہ سوہنے پر برسا ''او چوہڑے دے بچے، تینکوں ساڈے خاندان توں پیسے لیندیاں شرم نہیں آندی؟''

سوہنا چلا گیا۔ میرا چچا ان علاقوں میں ایک سخت اور جابر آدمی کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اس کا نام سنتے ہی سوہنے کے چہرے کی رنگت کیوں بدلی تھی۔

میں مٹھن کوٹ میں دو ہفتے رہا۔ مجھے اپنے چچا سے آبائی زمین کے معاملات طے کرنا تھے مگر اس کے زرخیز دماغ میں دوسرے ارادے تھے۔ البتہ یہ میرے ذاتی معاملات ہیں اور یہاں مجھے ان کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔

ایک دفعہ میں نے خواجہ غلام فرید کے روضے کی عقبی گلی میں سوہنے کو پھر دیکھا۔ سوہنا مجھے اپنے گھر لے گیا۔ دریائی ٹاپوؤں کے کنارے پر سرکنڈوں کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس میں مٹی کے دو تین برتنوں کے سوا کچھ نہ تھا یا پھر سیپیوں کا ایک ہار اور ایک بانسری دیوار سے لٹک رہی تھی۔ سوہنا یہاں اکیلا رہتا تھا۔ اس نے کچھ افسوس سے کہا کہ اس کی ماں نے شادی کر لی ہے اور وہ اور اس کا خاوند علی پور چلے گئے ہیں جہاں اس کے سوتیلے باپ کی لوہارے کی دکان ہے۔

''سوہنا'' میں نے پوچھا، تمھارے پاس چارپائی نہیں؟''

''میں زمین پر سوتا ہوں، سوندھی سجری زمین پر۔'' اس نے مجھے سرکنڈوں کی ایک چٹائی دکھائی۔ ''میں اس پر سوتا ہوں۔ یہ میرا وِچھاون ہے۔''

''تم سانپوں سے نہیں ڈرتے؟'' میں نے پوچھا۔ میں خود سانپوں سے بے حد ڈرتا تھا اور ان کے ڈراؤنے خواب دیکھا کرتا تھا۔

''سانپ مجھے کچھ نہیں کہتے۔ میں تو ان کے ساتھ کھیلتا ہوں۔''

''اور تم سردیوں میں کیسے رہتے ہو؟ تمھارے پاس لحاف نہیں تم تو ٹھٹھر جاتے ہو گے؟''

''مجھے سردی نہیں لگتی۔ جب سخت سردی پڑتی ہے، تو سائیاں! پتا ہے میں کیا کرتا ہوں؟ میں بہت سا گڑ کھا لیتا ہوں اور اپنے وِچھاون پر لیٹ جاتا ہوں۔ یہ بڑا لمبا ہے اس لیے آدھے حصے کو الٹا کر اپنے اوپر اوڑھ لیتا ہوں۔ میں اتنا گرم ہو جاتا ہوں جتنا سیڑ (خرگوش) اپنے بھٹ میں۔''

میں نے اسے کہا کہ وہ میرے ساتھ سکھر چلے، میں اسے وہاں کسی فیکٹری میں نوکر کرا دوں گا۔ مگر وہ سوچ میں کھو گیا۔ اس نے اپنا سر ہلایا ''میں اپنی بیڑی اور دریا کو نہیں چھوڑ سکتا سائیاں۔ میں فیکٹری میں کام کرنا نہیں چاہتا۔''

پھر اس نے کہا ''سائیاں! میں تیڈی کیا خدمت کراں؟ میرے پاس کچھ مکھانے ہیں۔'' وہ ایک پیالے میں مکھانے لے آیا اور ہم کھانے لگے۔ یہ غریبانہ مہمان نوازی ایک بادشاہ کی ضیافت سے کہیں اچھی تھی۔ پھر اس نے بانسری دیوار سے اتار لی اور اسے بجانے لگا۔

''سوہنا! تم نے کوئی نئے گیت بنائے ہیں؟''

''بہت سے۔ ہر روز جب میں اپنی بیڑی میں مچھلیاں پکڑنے جاتا ہوں، نئے گیت بناتا ہوں۔ کبھی میرے ساتھ شکار پر چلو، میں تمھیں بہت سے گیت سناؤں گا۔''

میں نے اسے تین روپے دینے کی کوشش کی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ سوہنا خوددار لڑکا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے اپنی کشتی میں مٹھن کوٹ لے کر آیا تھا اور میں نے اسے کوئی اُجرت نہ دی تھی۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ پھر میں اسے اپنے ساتھ بازار لے آیا اور اسے اس کی پسند کی چیزیں خرید دیں...... ایک نیا چاقو، ایک سیر نمک، آدھ سیر گڑ، چائے کا ڈبا، بجی، تھوڑا سا رنگدار لٹھا۔

وہ بڑا خوش ہوا اور اس نے کہا کہ اب وہ بادشاہ زادے کی طرح رہے گا۔

وہ اس وقت تک مجھے چھوڑنے پر تیار نہ ہوا جب تک میں نے اس سے وعدہ نہ کر لیا کہ میں کسی دن اس کے ساتھ شکار پر جاؤں گا۔

میں اس کے ساتھ مچھلی کے شکار پر نہ جا سکا اور اگرچہ میری رخصت کے چند دن باقی تھے مگر مجھے دوسرے ہی دن اپنے دریائی چچا سے ایک جھگڑے کی وجہ سے مٹھن کوٹ چھوڑنا پڑا۔ دریا کے پتن پر جاتے ہوئے میں نے سوہنے کی جھونپڑی میں جھانکا، مگر ننھا مانجھی وہاں نہ تھا۔ ساتھ کی جھونپڑی میں ٹوکریاں بننے والی ایک بوڑھی عورت نے مجھے بتایا کہ وہ شکار پر گیا ہے۔ ''اللہ اس کو حیاتی دے۔ بڑا نیک ہے وہ۔ مچھی لاتا ہے، تو بچوں کو تقسیم کرتا پھرتا ہے۔ میں اس کے لیے دعا مانگتی رہتی ہوں کہ رب اسے نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔''

مجھے اس سے نہ ملنے کا افسوس ہوا۔ میں فیری لانچ کے پتن پر پہنچا اور ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گیا۔ ریل کے ڈبے کے سے کمرے میں بڑا حبس تھا اس لیے میں سامنے عرشے پر پتوار کے پاس ایک چارپائی پر جا بیٹھا جو دراصل ایک ترکی ٹوپی والے تھل تھل کرتے مخدوم کے لیے بچھائی گئی تھی۔ میں نے پتلون کوٹ پہن رکھا تھا اس لیے کسی نے اعتراض نہ کیا۔ مخدوم کے پاؤں دبانے کے لیے چار نوکر تھے اور ایک اس کا حقہ بھرنے پر مامور تھا۔ میں نے مخدوم کے ساتھ حقہ پیا اور ہم نے بہت سی باتیں کیں...... اوقاف کی چیرہ دستی کی، روحانیت کی کمی کی اور شکار کی۔ ایسے مواقع پر آدمی خود کو بڑھا کر ظاہر کرے، تو ٹھیک رہتا ہے، اس لیے میں نے مخدوم پر یہ ظاہر کیا کہ میں شکار پور میں فاریسٹ آفیسر تھا۔ پھر میں نے اسے اگلی سردیوں میں وہاں شکار پر آنے کی دعوت دی۔ فیری لانچ ابھی منجدھار میں تھی کہ مجھے ننھے مانجھی کی بیڑی دکھائی دی...... بالکل ننھی سی ڈونگی! ننھا مانجھی پانی میں تھا...... مچھلیاں پکڑتا ہوا، دھوپ میں ایک یونانی دیوتا کی طرح حسین اور جیالا۔

اس نے ایک دفعہ بھی فیری لانچ کی طرف نہ دیکھا۔ وہ مچھلیاں پکڑنے میں بہت مصروف تھا ''اب دیکھو'' مخدوم نے کہا۔ ''اب ہماری یہ حالت ہو گئی ہے کہ میں نے اپنے پرانے وفادار مدار المہام کو بھی چھٹی دے دی ہے۔ گورنمنٹ کہتی ہے کہ ان کی املاک چھین لو۔ کل کو کہے گی کہ ان کے شکاری کتے بھی چھین لو۔ آخر کتے بھی تو املاک میں شامل ہیں۔''

میں نے اتفاق کیا۔ اس گئے گزرے زمانے میں روحانیت کی اقدار واقعی مٹ رہی تھیں۔ چار پانچ سال بعد میں علی پور میں سینئر کمپاؤنڈر مقرر ہوا۔ ہماری آبائی جائداد منھن کوٹ کے پاس تھی اور میں نے کوشش کر کے اپنی تبدیلی علی پور میں کرائی تا کہ جائداد کی دیکھ بھال کر سکوں۔ میں منھن کوٹ اپنے چچا سے ملنے نہ گیا۔ ہمارے تعلقات بعض خاندانی معاملات کی وجہ سے کشیدہ اور تلخ ہو چکے تھے۔ چار سال پہلے سکھر میں، میں نے ایک سندھی تاجر کے گھرانے میں شادی کر لی تھی اور اب ہمارے دو بچے تھے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ شادی ایک عجیب تجربہ ہے۔ یہ ساری کی ساری گلابوں کی سیج نہیں جیسی کہ پہلے پہل نظر آتی ہے۔ آزاد منش آدمی کو تو یہ بالکل راس نہیں آتی اور وہ کئی بار مضطرب ہو کر ان بندھنوں کو توڑ کر جنگلوں میں بھاگ جانا چاہتا ہے۔ ہمارے درمیان اخراجات پر اکثر جوتم پیزار ہونے لگتی تھی۔ عورتیں عموماً تنگ دل اور ارضی ہوتی ہیں اور جب ان کے بچے ہو جاتے ہیں تو ان کی ساری محبت اور دلچسپی بچوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور ان کے خاوند ان کے لیے صرف ضروریات مہیا کرنے کے آلے بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان تلخ جھگڑوں کے بعد ہم بعض دفعہ دنوں ایک دوسرے سے نہ بولتے اور ان دنوں سُتا ہوا اور بجھا ہوا میں دریا پر مچھلیاں پکڑتے ہوئے ننھے مانجھی کے بارے میں سوچتا...... ہواؤں کی طرح آزاد اور گیت گاتا ہوا سوہنا کتنے مزے کی زندگی گذار رہا ہوگا!

ایک دن سوہنا آ گیا۔ مجھ پر اس صبح تاریک موڈ طاری تھا اور میں ہسپتال کے دواخانے میں بیٹھا ہسپتال کے اردلی بخشن کو نمبر ایک سے لے کر نمبر دس تک مکسچر بنانے کی ہدایات بے پروایانہ انداز میں دے رہا تھا۔ تب میں نے کھڑکی میں سے سوہنے کو دیکھا...... دبلا پتلا سوہنا، بالکل ایک مختلف سوہنا۔ اس کے ساتھ رنگدار چھینٹ کے کرتے اور گھگھرے میں ایک دیہاتی عورت تھی، پینتیس چھتیس سال کی مگر ابھی تک جوانی کی سج دھج لیے ہوئے اور نخریلی۔ سوہنا اس کے کندھے کا سہارا لیے ہوئے تھا اور گھسٹتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ بیمار تھا۔

میں نے اسے کھڑکی میں سے آواز دی، ''سوہنے!'' اور میں باہر برآمدے میں آ گیا۔ مجھے دیکھ کر سوہنے کے چہرے پر پہلی سی مسکراہٹ آ گئی، ''سائیاں!'' مجھ سے ہاتھ ملا کر اس نے کہا، ''سائیاں، تم یہاں کہاں؟''

میں اسے اپنے دواخانے میں لے آیا اور سہارا دے کر اسٹول پر بٹھا دیا۔ عورت اطمینان سے پھسکڑا مار کر ایک دلربا حیوان کی طرح فرش پر بیٹھ گئی۔ میں تعجب کر رہا تھا کہ آیا سوہنے نے شادی کر لی ہے۔ ان علاقوں میں وٹے سٹے کے رواج کی وجہ سے سولہ سال کے لڑکے کے ساتھ اپنے سے کافی زیادہ عمر کی عورت کا بیاہ ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ سوہنے نے مجھے اس شش و پنج میں سے خود ہی نکالا ''سائیاں، ایہہ میری ماں بی بی اے۔''

دریائی علاقے کی عورتیں اپنی جوانی کے رنگ روپ کو دیر تک قائم رکھتی ہیں۔

''سوہنا، تم بیمار ہو؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟

سوہنا نے مجھے بتایا کہ وہ پچھلے چار پانچ ماہ سے ایک عجیب پیچیدہ بیماری میں مبتلا ہے۔ پہلے پہل اس نے توجہ نہ دی اور مچھلیاں پکڑنے کے کام کو جاری رکھا۔ لیکن اب وہ کافی بیمار ہو گیا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سن ہو جاتے تھے۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا اور ایک دو دن پہلے اسے خون کی قے ہوئی تھی۔

''ڈاک دار صاحب!'' سوہنے کی ماں نے کہا ''میرا پتر لکھ ہو گیا ہے۔ ایہدے چہرے ول دیکھ ڈاک دار صاحب۔ میرے سوہنے نوں ٹھیک کر دے۔''

مجھے سوہنے کی بیماری کا سن کر بڑا دکھ ہوا۔ کسی طرح میرے دل میں یہ بات نہ آتی تھی کہ سوہنا بھی سب کی طرح بیمار پڑ سکتا ہے۔

سوہنے نے کہا ''جب میں بیمار پڑ گیا، تو میں اپنے ماما کے ساتھ بس میں بیٹھ کر اپنی اماں بی بی کے پاس علی پور آ گیا۔ میری اماں بی بی یہاں یار ولو بار سے بیاہی ہوئی ہے۔ میرا متریا باپ بڑا اچھا آدمی ہے۔ پنج وقت دا نمازی۔''

سوہنا اپنی اماں بی بی کی دوسری شادی کر لینے کو بالکل قدرتی بات سمجھتا تھا اور اس طرح اسے غرور تھا کہ اس کی ماں ایک خاوند کو پھانسنے اور اپنا گھر بسانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس کے دل میں اس کا ذرا ملال نہ تھا...... یہ کوئی عجیب بات نہیں، تہذیب کے ٹیبو ہی ہر بات کو عجیب بنا ڈالتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر سے کہہ کر سوہنے اور اس کی ماں کو ہسپتال میں ایک چھوٹی سی الگ کوٹھڑی لے دی۔ ڈاکٹر مریضوں کو ہسپتال میں رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ اس سے اس کا کام بڑھ جاتا تھا اور بعض قیمتی دوائیں جو بازار میں فروخت ہو سکتی تھیں، ضائع ہو جاتی تھیں۔ مگر میں نے اس سے کہا کہ سوہنا میرا قریبی عزیز ہے۔ یوں وہ مان گیا۔

سوہنے کو دق کی قسم کی کوئی بیماری تھی، اگرچہ پوری طرح اس کی تشخیص نہ ہو سکی۔ میں اس کا بھائی کی طرح

خیال رکھتا۔ اسے وقت پر دوا ملنے اور ٹیکے بہم پہنچانے کی فکر کرتا اور شام کو کام سے فارغ ہو کر اس کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر اس کی باتیں سنتا۔ جب بھی میں جاتا اس کا چہرہ کھل اٹھتا اور ایک پیلی سی مسکراہٹ اس پر آجاتی۔ اس کی ماں سب دیہاتی عورتوں کی طرح حوصلہ مند اور محنتی تھی۔ وہ شام کو کوٹھڑی کے باہر ریت پر بیٹھ کر اپنے بیٹے کے لیے روٹی پکاتی۔ بعض وقت یارو لوہار آتا...... بھاری بھر کم، چوڑا چوڑا چکلا چہرہ، مہندی سے رنگی ہوئی ڈاڑھی، آنکھوں میں سرمہ، وہ ہمیشہ سوہنے کے لیے کچھ نہ کچھ چیز لے کر آتا۔ سوہنے میں کوئی ایسی بات تھی، اس کی گفتگو کا ایسا سلجھاؤ تھا کہ ہر کوئی اس سے محبت کرنے لگتا تھا۔

لیکن ہماری تمام تر توجہ کے باوجود سوہنے کی حالت ابتر ہوتی گئی اور وہ ماضی کے سوہنے کا ایک ہیولا سا رہ گیا۔ اس کے بازو اور ٹانگیں اب پتلی سوکھی لکڑیاں نظر آتی تھیں۔ اب مجھے احساس ہونے لگا کہ ہواؤں اور دریاؤں کا پالا سوہنا ہمارے پاس سے چلا جائے گا۔ لیکن وہ کیسے مر سکتا تھا؟ وہ جو قدرت کے عناصر میں سے ایک تھا، دریا جس کا بھائی تھا اور بیڑی جس کی بیوی اور محبوبہ تھی! وہ جو لہروں پر بادشاہ کی طرح سوار ہوتا تھا اور دیوتاؤں کی طرح گیت گاتا تھا! مچھلیوں کو کلکاریوں سے بلا لینے والا سوہنا! بھلّن اور مگرمچھ سے کشتی لڑنے والا سوہنا، وہ بھلا کیسے مر سکتا تھا؟

ایک شام میں اس کوٹھڑی میں گیا۔ اتنی کمزوری کے باوجود اس کی آنکھوں میں وہی روشنی تھی۔ اس نے کہا ''سائیاں! میں اچھا ہو جاؤں گا، تو ہم چھل پر مچھلیاں پکڑنے جائیں گے۔''

''ہاں ہاں سوہنا! تم اچھے ہو جاؤ گے۔''

پھر وہ اداس ہو گیا ''میری بیڑی میرے واسطے مونجھ گئی ہوسی۔ سائیاں! میں مر گیا، تو میری بیڑی دا کی ہوسی؟''

''تم جلد اچھے ہو جاؤ گے سوہنے۔''

''نہیں، اب نہیں سائیاں!'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''حیاتی کتنی سوہنی شے ہے سائیاں۔ میں مرویساں تے تاں دریا میکوں یاد کریسی کہ کوئی حوصلے والا نکا میڈی چھاتی دے چڑھ کے گمدا (گاتا تھا)۔ میری مچھلیاں پوچھیسن (پوچھیں گی) کہ چھوٹا جیا مانجھی کتھاں ایں جیہڑا کلکاریاں نال انہاں سڈ دیندا اہا۔ میں ہن شکار تے کدے نئیں جا سال سائیں۔ میں کدھے ہور دریا ول ویندا پیا ہاں...''

اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھ رہی تھیں، کسی دور کے دیس کی طرف۔ پھر اس پر کھانسی کا ایک شدید دورہ پڑا۔ کھانستے کھانستے اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ جھٹ لیٹ گیا۔ اس کی ماں بھاگتی بھاگتی اندر آئی اور اپنے بیٹے سے روتی ہوئی لپٹ گئی ''او میرے سوہنے لعل! او میرے سوہنے پتر!''

میں بھاگا بھاگا کورامین لانے گیا۔ لیکن جب میں لوٹا تو سوہنا بہت دور جا چکا تھا۔

اس کی ماں چھاتی پیٹ کر بین کر رہی تھی، مگر سوہنا جیسے چپ چاپ سو رہا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ زندگی اور موت کے بڑے پرشور دریا پر تن تنہا مچھلی اور بھلّن کا شکار کرنے چلا گیا تھا، میرا ننھا مانجھی!

○○○

گردن پر گرم سانس

ایک غیرت مند کی انوکھی کہانی

وہ اپنی سوچ اور پسند کو برحق سمجھ کر زندہ تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس سوچ نے کہاں کہاں تک سیندھ لگائی ہے

عرفان جاوید

''عزت ای کہتا چاچا ٹیک تا۔ پنجابی بے حوصلہ قبیلہ ہے۔ وہ کہتا تا۔ ''ڈھگا۔''

غیرت خان نے بندوق کی نالی میں دیکھا۔ نالی کی ہموار سُرنگ کی دوسری طرف روشنی کو دیکھ کر تسلی کی۔ اُس کے اندر پھونک ماری۔ پھونک سے تھوڑی سی گرد اُڑی۔ وہ نالی کو دونوں گھٹنوں کے بیچ میں دبا کر خشک کپڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا۔

''اگر بے حوصلہ نہ ہوتا، تو ہر غیر قوم کے سامنے جھک نہ جاتا۔

اُس نے نسوار کچے فرش پر تھوکی اور آستین سے ہونٹوں کو پُونچھ لیا۔

''آج بوہت غصہ کرتا ہے۔ بوہٹ خفا ہے۔''

دلاور خان نے داڑھی کھجائی۔

''اب بولنا خلاص کرنے کو ہے اور جہاد شروع کرنے کو۔ اللہ قبول کرے۔'' غیرت خان نے کنکھیوں سے مٹی کی دیوار پر پیوستہ پھٹے پر دھرے ٹی وی کو دیکھا اور نالی کو رگڑنا جاری رکھا۔

''دلاور خانا! کافر کو تو مافی ہے۔ پر منافق کو نئیں۔ پھر ایسا منافق جو مسلمان کی صف میں شامل ہو کے پیٹھ سے

حملہ کرے۔ مرد کا بچہ ہو تو سامنے سے آئے۔ وہ دیکھ۔'' اس نے سامنے اشارہ کیا۔

ٹی وی پر ایک بارلیش جوان لہک لہک کر سازوں کے ساتھ نعت پڑھ رہا تھا۔

''بس ایسا منافق کو غیرت خان سیدھا جہنم بھیجے گا، ڈائریکٹ پارسل، بغیر ٹکٹ، او میراثی! اگر گانا بجا کر رسول ﷺ کا نام بول کر اسے خفا ہی کرنے کا ہے، تو چھوڑو یہ منافقت اور صاف دشمن کے خبیث بچوں کے ساتھ دوستی بناؤ۔ ہونٹوں پر سرخی جماؤ، زنانوں کی طرح گھنگھرو چڑھاؤ، خوب ناچو اور رات ان کو خوب مزے کراؤ۔''

غصے سے غیرت خان کی آنکھیں باہر کو اُبل آئیں اور ہاتھوں کی حرکت میں تیزی آگئی۔

''ام نے بھی اللہ کے حکم سے یہ بندوق کی نالی اِن خبیث کے بچوں کے منہ سے نہ نکالی تو پشتون نئیں۔''

تھوک کے چھینٹے اُس کے ہونٹوں سے اُچھل پڑے۔

دلاور خان ہنس پڑا۔

''غیرت خانا! داڑھی مونچھ تو آنے دے۔ اتنا خفا ہونا بھی ٹیک نئیں۔ ابی تو ام لوگ تیری شادی بنانے کو ہے۔''

''امارے سینے میں اتنا بڑا داڑھی ہے کہ کسی مولوی صاحب کے بھی نئیں۔ پھر عزت چاچا نے کان میں اذان دے کر مسلمان کیا۔ اچھا کیا، بوہٹ مہربانی کیا، اب جوان ہوا، تو جہاد سے شادی کر لیا۔ غیرت خان کے لیے یہی بوہت ہے۔'' غیرت خان نے اپنے سینے کو ٹھونکا۔

''عزت خان کو شہادت مبارک ہوئے دو سال ہونے کو ہے۔ پر تُو ہر دم اُسے یاد کرتا ہے۔''

غیرت خان نے بات کاٹ دی۔

''اس نے اِس کافر کو مسلمان بنایا، پھر قرآن پڑھایا۔ بندوق پکڑنا سکھایا، بوہٹ بڑا احسان کیا، انسان کا پرکھ بتایا۔ اور پھر جنت کا رستہ پر خود تو چلا گیا پر سچا رستہ دِکھا گیا۔''

اس پر دلاور خان بولا ''ہاں صحیح بولتا ہے تو۔ پولیس نے دو گھڑی سانس بھرنے بھی نہ دیا۔ کتے کے بچوں نے گولی سیدھا پیٹھ میں اُتار دیا۔ مرد کے بچے ہوتے تو ٹرک چھوڑ کر جاتے چاچا کی پیٹھ میں گولی نہ مارتے۔''

غیرت خان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''اب چاچا جنت سے امارے لیے دعا کرتا ہو گا۔ بوہت نیکی کمایا۔ سفید خنزیروں کے وطن میں خوب بھر بھر کے نیند کا دوائی بھیجا اور جہاد کے لیے پیسہ کمایا۔ شہید بولتا تا کہ ان سفید خنزیروں کو اتنا دوائی پلاؤ کہ مرے کُتے کے مافق ہو جائیں۔ اللہ بی اس کی نیکی کا اجر دے گا۔ نہ دن دیکھا نہ رات، لنڈی کوتل سے سہراب گوٹھ تک محنت کیا۔ دماغ ایسا چلتا تھا کہ گاڑی کے اندر ایسا ایسا تریکے سے دوائی چھپایا کہ ام کو حیران کر گیا۔''

دلاور خان نے لمبی سانس بھری۔ ''اور اب جنت میں اکیلا مزے کرتا ہے۔''

اب ٹی وی پر ایک سیاسی جماعت کے وزیر کی تقریر آ رہی تھی۔ غیرت خان نے اُدھر دیکھا اور حقارت سے بولا ''کمزور! عزت چاچا بولتا تا کہ سہراب گوٹھ کے اُدھر کافر کے بچوں کے ہاتھ میں بندوق آیا، تو پشتون کے گردن کو آ گیا۔ پہلے تو تھپڑ کھا کے ماموں کو یاد کرنے کا تھا۔ اِدھر ام پورا دُنبا ہضم کر جاتا ہے اور ٹھنڈی پانی پی کر اللہ کا شکر کرتا ہے۔ اُدھر یہ ایک بوٹی کو چُوس چُوس کر چھوڑ دیتا ہے۔ اِن کافروں کو بھی دیکھ لے گا۔''

اس کی سوئی قومیت پر اٹکی ہوئی تھی۔

اب غیرت خان نے قریب پڑی میلی کچیلی پتیلی میں تیرتے کثیف تیل میں کپڑے بھگو کر اُسے نچورا اور نالی پر رگڑنے لگا۔

گوبر اور مٹی کی لپائی والے کچے کمرے میں ایک جانب کچی لکڑی کی کھڑکی تھی اور دوسری جانب دروازہ جس پر لکڑی کے دو تختے جھول رہے تھے۔ دیوار پر پھٹے کے تختے کے اوپر قرآن پاک، جائے نماز اور تسبیح دھری تھی۔ دوسری دیوار پر پیوست ایک پھٹے پر ٹی وی رکھا تھا۔

''ام جانتا اے کہ ٹی وی حرام اے۔ شیطانی ڈبہ اے، مگر عزت چاچا بولتا تا کہ دشمن پر نظر رکھنا ضروری اے۔ اس واسطے حرام بھی حلال ہو جاتا ہے، تو ام اس آلے کے ذریعے دشمن پر نظر رکھے اے۔ جب دشمن کمزور پڑے گا، ام اُس پر حملہ کر دے گا۔ اِس پشتون وطن کو کافروں سے آزاد بنائے گا اور اللہ کا حکومت لائے گا۔ پھر اٹک سے اُدھر کافر ملک سے جنگ کرے گا۔''

اس نے ایک مہمان کو توجیح پیش کی تھی۔

ایک کونے میں پلاسٹک کے فریم میں شیشہ تھا جس کے نیچے تیل کی بوتل اور کنگھا رکھا تھا۔ کچی زمین پر ایک طرف گول تکیے کے گرد چٹائی کو لپیٹ کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

دوسرے کونے میں بندوق کی نالیاں ایک ترتیب میں ڈھیر کر دی گئی تھی۔

اتنے میں ظہر کی اذان ہو گئی۔ غیرت خان اور دلاور خان کپڑے جھاڑتے اور سر پر ٹوپیاں سنبھالتے کمرے سے باہر نکل کر گلی میں آ گئے۔ گلی کے بیچ نالی میں سیاہ سیال میں پاخانہ بہتا آ رہا تھا۔

ایک کونے میں بچے دیوار کے ساتھ کُرسی کو کپڑوں کے ٹکڑوں سے بندھی بنی گیند سے نشانہ بنا رہے تھے۔ کُرسی کے ایک پائے کی جگہ اینٹیں رکھ دی گئی تھیں اور پائے سے بیٹ کا کام لیا جا رہا تھا۔ ایک بچے نے گیند کو شاٹ لگائی، تو وہ ہوا میں تیر کی سی تیزی سے نکلی۔ غیرت خان نے لپک کر اُسے ہوا سے اُچک لیا۔ بچوں نے شور مچا دیا۔ ''کیچ کیچ!'' اس پر غیرت خان تو ہونٹوں کو دانتوں میں دباتے ہوئے بالر کے انداز میں گیند کرائی۔ وہ یارکر کرتی کُرسی کو گراتی چلی گئی۔

غیرت خان کے چہرے پر دن میں پہلی مسکراہٹ آئی۔

''بچہ ای تو اے، اٹھارہ برس کیا عمر ہے۔'' دلاور خان نے سوچا۔

''غیرت خان اُدھر پشاور میں تو تجھے کرکٹ میں داخل کر لیا تا نا پھر تُو چھوڑ آیا۔ کچھ کرکٹ وِرکٹ کھیل کر غصہ نکالا کرتا پر تو اِدھر آ گیا۔''

غیرت خان ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا ''پھر بولنے کا نہیں، اللہ خفا ہوتا اے، جہاد افضل ترین ہے۔''

''خیر اے خانا؟'' دلاور خان نے پوچھا۔

''خیر ای نئیں، کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔''

''کمرے میں رکھا ای کیا اے؟'' دلاور خان کو واپس لوٹنا ناگوار گزر رہا تھا۔ اس پر غیرت خان چلتے چلتے رُک گیا اور سرگوشی کی۔

''اللہ سے مافی مانگنے کا اے، سارا دولت وہیں تو ہے، سارا جہاد کا مال اے۔''

دلاور خان نے سر جھکا لیا۔

نماز سے واپسی پر کچے مٹی کے رنگے مکانوں کے بیچ گلی میں چلتے آتے ہوئے غیرت خان نے کانوں کو چھوتے ہوئے دلاور خان سے کہا۔

''شکر اے اللہ کا پشتون کو مسلمان بنایا، ورنہ یہاں اللہ کا بے عزتی خراب ہوتا۔ چاچا عزت بوہت عقل والا اور سچا تھا۔ سندھی کے منہ پر اُسے بُزدل کہتا تھا۔ بولتا تا کہ وہ قوم ای کیا جو خود تو سارا دن چائے خانوں میں بیٹھے اور زنانے سے کھیتوں میں کام کرائے۔ اللہ کا اتنا زمین ضائع کر کے ناشکری کرتا اے۔''

دلاور خان نے لقمہ دیا۔

''پر بلوچ کی تعریف کرتا تھا، کہتا تھا کہ اپنے زنانے کو گھر بٹھاتا اے اور شرم کھاتا اے۔''

غیرت خان نے اُس کا ہاتھ تھاما اور دبا کر سرگوشی کی۔

''دلاور خانا بکری کا دودھ پیا کر، بھولتا اے کہ وہ کہتا تا کہ یہ قبیلہ شرم تو کھاتا اے پر پیسے پر بک بی جاتا اے۔''

اس پر دونوں متفق ہو گئے کہ ان کا تعلق اللہ کے خاص قبیلے سے ہے اور یہ کہ دونوں ملکوں کے مسلمان مل کر ایک آزاد وطن بنائیں گے اور دونوں کافر حکومتوں سے جنگ بنائیں گے۔

واپس آ کر کمرے میں جب دونوں نے ٹی وی لگایا، تو سامنے کرکٹ کا فائنل میچ آ رہا تھا۔

بھارت نے پاکستان کو جیتنے کے لیے ایک بڑا اسکور دیا تھا۔

غیرت خان نے نالی پر کپڑا رگڑتے ہوئے کن انکھیوں سے میچ کو دیکھا اور طنزیہ لہجے میں دلاور خان سے بولا ''کافر کا مقابلہ کافر سے۔''

اور اس نے سر جھکا لیا۔ بندوق کی نالی پر اس کے ہاتھ حرکت کرنے لگے۔ دونوں خاموش ہو گئے اور کمرے میں کرکٹ کی انگریزی کمنٹری کی آواز گونجنے لگی۔

''مولوی صاحب فرماتا اے کہ جنت کا زُبان عربی ہوگا اور جہنم کا انگریزی۔''

تھوڑی دیر بعد دلاور خان نے غیرت خان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''دشمن کی چال سمجھنے کے لیے اس کا زُبان آنا ضروری اے۔'' غیرت خان نے گویا اسے سمجھایا۔

کچی دیوار کی درز میں سے کوڑھ کرلی نے ننھا سا سر نکالا اور دیوار پر رینگتے ایک مکوڑے کو نگل کر اپنا سر اندر کر لیا۔

فائنل میچ سنسنی خیز لمحات میں داخل ہو گیا۔

غیرت خان کے ہاتھوں میں سستی اُتر آئی۔ اس کی آنکھیں یوں ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں جیسی رات کو جیپ کی روشنی میں چندھیا کر شکار کی آنکھیں جم جاتی ہیں اور وہ اپنی جگہ پر بُت ہو جاتا ہے۔

عصر کی اذان ہوئی، تو پاکستان کو جیتنے کے لیے

چون گیندوں پر ستر رن چاہئیں تھے اور اُس کے چھ وکٹ باقی تھے۔

''جلدی اُٹھو خانا! شیطانی ڈبہ اے، اللہ سے غافل کرتا اے۔''

جب دلاور خان بولا، تو غیرت خان خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اتنے میں پاکستان کا ایک اور کھلاڑی آؤٹ ہو گیا۔

رستے میں غیرت خان نے اُس سے کرکٹ میچ پر اپنا تجزیہ بیان کیا۔

''خنزیر کا بچہ بکا ہوا اے۔''

''دونوں طرف خنزیر اے، کون سا خنزیر؟'' دلاور نے پوچھا۔

''ختنے والا خنزیر!'' غیرت خان نے غصے سے کہا۔

''خفا کیوں ہوتا اے۔ تجھے کیا فرق پڑتا اے۔'' دلاور نے اسے سمجھایا۔

اس پر دونوں سر جھکائے مسجد میں دایاں پیر پہلے رکھتے ہوئے داخل ہو گئے۔ واپسی پر دلاور خان نے غیرت خان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا ''تم چلو! ام ابھی ایک فرض ادا کر کے آتا اے۔''

جب غیرت خان واپس کمرے میں لوٹا تو پاکستان کو جیتنے کے لیے چوبیس گیندوں پر تیس رن چاہئیں تھے۔

غیرت خان کی نظریں ٹی وی پر یوں جم گئیں جیسے موم بتی کی موم پگھلتے ہوئے اُسی پر جم جاتی ہے۔

چند لمحے گلی کی نالی میں بہہ گئے۔

کچھ دیر میں دلاور خان جب کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، تو غیرت خان ہاتھ میں بندوق کی نالی تھامے منہ کھولے ٹی وی اسکرین پر گھور رہا تھا۔ نالی سے تیل ٹپک ٹپک کر اُس کی قمیص میں جذب ہو رہا تھا، مگر وہ اس سے بے نیاز تھا۔

دلاور خان کچھ بولنے لگا، تو غیرت خان نے اسکرین پر ٹکٹکی لگائے ہی اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔

اس نے آگے بڑھ کر دیکھا، پاکستان کو فائنل جیتنے کے لیے آخری دو گیندوں پر چار رن چاہئیں تھے اور اس کا آخری کھلاڑی کریز پر تھا۔

بھارتی بالر اسٹارٹ لے چکا، دلاور خان غیرت خان کے اور نزدیک ہوا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

غیرت خان زیرِ لب تلاوت کر رہا تھا۔

اتنے میں باؤلر نے یارکر پھینکا جو بلے کو چھو کر ترچھا ہوا اور وکٹ کیپر کے قریب سے ہوتا ہوا باؤنڈری لائن عبور کر گیا۔

اس کے ساتھ ہی غیرت خان نے نعرہ بلند کیا اور دلاور خان کے گلے لگ گیا۔ وہ ہذیانی انداز میں بول رہا تھا ''دلاور خانا! ام نے جیت بنا لی، ام نے جیت بنا لی۔''

اور دلاور خان کبھی بندوق کی نالیوں کو دیکھتا تھا اور کبھی ٹی وی کو۔ وہ اپنی گردن پر غیرت خان کی گرم سانسوں کو محسوس کرتے ہوئے اس کے نعروں کو سنتا تھا اور اپنے آپ کو ہونق محسوس کرتا تھا۔

○○○

عام آدمی پارٹی

"عام آدمی پارٹی" کے قیام سے بھارت کے روایتی سیاسی نظام میں زلزلہ

پروفیسر محمد فاروق قریشی

☆ کیا بھارت میں سیاسی "تبدیلی" کا آغاز ہونے والا ہے

☆ دہلی انتخابات ہمارا آغاز ہے، لوک سبھا ہماری منزل ہے

☆ کانگریس اور بی جے پی سیاسی مشکلات کا شکار ہیں، دہلی کی حکومت کس کے ہاتھ آئے گی؟

سر پر گاندھی ٹوپی، آنکھوں پر چشمہ، ڈھیلی ڈھالی قمیص، کَسی ہوئی پتلون اور پیروں میں معمولی سینڈل پہنے 45 سالہ عام سا آدمی جس کی طرف عام حالات میں کوئی توجہ نہ دے۔ اروند کیجریوال "عام آدمی پارٹی" کا بانی اور مقبول راہنما جس نے پورے بھارت کی روایتی سیاست میں زلزلہ برپا کر دیا ہے۔ انا ہزارے کا قریبی ساتھی اور کرپشن کے خلاف چلائی گئی مہم کا زبردست حامی اور مبلغ، دہلی کی ریاستی اسمبلی کے 4 دسمبر کو ہونے والے کانگریس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے مقابلے میں ایک انقلابی راہنما کے طور اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ چونکہ بھارتی عوام کانگریس اور بی جے پی کے روایتی حکومتی ہتھکنڈوں اور کرپشن کے مہیب سکینڈلز کی وجہ سے ان دونوں پارٹیوں کی استحصال سیاست اور عوام دشمنی سے تنگ آئے ہوئے ہیں اس لیے وہ نئی "عام آدمی پارٹی" کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ کیجریوال نے اپنی جارحانہ انتخابی مہم سے دہلی کے سیاسی ماحول کو تبدیل کر دیا ہے۔ اس نے حکومتی اختیارات کو نچلی سطح تک منتقل کرنے، کرپشن کو جڑ سے اکھاڑنے اور انصاف کو عام آدمی کی دہلیز تک پہنچانے کو نعرہ لگایا ہے۔ اس کے سیاسی نظریات اور معاشی فلسفے نے عام لوگوں کو سحرزدہ کر دیا ہے اور اپنی محرومیوں سے بھری، مہنگائی کا شکار اور گھٹن زدہ زندگیوں میں روشنی کی ایک کرن دیکھ رہے ہیں۔ ہنومان روڈ دہلی پر پارٹی کے مرکزی دفتر میں کارکنوں کا ہجوم رہتا ہے۔ لاکھوں افراد پارٹی کے ممبر بن چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہزاروں رضا کار اندرون و بیرون ملک اپنے کاروبار، ملازمتیں چھوڑ کر انتخابی مہم میں حصہ لینے کے لیے دہلی آرہے ہیں۔ جو دہلی کے ہر انتخابی حلقے میں گھر گھر جا کر ووٹروں سے رابطہ کر رہے ہیں اور انھیں بتا رہے ہیں کہ یہ بھارت میں تبدیلی لانے کا ایک تاریخی موقع ہے۔ مختلف اخبارات اور اداروں کے سروے یہ بتا رہے ہیں "عام آدمی پارٹی" کی مقبولیت کا گراف دن بدن بلند ہوتا جا رہا ہے اور کانگریس اور بی جے پی پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔ خصوصاً کانگریس جو دہلی میں مسلسل پندرہ سال سے برسر اقتدار ہے اسے بھی زمین اپنے پیروں کے نیچے کھسکتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اسی لیے دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا ڈکشٹ (شیلا آنٹی) جنھوں نے وزارتِ اعلیٰ کی ہیٹ ٹرک مکمل کر رکھی ہے اب 4 دسمبر کے انتخابات کے حوالے سے تشویش میں مبتلا ہیں اور اپنی پارٹی کے مستقبل کو خطرے میں دیکھ رہی ہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے "عام آدمی پارٹی" عام لوگوں کے لیے ہے اور یہ عام آدمی کے مسائل کا حل پیش کر رہی ہے۔ پارٹی کے عام ارکان اور رضا کاروں نے چند ماہ کے اندگیارہ کروڑ روپے کے عطیات جمع کر لیے ہیں جن کا شفاف ریکارڈ رکھا جا رہا ہے جو پارٹی کی ویب سائٹ پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کیجریوال کو امید ہے کہ وہ دہلی اسمبلی کی 70 نشستوں میں سے 47 نشستیں جیت جائیں گے جو کہ کانگریس ارکان کی موجودہ تعداد سے بھی زیادہ ہیں۔ پارٹی کے زیادہ تر امیدوار نوجوان ہیں جو پہلی مرتبہ سیاسی میدان میں اترے ہیں۔ مثال کے طور پر جانک پوری سے ایک مٹھائی والا، چھتر پور سے ایک پہلوان، گوکل پور سے ایک مجسمہ ساز، شاکر بستی سے ایک ماہر تعمیرات۔ ان

سب کے نام عام لوگوں نے تجویز کیے ہیں۔ امیدواروں کے چناؤ کے لیے مندرجہ ذیل تین شرائط رکھی گئی ہیں۔

ہر امیدوار کو دیانتدار ہونا چاہیے۔ اس کو مضبوط کردار کا مالک ہونا چاہیے اور اس کے خلاف کوئی مجرمانہ مقدمات درج نہ ہوئے ہوں نیز اس کے غیر ازدواجی تعلقات کا ثبوت نہ ہو۔ ہر امیدوار کو اپنے معاملات شفاف اور احتساب کے لیے تیار رکھنے ہوں گے۔ امیدوار ایک تحریری حلف نامے پر بھی دستخط کریں گے جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1۔ میں سرخ بتی والی کوئی گاڑی استعمال نہیں کروں گا۔

2۔ میں بلاضرورت سیکیورٹی اسٹاف نہیں لوں گا۔

3۔ میں رہنے کے لیے بڑا بنگلہ قبول نہیں کروں گا۔

4۔ میں سوارج یعنی اختیارات کے نچلی سطح پر منتقلی کے اصول کا حامی ہوں۔ اس کے لیے میں قانون بنوانے کی کوشش کروں گا۔

5۔ میں جان لوک پال بل اور انتخابی اصلاحات کا حامی ہوں۔

6۔ حکومتی کو لوگوں کی رضا مندی کے بغیر زمین حاصل کرنے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ میں ایسا قانون بنواؤں گا۔

7۔ میں نے ''عام آدمی پارٹی'' کے فلسفے اور مقاصد کو پڑھ اور سمجھ لیا اور ان کے ساتھ پوری طرح متفق ہوں۔

کیجریوال کا سیاسی نصب العین ہے کہ اختیارات کو سیاستدانوں اور افسروں کے بجائے عوام کی طرف منتقل کیا جائے گا۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ اگر نچلی سطح پر عوام کو طاقتور بنایا جائے، تو اس سے ناقابل تصور بڑی تبدیلیاں پیدا ہوں گی۔ وہ اپنی پارٹی کے منشور یعنی سیاسی نصب العین اور معاشی فلسفے کو پانچ اہم نکات میں پیش کرتا ہے۔

☆ خارجہ پالیسی اور قومی سلامتی: ہم حساس دفاعی اور معاشی مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے تمام ممالک کے ساتھ پرامن تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں۔ دفاعی سامان کی خریداری میں سیاسی مداخلت اور کرپشن کو روکنے کا بندوبست کیا جائے گا۔

☆ معاشی فلسفہ: ہم عام آدمی ہیں اور اپنے مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ ہمیں مناسب حل دائیں یا بائیں جس نظریہ حیات سے ملے گا، اسے استعمال میں لائیں گے۔

☆ پرائیویٹ کاروبار: اگر ہم دولت اور روزگار پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو ہم ملک میں کاروبار کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ ہم قانونی اور انتظامی رکاوٹوں کو دور کر کے طریقہ کار کو آسان بنائیں گے اور دیانتدارانہ ماحول پیدا کریں گے۔ تعلیم اور صحت کے شعبوں میں سرکاری ادارے کام کریں گے اور باقی شعبہ جات میں پرائیویٹ سیکٹر کو آزادانہ کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ ہم خاندانی سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔

☆ بیرونی سرمایہ کاری: ہم بیرونی سرمایہ کاری کی نظریاتی مخالفت یا موافقت پر یقین نہیں رکھتے۔ ہمیں ہر شعبے میں بیرونی سرمایہ کاری کی خوبیوں اور خامیوں کو دیکھنا ہوگا۔ ہم حکومت کے دستیاب حقائق اور اعداد و شمار عوام کے سامنے رکھیں گے، مباحثے کی دعوت دیں گے اور ملک کے مفاد میں فیصلے کریں گے۔

☆ منڈی کی معیشت اور امدادی قیمتیں: منڈیوں کا مثالی طریقے سے کام کرنا خوش آیند ہوتا ہے۔ لیکن عملی طور پر چند مشترکہ مفادات رکھنے والے گروپ منڈیوں پر منفی اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ کمزور طبقات کے مفادات کا تحفظ دیانتداری سے کرے۔

کیجریوال انا ہزارے کی قیادت میں کرپشن مخالف تحریک میں شامل تھا اور 2011ء میں حکومت کے ساتھ طے ہونے والے جن لوک پال بل کے مسودے کو دہلی کا ریاستی قانون بنانے کے لیے پُرعزم ہے۔ نومبر 2012ء میں کیجریوال کے گروپ نے انا ہزارے سے راستہ الگ کر لیا اور باقاعدہ سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔ بدقسمتی سے انا ہزارے نے سیاست میں آنے سے انکار کر دیا ورنہ یہ پارٹی بھی مضبوط اور طاقتور ہوتی۔ وہ کہتا ہے کہ 2014ء میں لوک سبھا کے ہونے والے انتخابات کرپشن اور دیانتداری کے درمیان ہوں گے۔ وہ دہلی کے انتخابات کو صرف پہلا مقابلہ قرار دیتا ہے۔ اس میں کامیابی کے بعد وہ ملکی سطح پر انتخابات میں حصہ لیں گے۔

وہ سیاست میں کرپشن کی گندگی کے خاتمے کو اپنا اوّلین ہدف قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کا مقابلہ کانگریس یا بی جے پی سے نہیں بلکہ کرپشن سے ہے۔ وہ اپنی یقینی کامیابی کو محسوس کر رہا ہے۔ جب ایک دکاندار یا پھول فروش اس کو بتاتا ہے کہ اس کے گاہکوں کی غالب اکثریت عام آدمی پارٹی کو ووٹ ڈالنے جا رہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لوگ جانتے ہیں کہ کانگریس اور بی جے پی دونوں کرپٹ پارٹیاں ہیں۔ اب ''عام آدمی پارٹی'' کی شکل میں ان کے پاس ایک آپشن ہے کہ وہ دیانتدار امیدواروں کو ووٹ دیں۔ اس لیے 4 دسمبر کو کچھ غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اکتوبر 2013ء میں ہونے والے پول سروے میں اس کی پارٹی کو کانگریس پر سبقت حاصل ہوئی ہے اور اس میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔

بھارت میں ''عام آدمی پارٹی'' کے بہت سے مخالفین بھی موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ کیجریوال دونوں بڑی پارٹیوں کا مشترکہ دشمن ہے۔ شروع میں اس کے مخالفین اس پر ہنستے اور مذاق اڑاتے تھے۔ جیسا کہ بھارتی میگزین ''انڈیا ٹوڈے'' میں ایس پرسنا راجن نے کیجریوال کو ایک مزاحیہ جادوگر قرار دیا ہے جو جھاڑو (پارٹی نشان) کے زور پر طلسماتی انقلاب برپا کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ چونکہ متوسط طبقہ اور نچلا طبقہ کسی معجزے کے منتظر رہتے ہیں، اس لیے جھاڑو والا جادوگر ان کے تصور سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ملک کو پیچھے کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن ایسے تبصروں کے باوجود کیجریوال کو اپنی توقع سے بہت پہلے ایک مقبول سیاسی لیڈر کا مقام حاصل ہو گیا ہے اور اسے دہلی کے نئے وزیراعلیٰ کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس مرتبہ کانگریس اور بی جے پی کا رشوت کے ذریعے غریبوں کے ووٹ خریدنے کا حربہ بھی نہیں چلے گا کیونکہ غریب لوگ اس کو کہہ رہے ہیں کہ وہ پیسے تو دونوں پارٹیوں سے لیں گے، لیکن ٹھپہ ''عام آدمی پارٹی'' پر لگائیں گے۔ ''عام آدمی پارٹی'' کے رضاکاروں کے گھر گھر رابطوں اور کیجریوال کی اسٹریٹ کارنر میٹنگز سے فضا بالکل تبدیل ہو چکی

ہے۔ پارٹی پالیسی کے مطابق دہلی کے ستر انتخابی حلقوں میں ہر ایک کا الگ منشور تیار کیا جا رہا ہے۔ وہاں کے رہائشی ووٹرز کے مسائل اور مطالبات نوٹ کیے جا رہے ہیں تا کہ ہر حلقے کا منشور وہاں کے عوام کی مخصوص ضروریات اور مسائل کے مطابق ترتیب دیا جائے اور حکومت بنانے کی صورت میں اس پر عمل کیا جا سکے۔ یہ رابطہ عوام مہم ہر حلقے میں جاری ہے اور اس کے بہت حوصلہ افزا نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

کیجریوال کے اعتماد میں اضافے کا باعث پارٹی عہدیدار، کارکن اور رضا کار بن رہے ہیں جو اپنے کاروبار اور ملازمتیں چھوڑ کر پارٹی کی خدمت کر رہے ہیں اور انتخابی مہم چلا رہے ہیں۔ اس کے میڈیا منیجر 32 سالہ بیبھاو کمار ایسے ہی لوگوں میں شامل ہیں۔ اس نے این ڈی ٹی وی چینل کے ساتھ اپنی ملازمت کو چھوڑ دیا، اسی طرح شاکر بستی میں انتخابی مہم کے منیجر 27 سالہ ابھیشک بنتھیا نے کمپیوٹر کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی جب مالک نے دہلی کی انتخابی مہم میں حصہ لینے کے لیے چھٹی دینے سے انکار کیا۔ 48 سالہ اشوک یادیو پارٹی کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ وہ فخر سے بتاتا ہے کہ وہ پارٹی کی کیپ پہننے والا سب سے پہلا کارکن تھا۔ کیجریوال کہتا ہے کہ لوگ پارٹی میں اس لیے نہیں آ رہے ہیں کہ وہ اس کو پسند کرتے ہیں بلکہ وہ اپنے وطن سے کرپشن کی صفائی کا موقع ملنے پر آ رہے ہیں۔ لوگ اس پارٹی میں اس لیے بھی شامل ہو رہے ہیں کیونکہ یہ دونوں بڑی پارٹیوں کی دولت اور غنڈہ گردی کی سیاست کی مخالفت کر رہی ہے۔

کیجریوال سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اگر آپ کی پارٹی ہار گئی، تو آپ کیا کریں گے، تو اس نے جواب

اختصاریے

☆ افراد سے توقعات ہمیشہ گلے شکووں کو جنم دیتی ہیں۔
☆ دنیا میں آنے والا ہر وجود اپنی الگ قسمت اور مقدر رکھتا ہے۔
☆ میری ہر ضرورت کو میرا رب مجھ سے زیادہ بہتر جانتا اور سمجھتا ہے۔
☆ اللہ سے قبولیت اور قدر دانی کی اُمید اور آس ہی انسانوں سے حسن معاملہ کے عمل کو استقامت بخش سکتی ہے۔
☆ بدگمانی دراصل دل سے کسی کی غیبت کرنے کا عمل ہے۔
☆ رشتہ داروں سے احسان شناسی اور شکریہ کا طلبگار رہنا، ان سے احسان نہیں کرسکتا۔ رشتہ دار نیکی اور احسان کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔
☆ جہاں کسی کی محبت، اخلاص اور اعتماد پر شک ہو وہاں مشورہ لینا اور دینا قطعاً بے کار ہے۔
☆ کبھی کبھار ملنے والے لوگوں کے عیبوں اور کمزوریوں سے درگزر کرنا اور قریب رہنے اور بار بار ملنے والوں کو مکر اور عیب سے بچانے کی فکر کرنا شیوہ مسلمانی ہے۔
☆ دنیا میں ملنے والا ہر موقع، نعمت، سہولت اور آسانی امتحان ہے۔ اپنی مرضی اور موڈ کی تسخیر کرنا بہت مشکل کام ہے۔
☆ دنیا میں ملنے والی نعمتیں اور صلاحیتیں، انہی کے بارے میں دراصل جواب دہی ہونے والی ہے۔
☆ ادب کی ساری خوب صورتی، حسن رنگینی اور دلکشی فطرت کے حسن سے ماخوذ ہے۔
☆ موت کائنات کی سب سے بڑی اٹل حقیقت ہے۔
☆ جان و مال کے لیے، لیے گئے قرض کی ادائی فرض ہے۔ قرض اور فرض کی ادائی سے گریز یا تاخیر بد نیتی ہے۔
☆ جذبہ بڑائی کی شدت کسی کی شراکت کو مشکل بنا دیتی ہے۔
☆ جذبات کے ریموٹ کو کنٹرول کرنے کے لیے ایمان و اخلاق کے پٹرول کی ہمہ وقت ضرورت ہوتی ہے۔

(عاصمہ غنی)

دیا کہ اگر وہ حکومت نہ بنا سکے، تو وہ اپوزیشن میں بیٹھیں گے کیونکہ کانگریس یا بی جے پی کی مخلوط حکومت کا اتحادی بننے کا مطلب ہوگا اپنے ووٹر سے دھوکا اور وہ یہ کبھی نہیں کریں گے۔

دنیا بھر سے اور پورے بھارت سے جو ہزاروں رضا کار ''عام آدمی پارٹی'' کی انتخابی مہم میں حصہ لینے کے لیے دہلی آ رہے ہیں ان کو رہائش مہیا کرنا پارٹی کے لیے ایک بڑا مسئلہ تھا۔ چنانچہ کیجریوال نے اپنے کارکنوں سے اپیل کی کہ ان رضا کاروں کو اپنے گھروں میں ٹھہرائیں۔ مشرقی دہلی میں شاہدرہ کے قریب کینا گاؤں میں 28 سالہ امرناتھ رائے اپنے چھوٹے سے گھر میں روزانہ نصف درجن رضا کاروں کو قیام کی سہولت فراہم کرتا ہے اور خود بھی صبح سے شام تک پارٹی رابطہ مہم کے لیے گھر گھر جاتا ہے۔ رائے کہتا ہے ''میں مختلف پارٹیوں کے امیدواروں کو ووٹ دیتا رہا ہوں، لیکن میں جانتا ہوں کہ سیاسی جماعتیں عوام کو دھوکا دیتی ہیں۔ اب اس نظام کو تبدیل کرنے کا ایک موقع ہاتھ آیا ہے۔ تبدیلی کا یہی وقت ہے ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔'' 58 سالہ گربخش سنگھ فیروز شاہ کوٹلہ اسٹیڈیم کے عقب میں رہتا ہے۔ اس نے 30 رضا کاروں کے قیام کے لیے بیسمنٹ کو تیار کر دیا ہے۔ وہ پراپرٹی کے کاروبار سے منسلک ہے اور ملک کے نظام میں تبدیلی کے لیے اس پارٹی کی حمایت کرتا ہے۔ کیونکہ پرانی سیاسی پارٹیوں کوئی تبدیلی لانے یا کرپشن کو ختم کرنے کی اہل نہیں۔ رضا کاروں میں 26 سالہ چیمنتھ پوتھولا منیاپولس میں بینک کی ملازمت چھوڑ کر اپنے ملک آیا ہے تا کہ ملکی نظام میں تبدیلی لانے میں مدد کر سکے۔ 77 سالہ پروفیسر جے ناتھ مسرا سب کچھ لندن میں چھوڑ کر دہلی آیا ہے اور اپنے ساتھ برطانیہ میں رہنے والے پارٹی رضا کاروں کی طرف سے 30 لاکھ روپے کا عطیہ بھی لایا۔ وہ سمجھتا ہے کہ 66 سال بعد ملک کے سیاسی نظام کو تبدیل کرنے کا یہ نادر موقع اب آیا ہے۔

''عام آدمی پارٹی'' کے حق میں بہت سے عوامل کام کر رہے ہیں۔ بھارتی میڈیا نے پارٹی اور اس کے پروگرام کو کافی کوریج دی ہے جس سے اب ہر گلی، محلے، دکان اور ڈرائنگ روم میں پارٹی کا ذکر ہو رہا ہے۔ پارٹی کے رضا کار سوشل میڈیا پر بھی کافی فعال ہیں۔ مجموعی طور پر پارٹی کی انتخابی مہم میں جدت طرازی اور عوامیت پائی جاتی ہے اور اس وقت یہ کانگریس اور بی جے پی دونوں کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ پارٹی کی جو چیز نوجوانوں کو متاثر کر رہی ہے وہ اس کا روپے پیسے اور طاقت کے استعمال سے اجتناب ہے جبکہ دوسری پارٹیاں کھلے عام اس میں ملوث پائی جاتی ہیں۔ بھارت کے عوام بجلی اور پانی کے بھاری بلوں، مہنگائی اور نااہل حکومت سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔

''عام آدمی پارٹی'' کی قیادت دیانت داری کی شہرت رکھتی ہے، حقائق کا ادراک رکھتی ہے اور متوسط شہری طبقے میں خصوصاً ہر دلعزیز ہے۔ ان خصوصیات کے ساتھ اس پارٹی میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں۔ مثلاً اس کو سیاست اور حکومت کا کوئی تجربہ نہیں۔ اس پارٹی کے ووٹرز کا تعلق کسی مخصوص ذات، برادری، علاقائی یا نسلی گروہ سے نہیں۔ اس لیے یہ مستحکم ووٹ بینک سے محروم ہے۔ مزید برآں اس کے پاس مضبوط اور باثر امیدواروں کی کمی ہے۔ ایک طرح سے یہ ون مین شو لگتا ہے جس میں کیجریوال ہی سب کچھ ہے۔

(ماخذات: تہلکہ۔ آؤٹ لُک۔ انڈیا ٹوڈے)

TENDER NOTICE

Sealed item rates/percentage rates tenders based on MRS 2nd Annual (1 August 2013 to 31 January 2014)) of District Nankana Sahib are invited from the approved Government Contractors of HUD&PHE Department who have got their names enlisted/renewed for the calendar year 2013. The tenders documents will be issued by the Divisional Head Clerk of this office during the office hours on production of earnest money in the shape of the deposit at call from any scheduled Bank in the name of Executive Engineer PHE Division Nankana Sahib and written request accompanied with attested copies of enlistment/renewal letter, renewal fee deposit receipt, license of Pakistan Engineering Council for the calendar year 2013, Contractors/Firms authority letter, NIC of Contractors/Firms managing, partner partnership deed, registered power of attorneys or sole proprietor ship certificate and cash payment of non refundable tender fee as admissible under the rules. All the interested contractors/firms are required to bring with them, the original enlistment/renewal letter of HUD &PHE Department Proof of deposit of enlistment /renewal fee, partnership deed/sole proprietor ship are power of attorneys duly registered by the Sub Registrar and PEC license for the calendar year 2013 for verification, failing which the tender documents will not be issued.

The tender shall be issued up to **07.11.2013** during the office hours and will be received /opened in the office of the undersigned on **08.11.2013** at 2:00 P.M in the presence of in tendering contractors/firms are their authorized representative who like to be present. The conditional tenders / telegraphic tenders/tenders received by post will not be entertained. The undersigned reserves the right to reject any or all the tenders without assigning any reason thereof.

As per Government of the Punjab Finance Department Notification No. Ro (tech) FDI -2/83 (V) (P) dated 06 04 2005, in case the total tendered amount is lesser than 5% of approved estimate (DNIT) amount, the lowest bidder will have to deposit an additional performance security from any scheduled Bank equal to the tendered amount below the estimated cost within five days of issuance of notice within expiry period of the old, whichever is earlier. Failing which the earnest money deposited by the bidder will be forfeited and the tender will be re-invited

Sr	Name of Work	Estimated Cost (Rupees in Million)	Earnest Money (In Rupees)	Time Limit	T.S No & Date
01	Construction of Drain /PCC /Nullah and RCC slabs on Drains at Muhallah Jeeda Bucheki, Nankana Sahib	3.920	Rs 78400/-	6 Months	E-E No.85/DB dated 08-10-2013
02	Construction of Drain /PCC /Nullah and RCC slabs on Drains at Muhallah Bawry Uncha Bazar Saen Masjid Kot Ahmad Abad, Dhary Shah Wali Gali, Bucheki, Nankana Sahib	3.693	Rs 73900/-	4 Months	E.E No. 88 /DB dated 08-10- 2013

IPL-10469

Executive Engineer
Public Health Engg : Division
Nankana Sahib.

غزل

اک درد سب کے درد کا مظہر لگا مجھے
دریا سمندروں کا شناور لگے مجھے

یہ اور بات میں نے کھنگالا انھیں بہت
ان پانیوں سے ڈر بھی برابر لگا مجھے

مجھ کو خلا کے پار سے آتی ہے اک صدا
اے رَہروِ خیال! ذرا پر لگا مجھے

زخمی افقِ دُھوئیں کی کمند اونگھتے درخت
منظر کی زو میں آکے بڑا ڈر لگا مجھے

وہ دن کہاں کہ اُس کو سرِ شام دیکھ لُوں
پچھلے پہر کا چاند مقدر لگا مجھے

اعجازِ درد تو کوئی ترتیب دے اِسے
شیرازۂ حروف تو اَبتر لگا مجھے

آئینے پر لگایا تو سجادؔ بار ہا
نقطہ بھی روشنی کا سمندر لگا مجھے

(سجاد بابر، پشاور)

مصر نے دنیا کو وکٹری کا نیا نشان دیا ہے

اختر عباس

- حمدی کے کانوں سے دھواں کیوں نکلا؟
- مہدی عاکف نے حسن الہذیبی کو کیسے بچایا؟
- قطر ایئرویز پر 300 انڈین فلموں کی حیرت انگیز دستیابی

مصر کے لوگ کثرت سے دفینوں کی تلاش کی خواہش اور خبط میں مبتلا رہے ہیں۔ صدیوں سے ان کے سر پر کیمیا بنانے کا سودا سوار رہا ہے۔ کرسٹل ایوارڈ یافتہ مشہور برازیل کے ناول نگار پائیلو کوئیلو کا ناول ''الکیمسٹ'' بھی انہی مصری خزانوں کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ دفینوں کی تلاش اور ان کے جنون کے بارے میں ممتاز مؤرخ اور تاریخ دان ابن خلدون (محمد بن محمد بن خلدون 732-808) کہتا ہے کہ فراعنہ مصر کی تمام دولت اور رقبے دریائے نیل کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ جب اس کا پانی ہٹ جائے گا تو ان طلسمی دفینوں کے راستے خود بخود کھل جائیں گے۔ یہ لوگ اس قسم کے کاموں کے لیے ہمیشہ کسی کامل درویش کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مغرب کے دانش وروں سے بھی اس طلسم کشائی کی تدبیریں پوچھتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ مصری خزانوں کے بارے میں لمبی چوڑی داستانوں کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ مصر میں ہزاروں سال قبطی بادشاہ حکمران رہے۔

مصری خزانوں کا اصل پسِ منظر

ان کے ہاں دستور تھا کہ بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کا تمام سامان، نقدی و جواہرات اور سونا چاندی سب کچھ اس کے ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا۔ قبطیوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد جب اہل فارس اور یونان اس ملک پر قابض ہوئے، تو وہ سالہا سال ان مقبروں کو کھدوا کر ان مدفون دفینوں کو نکالتے رہے۔

اس طرح قدیم مصر کی زیرِ زمین دولت زمین پر آکر فاتح سلاطین کے خزانوں کی زینت بنتی رہی۔ اب بھی یہاں مغرب سے آکر ان دفینوں کی تلاش میں پھرنے والے سرگرداں اور پریشان رہتے ہیں مگر ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ حد تو یہ ہے کہ ''بالی وڈ کی خزانے کی تلاش'' قسم کے فلموں کے پس منظر اور فلم بندی کے لیے بھی مصر ہی پسندیدہ جگہ ہے۔ ''ممی'' اور ممی ریٹرنز سیریز تو آپ بھی نہ بھولے ہوں گے۔

دریائے نیل کا حوالہ صدیوں سے اَدب کا بھی اہم اور تاریخی حوالہ ہے جو خلق خدا کو خوب بھاتا ہے۔ جہاز قاہرہ ایئرپورٹ سے اُڑا تو یہی دریائے نیل کچھ دور تک ہمارے ساتھ رہا۔ پھر میں نے آنکھیں موند لیں اور بہت سال پہلے جا پہنچا۔ تب نیل لوگوں کو بہت ستاتا تھا مگر پھر نیل نے ایک بندہ خدا عمر بن خطابؓ کے حکم پر اپنی روش بدل کر مخلوق خدا کو ستانا چھوڑ دیا تھا یہ عمروؓ بن العاص کا مصر کی سربراہی اور حکومت کا دور تھا جب انھوں نے دریائے نیل کی طغیانی سے ستائے لوگوں کو اپنی جوان بیٹیوں کو سال بہ سال ایک رسم کے تحت نیل کی بھینٹ چڑھاتے سنا۔ انھوں نے حکماً رسم کو روک کر مؤخر کر دیا اور اپنے خلیفہ کو خط لکھا کہ یہ ماجرا ہے، کیا حکم ہے۔

دریائے نیل پھر اپنے جوبن پر ہے اور مصری لوگوں کے بقول ایک جوان دوشیزہ کی قربانی مانگ رہا ہے۔ گزشتہ سال بُشائر نام کی لڑکی کی قربانی کی گئی تھی۔ اسے یقین دلایا تھا یہ موت تمھیں ہر دکھ درد سے آزاد کر دے گی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بشائر کی خوش بختی ہے کہ اسے قربانی کے لیے چنا گیا۔ لوگ دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ ہر طرف دف اور تاشے بج رہے تھے۔ طبل پورے زور سے بجایا جا رہا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ لڑکی کے پانی میں ڈوبتے ہی دریا کی ناراضی ختم ہو جائے گی۔ طغیانی تھم جائے گی۔ دیوانگی رخصت

ہوگی تو دریا پھر سکون سے بہنے لگے گا۔

پُل کا عین درمیانی حصہ تھا جہاں بشائر کو طغیانی پہ آمادہ دریا کی لہروں کے حوالے کیا گیا اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ دریا اگلی صبح سے شانت ہو چکا تھا کیا قربانی اسے بھا گئی تھی اور نیل کا غصہ جاتا رہا تھا۔

آج کا مصر لگ بھگ تین ہزار لڑکوں، بزرگوں اور دوشیزاؤں کی قربانی لینے کے بعد بھی شانت نہیں ہوا۔اس کے حکمرانوں کی پیاس باقی ہے اور آس پاس کوئی عمرؓ بن خطاب بھی نہیں۔ کہنے کو تو دریائے نیل چار ہزار میل سے زیادہ طول رکھنے والا دنیا کا واحد اور منفرد دریا ہے جو تمام افریقی دریاؤں کا جدِ امجد کہلاتا ہے۔ تنزانیہ، برونڈی، کینیا، کانگو، یوگنڈا، سوڈان اور ایتھوپیا کی سرزمینوں کو فیض یاب کرتا مصر میں داخل ہوتا ہے تو اس کے پانیوں کا چہرہ تھکاوٹ سے بدل کر نام تک پر اثر انداز ہونے لگتا ہے۔

افریقا میں یہ نیل الازرق کہلاتے کہلاتے مصر ہی آ کر نیل الاسود اور کہیں نیل الاصفر کہلانے لگتا ہے۔

مصر افریقا کا دل ہی نہیں چہرہ بھی ہے۔ دھڑکتا ہے اور رخِ روشن کی طرح چمکنے کا آرزومند رہتا ہے۔ صدیوں پہلے یونانی شاعر ہومر کو اس پر شدید پیار آیا تو اس نے ایک ایسی نظم کہی جس میں دریائے نیل مذکر ٹھہرا اور مصری سرزمین کو مونث بنا دیا۔

وکٹری کا نیا نشان

ہوٹل نووا ٹیل سے نکلے تو دریائے نیل عبور کرتے ہوئے ایک گہری نگاہ ڈالی، نہیں جانتا کہ دوبارہ کب آنا مقدر ہوگا، اس پل سے کچھ دور وہ مشہور اور تاریخی میدان ''رابعہ العدویہ'' ہے جس نے دنیا میں کئی تصورات بدل کر رکھ دیے ہیں۔ کبھی وکٹری کا نشان ''وی'' (V) ہوتا تھا۔ اب رابعہ العدویہ ہے، جس کے چاروں طرف سے سڑکیں باہم ملتی ہیں اور اخوان کے احتجاجی دھرنے کے دوران اس کا رقبہ کئی کلومیٹر تک پھیل گیا تھا۔ چار انگلیوں کے نشان والے نئے (V) کو دنیا کی تمام اسلامی تحریکوں کے جذباتی کارکنان نے اپنا لیا ہے۔ فیس بک پہ تو ہر چوتھا اکاؤنٹ اسی نام والے لوگو سے سجا ہوا ہے۔ اس میدان میں دنیا کی سب سے بڑی افطاری کا ورلڈ ریکارڈ قائم ہوا۔ اس میدان میں اخوان کے مرشد عام ڈاکٹر محمد البدیع پہلی بار عوامی سطح پر نمودار ہوئے اور 27 جون سے بیٹھے لاکھوں لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ مصر کے لوگوں کی گنتی پاکستانی جلسے جلوسوں کی گنتی سے بہت مختلف اور بہتر ہے۔ یہاں تو 3 ہزار لوگ جمع ہو جائیں تو دعویٰ 30 ہزار سے کم کا نہیں ہوتا اور اگر 30 ہزار جمع ہو جائیں تو سمجھیں اب 3 لاکھ سے کم پہ بات ہی نہیں ہوگی۔

حمدی ابراہیم کے کانوں سے دھواں

خوش مزاجی اور توانائی سے بھرا ہوا 20 سالہ حمدی ابراہیم اس الوداعی سفر میں ایئر پورٹ تک ہمارے ہم رکاب تھا۔ ایئر پورٹ سے کافی آگے واقع رباب سٹی ہمارے مختصر قیام کے لیے ہماری منزل تھی۔ جہاں پاکستان سے تعلق رکھنے والے کے ای میڈیکل کالج کے پرانے اُستاد ڈاکٹر طاہر میر ایک پھولوں بھرے گھر کے مکین تھے۔ ایک تو رباب سٹی پھر فلیٹ کے بجائے ہماری طرح ایک کنال کا گھر اچھا لگا۔ ڈاکٹر صاحب اپنا خانساماں پاکستان سے ساتھ لائے تھے۔ وہ کچھ دیر تو ہمیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ قاہرہ میں اکٹھے چار پاکستانی، پھر وہ ڈاکٹر عمران

صحاف کی طرف بڑھا اور بڑی اپنائیت سے سلام کیا۔

ڈاکٹر صاحب بھی کے ای میں اُستاد ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ وہاں سالوں ملازم رہا ہے اور اس نے ڈاکٹر صاحب کے وارڈ میں بھی کام کیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر میر اسے اپنے ساتھ قاہرہ لے آئے تھے، تب سے وہ یہیں خدمت کر رہا ہے۔ ڈاکٹر طاہر ڈبلیو ایچ او کے پولیو پراجیکٹ کے انچارج ہیں۔ کھانے سے پہلے ان سے ڈاکٹر شکیل آفریدی پر کافی گفتگو ہوئی۔ ان کا کہنا تھا۔ اس ایک آدمی نے پولیو ختم کرنے کی مہم کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔

WHO نے تردیدی، وضاحتی بیان بھی دیے کہ ہمارا اس پورے معاملے سے کوئی تعلق نہیں مگر Unicef کے ایک نمائندے اور ڈاکٹر شکیل کی پولیو ٹیم کی آڑ لے کر اسامہ کی تلاش نے عوام کے دلوں میں اعتماد ختم کر دیا۔ یہ بحال ہوتے کافی وقت لے گا۔ اس دوران بچوں اور والدین کا بہت نقصان ہوگا۔

ہمارا خیال تھا کہ صرف بچوں کا نقصان ہی نہیں ہوگا، جس قدر پولیو ویکسین پلانے والے کارکنان مریں گے وہ بھی ڈاکٹر آفریدی کے جرم کا شاخسانہ ہی کہلائے گا۔ عام لوگ بعض اوقات پوچھتے ہیں کہ پولیو ورکرز کو کیوں مارا جاتا ہے تو اس نفرت اور غصے کا پورا پس منظر ہے کہ اس نے پولیو مہم کی جعلی آڑ لے کر امریکی سازش کو مکمل کرایا۔

طاہر میر سے ہم نے یہ بھی پوچھا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ پولیو قطروں کی آڑ میں مسلمانوں کی نئی نسل میں اولاد کی پیداواری صلاحیت ختم کرنے کی سازش ہے۔ اس پر آپ کیا کہتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا۔ میں سالوں سے اس شعبے سے وابستہ ہوں۔ یہاں اس طرح کا دھوکا نہیں ہوتا، صحت کے لیے اچھی سوچ کے ساتھ پالیسی بنائی اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

حمدی ابراہیم کے آنسو

خانساماں نے کھانا کیا لگایا ہمیں حیرت زدہ ہی کر دیا۔ حلیم، پلاؤ، بریانی، ساگ، قورمہ سبھی نعمتیں میسر تھیں۔ ہمارے دونوں مصری ساتھیوں حمدی ابراہیم اور عبدالرحمٰن الردعی بھی شریک طعام تھے۔ ڈرائیور کو بھی بلا لیا گیا۔ کھانا بے حد لذیذ تھا مگر اچانک میری نظر پڑی تو حمدی ابراہیم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ وجہ پوچھی تو اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا ''خلاص'' میں نے پہلی بار پاکستانی کھانا کھایا ہے۔ اس لیے مرچیں برداشت نہیں ہو رہیں۔ اس نے گھبرا کر ڈونگے سے ہی کٹا ہوا پھل کھانا شروع کر دیا۔ اس کی بے تابی اور گھبراہٹ سب کو متوجہ کر گئی۔ ہم تو اس لیے بھی خوش تھے کہ دو ہفتوں سے مصریوں کے پھیکے کھانے کھا کر اُکتائے (اَکّے) ہوئے تھے۔ (صرف فلسطین میں گزرے دنوں کو استثنیٰ حاصل ہے۔ وہاں کھانا مزے دار اور ہماری طرح مرچوں والا تھا)

میری توجہ حمدی پر تھی جس کے کانوں سے اب دھواں نکلنا کم ہو رہا تھا۔ آنسو تھم گئے تھے اور وہ توبہ توبہ کر رہا تھا۔ عبدالرحمٰن الردعی نے اسے سمجھایا کہ پاکستان میں قیام کے دوران وہ تو پاکستانی کھانوں کا عادی ہو گیا تھا۔ کوئی بات نہیں نیا تجربہ سہی۔

مجھے پنجابی کی ایک خوب صورت نظم یاد آئی۔

تیری چوڑے والی بانہہ پھڑ کے
ٹھوڈی تو مکھ اُتاں کر کے
متھے تو ڈال پشاں کر کے

جے پُچھ ای لیا اے تیرا ناں کی اے
تے گُڑیے تاں کی اے

تان یہاں ٹوٹی کہ حمدی ابراہیم نے زیادہ مرچوں والا ’’کھانا کھا ای لیا اے تے تاں کی اے۔‘‘ یعنی پھر کیا ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر سے روانگی سے پہلے ڈاکٹر عمران صحاف نے خانساماں کو بلایا اور حال چال پوچھتے ہوئے چپکے سے ایک خطیر رقم اس کے سُپرد کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کو ایسا کرتے ہوئے میں نے فلسطین میں بھی دیکھا۔ وہ کئی ہزار ڈالر صرف اس لیے ساتھ لائے تھے تاکہ چیرٹی کر سکیں۔

میں نے دل ہی دل میں ان کے لیے بھرپور دعا کی کہ اللہ نے انھیں ہنر ہی اچھا نہیں دیا۔ دل اور ہاتھ بھی کھُلا دیا ہے۔

ڈاکٹر میر صاحب سے اجازت لے کر رخصت ہوئے، تو قاہرہ ائیر پورٹ پہنچنے میں صرف دو گھنٹے باقی تھے۔ جہاں سے ہمیں قطر کے لیے پرواز کرنا تھا۔ قطر میں ہمارے میزبان خالد صاحب مسلسل رابطے میں تھے۔ انھیں میرا نمبر الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کے جنرل سیکرٹری محمد عبدالشکور صاحب نے دیا تھا۔

حمدی چونکہ نئی نسل کا نمایندہ تھا اور سب سے نوجوان بھی تو میں نے پورا سفر اس سے گفتگو جاری رکھی، وہ التحریر چوک میں بیٹھنے والے ان ابتدائی نوجوانوں میں تھا جنھوں نے حسنی مبارک کے اقتدار کا خاتمہ کرنے اور عرب بہار لانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔

میں نے حمدی کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا ایمانداری سے بتاؤ شادی کس سے کرو گے اور کیسے کرو گے؟

اس نے پوچھا کیا مطلب؟ میں نے وضاحت کی کہ ہمارے ان بزرگوں کا خیال ہے کہ مصری موٹی اور بھاری جسم کی خواتین کو پسند کرتے ہیں تم بھی کسی وزنی دوشیزہ کو پسند کرو گے۔

’’وہ بولا نہیں نہیں شادی تو کسی اسمارٹ لڑکی سے کروں گا اور وہ بھی اخوان لڑکی سے۔ میری پسند دبلی پتلی اسلامی لڑکی ہوگی جو اسلامی اصولوں کی عزت اور حفاظت کرے گی۔ ہماری ایک بڑی اسلامی فیملی (اخوان) کو مضبوط کرے گی۔ شادی سے پہلے سبھی لڑکیاں سمارٹ ہوتی ہیں۔ قاہرہ کی لڑکیاں Pretty ہوتی ہیں۔ ویسے خوب صورتی منصورہ شہر میں ختم ہے وہاں فرنچ خون کی آمیزش ہے۔‘‘

حمدی ابراہیم سے میں نے پوچھا تم 80 دن التحریر چوک میں رہے کیا گھر والے پریشان نہیں ہوئے؟ بولا: میرے والد اور بھائی بھی وہیں تھے۔ والدہ اور بہن بھی اخوان میں ہیں۔ اس لیے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ 18 دنوں میں پولیس نے مریم بنونانہ چوک میں قریباً 800 لوگوں کی جان لی۔ زیادہ 28 جنوری کو مارے گئے۔ لیکن نوجوان آخر تک قائم رہے۔ ماحول ہی ایسا تھا۔

مہدی عاکف نے کیسے حسن الہذیبی کو بچایا

ائیر پورٹ جاتے ہوئے الردعی نے ایک دلچسپ تاریخی واقعہ بتایا۔ اخوان کے دوسرے مرشد عام جو حسن البناء کی شہادت کے بعد بنے تھے سب سے مشکل وقت کے مرشد مانے جاتے ہیں۔ وہ حج سے واپس آرہے تھے حکومت وقت نے ان پر حملے کا منصوبہ بنایا

کہ جیسے حسن البناء کو شہید کیا گیا اسی طرح ان کو منظر سے ہٹا کر اخوان کو خائف اور بالآخر ختم کر دیا جائے۔ کسی ذریعے سے یہ خبر مہدی عاکف تک پہنچی۔ یہ بہت ہی دبنگ اور بہادر اخوان راہنما ہیں۔ 90 کی دہائی میں اخوان کے مرشد عام بھی رہے۔ انھوں نے 40 کاروں کا ایک کارواں ترتیب دیا اور ائیر پورٹ پہنچ کر وہاں کا سارا انظام اس تیزی سے سنبھال لیا کہ کسی مزاحمت کی نوبت ہی نہ پہنچ سکی۔ مرشد عام کو بحفاظت گاڑی میں سوار کرا کے ائیر پورٹ کی حدود سے نکال لے گئے۔

قاہرہ ائیر پورٹ پہ

ائیر پورٹ کی بلڈنگ میں داخل ہونے سے قبل الردعی، حمدی اور ڈرائیور بہت محبت سے ملے۔ ان کے ساتھ بہت اچھا اور عمدہ وقت گزرا۔ صدر مرسی کی گرفتاری کے بعد ہونے والے احتجاجی ہنگاموں کے بعد کئی بار فون پر ان لوگوں سے رابطے کی کوشش کی مگر افسوس کسی کا فون بھی نہیں ملا۔ اول تو گھنٹی نہیں جاتی اور کسی کے ہاں بیل بجی بھی تو اٹھایا کسی نے نہیں۔ خدا ان سب کو سلامت رکھے۔ اخوان کے تین ہزار سے زائد نوجوانوں کو خون میں نہلا دیا گیا۔ احتجاج دب گیا ہے۔ کبھی کبھی کہیں کہیں کوئی مظاہرہ اب بھی ہو جاتا ہے۔ بظاہر اس وقت جنرل سیسی اور صدر منصور محمد وی کی جابرانہ حکمرانی نے تمام اہم زندہ اخوانوں سے جیلوں کو بھر دیا ہے۔ سیاسی قیادت کی عام طور پر دو تین سطحیں ہی ہوتی ہیں۔ اسلامی تحریکوں میں کارکن جتنے بھی ہوں۔ قیادت کی غیر موجودگی میں پالیسی، حکمت عملی، ردعمل اور اثرات سبھی چیزیں قابل غور اور قابل توجہ ہوتی ہیں۔ ذہنی قیادت منظر پر نہیں ہے۔ احتجاجی تحریک ان کے باہر رہنے تک بے حد مؤثر تھی ممکن ہے کچھ عرصے بعد تنقیدی اور تجریاتی جائزے شروع ہو جائیں کہ کیا اخوان کو اسی طرح اپنا ردعمل دینا چاہیے تھا یا حکمت عملی اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے؟ جذباتی راہنماؤں، کارکنوں کو عام طور پر حکومتوں سے ٹکرا جانے کی پالیسی بڑی بھاتی ہے۔

اس کے بعد کے اثرات دیکھنے کی بصیرت انہی قائدین کے پاس ہوتی ہے جو جذبات کے جوار بھاٹے سے نکل کر رائے بناتے ہیں۔ مصر سے دور بیٹھ کر کہنے میں زور نہیں لگتا کہ صدر مرسی کے خلاف کامیاب بغاوت کے بعد اگلے الیکشن کا ہدف بنایا جاتا تو نیا صدر پھر بھی اخوان کا آجاتا...... اب یہ منزل بہت دور نظر آرہی ہے۔ عبوری حکومت کے خلاف بھرپور احتجاج کے بعد کوئی درمیانی راستہ نکالا جا سکتا تھا۔ ’’لوگ کیا کہیں گے؟‘‘ قسم کے جملے اور خدشے اگر حکمت عملی کی بنیاد ہوں تو مسائل اور طرح کے ہوتے ہیں۔ سیاسی قیادت کو بہر حال سیاسی فریم ورک کے اندر رہ کر ہی راستہ تلاش کرنا اور آگے بڑھنا ہوتا ہے..... سخت جان اخوان ہی ہیں جو گزشتہ 70 سالوں میں اپنے اخلاص، تقویٰ، ایثار، تعداد اور مقبولیت کے باوجود شدید سیاسی اور خونی دباؤ اور مظالم برداشت کرتے آرہے ہیں جو شاید کسی اور پارٹی کے بس میں بھی نہ ہوتا۔ بظاہر ایک بار پھر وہ لمبی آزمائش سے دو چار ہو چکے ہیں۔ اس دوران ان کے تعلیمی، سماجی، دعوتی اور سیاسی سارے کام ہی رُکے رہیں گے۔ بے شک مضبوط اور حوصلہ مند لوگ

ہیں مگر اللہ آزمائش لمبی نہ کرے۔

ائیر پورٹ پہنچ کر بورڈنگ کارڈ لیے اور اندر پہنچنے کے مراحل طے کرتے ہی میں ایک ویٹنگ ایریا میں جا کر کرسی پر دراز ہوگیا۔ یہاں بیٹھے مسافروں نے لندن جانا تھا۔ قطر جانے والا ٹرمینل کافی دور تھا اور تھکاوٹ سے پاؤں مَن مَن کے ہو رہے تھے۔ سبھی نے اپنا سامان میرے قریب رکھا اور ائیر پورٹ پر بنے ڈیوٹی فری زون سے شاپنگ کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ میں سکون سے سویا رہا۔ کافی دیر بعد واپس آئے تو لدے پھندے تھے۔ بھاگم بھاگ دوسری منزل پہ واقع اس دروازے تک پہنچے جہاں سے جہاز تک جانا تھا۔

جہاز کافی بڑا تھا اور اِس کی نشستوں کا نظام بہت ہی عمدہ، ہر سیٹ پر الگ ٹی وی مانیٹر اور اسے آپریٹ کرنے کا سسٹم تھا۔ میں نے چلانے کی کافی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ میرے ساتھ ایک نوجوان بیٹھا مسٹر بین دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے ویسے ہی ''دُکھتا'' ہے اس کے ٹیڑھے میڑھے منہ دیکھنے میں مجھے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ فولڈر میں فلموں کے بروشر تھے۔ بہت ہی خوب صورتی سے طبع شدہ میگزین اس میں 300 انڈین فلموں کے نام اور پوسٹر تھے جو دورانِ پرواز دیکھی جاسکتی تھیں۔ یہ سب عربی سب ٹائٹلز کے ساتھ تھیں۔ میرے دل کا بھی وہی حال ہوا جو پڑھ کر آپ کا ہو رہا ہے۔ یہ عمدہ مارکیٹنگ کی Depth کا ایک سادہ سا اظہار ہے۔ ٹی وی چلانے کے لیے ٹامک ٹوئیاں مارتے بالآخر اپنی کہنی کے نیچے کرسی کے بازو کے اندر چھپے ہوئے ریموٹ کنٹرول کو ڈھونڈ لیا اور ٹی وی سکرین آن کر کے ٹانگیں پسار لیں۔ نیند تھی کہ تم ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے بے رُخی نہ برتو۔ اطمینان بخش وقفے کے بعد عمران صاحب نے مجھے متوجہ کیا۔ کھانا آچکا تھا، بہت عمدہ اور خوش ذائقہ، انتخاب بھی اچھا تھا اور پیش کش بھی۔

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ کچھ دیر بعد ایک سٹیورڈ نے ایک میگزین تقسیم کیا۔ عمران صاحب نے اسے ایک دو تصاویر دیکھ کر مصنوعات لانے کو کہا۔ میرے لیے یہ منظرِ حیرت تھا کہ اُڑتے جہاز میں ایک چلتی پھرتی دُکان موجود تھی۔ وہ مطلوبہ زیورات لے آیا۔ اب میں پوری توجہ سے دیکھ اور رسالہ پڑھ رہا تھا۔ زیور کمال درجہ نفیس اور جاذبِ نظر تھے۔ قیمت دیکھی تو ڈالروں میں۔ میری جیب میں پاکستانی روپے تھے۔ اس دوران عمران صاحب اپنی بہو کے لیے ایک سیٹ پسند کر چکے تھے۔ انھیں روپے دے کر ڈالر لیے اور اپنی اہلیہ کے لیے دو سیٹ خرید لیے۔ تحفہ ہمیشہ خوشی دیتا ہے اور سفر سے واپسی پر غیر متوقع طور پر ملے تو زیادہ خوشی دیتا ہے۔ مصر کے دورے کے دوران سچی بات یہ ہے کہ یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ایسی کوئی چیز ساتھ لے جاؤں گا۔ وہاں سوائے فرعون کے مجسموں، اہراموں کے اور کوئی کام کی چیز تھی ہی نہیں۔ اس میں بھلا خواتین کی کیا دلچسپی ہوگی۔ کی رنگ سے لے کر ڈرائنگ روم کے شو پیس تک، قلم سے لے کر کتاب تک، ان کی مارکیٹنگ بھی کمال کی ہے۔ آنے والوں کو اہراموں کی مٹی سے لے کر تصویریں، مانومنٹ ہر چیز ہی بڑے سلیقے اور طریقے سے بیچ دیتے ہیں۔ چاہے گھر جا کر لوگ پچھتاتے رہیں کہ کیا لے آئے ہیں۔

OOO

باتیں نئی تحریریں نئی

اعتبار

کنول ریاض

اپنے لیے سارے راستے بند کرنے والوں کے لیے خصوصی کہانی......

''السلام علیکم......کیسی ہیں آپ......؟''

بھابھی رخشندہ نے کافی گرمجوشی سے حمیدہ بیگم کو سلام کیا، تو کشمش کے دانے صاف کرتی حمیدہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئیں۔ انھیں رخشندہ کے آنے کی ہرگز اُمید نہ تھی ورنہ یوں صحن میں بیٹھ کر یہ کام نہ کرتیں بلکہ اندر باورچی خانے ہی میں سرانجام دے لیتیں جہاں کم از کم رخشندہ کے آنے پر کشمش چھپا تو سکتی تھیں۔ لیکن رخشندہ کے آنے کا پتا بھی تو اس وقت چلا تھا جب وہ سر پہ آموجود ہوئیں۔

''آئے ہائے رخشندہ کیسی بلی کی چال چلتی ہو پتا ہی نہیں چلتا۔''

حمیدہ بیگم نے اندر کی کھولن لہجے میں سمو کر کہا۔

لیکن رخشندہ صاحبہ اس طرف متوجہ ہی کب تھیں اُن کے دھیان کی سوئی تو کشمش میں اٹکی ہوئی تھی۔

''ارے واہ بھابھی کشمش صاف کی جارہی ہے۔'' مٹھی بھر کشمش پھانکتے رخشندہ کا لہجہ حمیدہ بیگم کو تپا گیا۔

''ظاہر ہے کشمش نظر آرہی ہے، تو وہی صاف کر رہی ہوں اب بادام تو صاف کرنے سے رہی۔''

حمیدہ بیگم کی آواز پر رخشندہ نے زور شور سے سر ہلایا۔

''ہاں بھابھی یہ تو ہے......خیر لگتا ہے کوئی موسمی پکوان بنانے کی تیاریوں میں ہیں چلیں جو بھی پکے گا ہمارا حصہ تو ضرور بھیجیں گی ناں آپ۔''

رخشندہ کی بات پہ ایک بار پھر سے حمیدہ بیگم تاؤ کھا گئیں۔

خود تو کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ ایک پلیٹ سالن ہی بھیجوا دیں اور ہمارے ہاں بس نہیں چلتا ورنہ سب کچھ سمیٹ کر چلتی بنیں۔''

حمیدہ بیگم کی بڑ بڑاہٹ رخشندہ صاحبہ کے پلے نہیں پڑی تھی۔ جبھی ایک بار پھر سے ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''کیا کہہ رہی ہیں بھابھی مجھے سنائی نہیں دیا۔''

''کچھ نہیں، میں نے کیا کہنا ہے تم بتاؤ کس لیے تشریف آوری ہوئی ہے۔''

حمیدہ بیگم نے بات پلٹی۔

''ارے ہاں بھابھی وہ میں نے کہنا تھا کہ ذرا پانچ سو روپے تو اُدھار دے دیں۔ کل پرسوں تک واپس کر دوں گی۔''

رخشندہ بیگم نے بالآخر وہ بات کہہ ہی دی جس کے لیے آنے کی زحمت کی تھی۔

''آئے ہائے رخشندہ ابھی پچھلے ہفتے، تو تم مجھ سے ہزار روپے لے کر گئی تھیں۔ پہلے وہ تو واپس کرواؤ الٹا تم نیا ادھار مانگنے آگئیں۔''

حمیدہ بیگم گویا اچھل ہی تو پڑیں۔

''اوہو بھابھی کیسی غیروں والی باتیں کرتی ہیں۔ میں بھلا آپ کے پیسے لے کر بھاگ تھوڑی جاؤں گی وہ تو بس اچانک ضرورت پڑ گئی جیسے ہی فہد کے ابو کو تنخواہ ملی میں آپ کے سارے پیسے واپس کردوں گی۔

رخشندہ بیگم نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

نہیں بھئی ابھی تو میرے پاس نہیں ہیں پیسے بلکہ مجھے خود ضرورت ہے روپوں کی اس لیے براہِ مہربانی میرے پیسے ذرا جلدی چکا دو۔''

حمیدہ بیگم نے بھی ہری جھنڈی دکھائی۔

''توبہ ہے بھابھی آپ نے تو صفاچٹ جواب ہی دے ڈالا خیر پھر یوں کریں کہ وہ جو پرسوں آپ بیڈ شیٹ لائی تھیں وہ دے دیں۔ کل میری نند کی بیٹی اور داماد کی دعوت ہے، تو میں نے سوچا وہ ہی بچھا کر کام چلالوں بعد میں آپ کو اس کے پیسے دے دوں گی۔ ابھی تو دعوت پر بھی کافی خرچا اٹھ جائے گا۔''

رخشندہ بی بی نے فوراً سے نئی فرمائش جڑ دی۔

''نہیں بھئی وہ تو میں بہت دل سے حسن کے کمرے کے لیے لائی تھی اپنے بچے کی چیز تھوڑی اٹھا کے دے دوں گی کسی کو۔''

حمیدہ بیگم نے بدکتے ہوئے جواب دیا۔

''بھابھی دیکھیں ناں اب آپ یوں تو نہ کریں۔ پرایا بچہ اب اتنی دور سے میرے گھر آئے گا، تو اُسے یوں ہی گندے مندے گھر میں بٹھاؤں آخر عزت بھی تو کوئی چیز ہے۔''

رخشندہ بیگم ایک بار پھر سے شروع ہو چکی تھیں اور بالآخر حمیدہ بیگم کو اپنی جان چھڑانے کے لیے وہ بیڈ شیٹ دینا ہی پڑی اور یوں قرض کے ہزار روپوں کے ساتھ اِس ساڑھے آٹھ سو کی بیڈشیٹ کا بھی اضافہ ہوگیا جس کی ادائی کا دور دور تک امکان نہ تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجنے پر حمیدہ بیگم کا چاول صاف کرتا ہاتھ رک گیا اور چاولوں سے بھری پرات سرکاتی وہ دروازہ کھولنے چل پڑیں۔

''السلام علیکم حمیدہ خالہ''

دروازہ کھولنے پر دو گھر چھوڑ احسان اللہ صاحب کی چھوٹی بہو ثنا مسکراتی ہوئی ان کے گلے آ لگی۔

وعلیکم السلام بیٹا.....! کیسی ہو بڑے عرصے بعد چکر لگایا۔''

حمیدہ بیگم نے پُرتپاک انداز میں گلے ملتے پوچھا۔ ثنا اپنے شوہر کے ساتھ دوسرے شہر میں مقیم تھی

اور ہفتہ دو ہفتہ بعد چکر لگا لیتی تھی لیکن اب کی بار مہینا بھر بعد ان کی آمد ہوئی تھی۔

''جی خالہ وہ بس بچوں کے امتحان تھے اس لیے اور پھر مجھے آئے دو روز ہو گئے ہیں مہمانوں کی وجہ سے نکلنا نہیں ہوا اب فراغت میسر آئی، تو سوچا آپ سے مل آؤں۔''

ثنا ان کے ساتھ چلتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ آئی۔ ابھی حمیدہ بیگم ٹھیک سے اس کا حال احوال دریافت بھی نہ کر پائیں تھیں کہ رخشندہ بی بی ٹپک پڑیں اور لگیں اپنے بے تکلفانہ انداز میں ثنا سے باتیں بھگارنے۔

''آپ کو پہلی بار دیکھا ہے.....؟''

ان کے انداز اور خلوص نے ثنا کو بے حد متاثر کیا۔

عرصہ ہوا ہے اس محلے میں منتقل ہوئے۔ حمیدہ بھابھی رشتہ دار ہیں ہماری۔''

حمیدہ بیگم ثنا کی خاطر تواضع کے خیال سے کچن میں گئی ہوئی تھیں اور رخشندہ صاحبہ کے پاس کافی وقت تھا سو جبھی رخشندہ ثنا کو کمپنی دینے لگیں اور دس منٹ کے اس عرصہ میں ثنا کو اچھی طرح سے ازبر ہو گیا تھا کہ رخشندہ صاحبہ کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹی میٹرک میں جبکہ بیٹا آٹھویں کلاس کا طالب علم ہے اور دونوں بہن بھائی حد سے بڑھ کر نخریلے۔ ایسے میں ثنا، رخشندہ آنٹی کی ایک وقت میں تین تین ہانڈیاں پکانے کی ہمت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی جو بچوں کے ساتھ ساتھ ان کے باپ کی پسند کو بھی مدنظر رکھتی تھی اور اس طرح گھر میں سب کو من پسند کھانا مل جاتا تھا۔ حمیدہ بیگم کی واپسی کے بعد بھی رخشندہ بیگم کا موضوع گفتگو ان کی فیملی ہی تھی۔ ثنا کے ساتھ پُرتکلف چائے سے لطف اندوز ہونے کے بعد اب وہ ثنا کے ساتھ ہی جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ ان دونوں کو رخصت کرنے کے بعد چائے کے برتن سمیٹتی حمیدہ بیگم سوچ رہی تھیں کہ ثنا سے اس کے بچوں کا حال احوال تو پوچھ ہی نہیں سکیں۔ خیر اگلی بار سہی، سر جھٹک کر انھوں نے پانی کا نل کھولا اور برتن دھونے میں مصروف ہوگئیں۔

''السلام علیکم فاطمہ خالہ ..... کہیے کیسے مزاج ہیں؟''

حمیدہ بیگم ریڑھی والے سے سبزی خرید رہی تھیں جب پچھلی گلی میں رہنے والی فاطمہ بیگم پر نظر پڑی۔

وعلیکم السلام بیٹا..... اچھا ہوا تم سے ملاقات ہوگی میں تو سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں گھر پر ملو یا نہیں۔''

ان کے سلام کا جواب دیتی فاطمہ ان کے ساتھ ہی اندر آگئیں۔

''آئے حمیدہ یہ رخشندہ بی بی کہاں ہوتیں ہیں آج کل؟''

فاطمہ خالہ نے چھوٹتے ساتھ ہی پوچھا تھا۔

''ہونا کہاں ہے خالہ..... یہی موجود ہے..... کیوں خیریت تو ہے ناں.....؟ آپ کو کچھ کام تھا کیا.....؟''

ان کے تیکھے لہجے نے حمیدہ کو ٹھٹکا دیا۔

''ارے نہیں بھئی کام کیا ہونا ہے بھلا..... وہ نامراد دو ہزار لے کر گئی تھی مجھ سے کہ دو چار روز میں واپس کر دوں گی اور اب مہینا بھر ہو چلا ہے اس کی صورت بھی نظر نہیں آئی..... کہاں تو دن میں دو، دو..... تین، تین چکر لگاتی تھی اور اب یوں غائب ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ایک آدھ مرتبہ گلی میں ملی، تو پیسوں کے تقاضے پر الٹا مجھے ہی لتاڑنے لگی کہ خالہ میں کون سا محلہ چھوڑ کر بھاگ رہی ہوں۔ ارے بی بی سچ پوچھو تو

تمہاری رشتہ داری کا لحاظ کر کے دیے تھے پیسے ورنہ تم تو جانتی ہو آج کل حالات کتنے مشکل ہو گئے ہیں یوں پیسے دیتے کہاں پوری پڑتی ہے۔''

فاطمہ خالہ نے آخر میں انھیں بھی رگیدا تھا۔

''ارے خالہ...... کہاں کی رشتہ داری وقار کے ابا کے دُور پرے کے بھانجے کی بیوی ہے۔ ہمارا تو آنا جانا بھی نہ تھا ان کے خاندان میں وہ تو جب سے اس محلے میں آئی ہے تب بات چیت پہ کھلا کہ یہ ہماری برادری کے ہیں......''

حمیدہ بیگم نے بوکھلا کر وضاحت دی، ساری زندگی اس محلے میں عزت سے گزاری تھی۔ ان پر لوگ اعتبار کرتے تھے، لین دین چلتا ہی رہتا تھا لیکن اب یوں انھیں پرائی آگ میں رگیدا جائے یہ منظور نہ تھا۔ انھیں اپنا دامن بچانے کی فکر ہوئی۔''

جبکہ ان کی بات پر فاطمہ خالہ اچھل ہی پڑیں۔

''آئے ہائے حمیدہ، تو یہ بات تمھیں پہلے بتانی چاہیے تھی...... تمھارے بھروسے آدھا محلہ اُسے اُدھار دیے بیٹھا ہے۔ وہ اپنا امجد نہیں ہے کریانے والا اس سے آٹا، چاول، دالیں...... یہاں تک کہ سوڈا بوتلیں بھی آتی ہیں رخشندہ کے ہاں۔ اب بتاؤ بھلا پیسے دینے کی اوقات نہیں تو زبان کا چسکا پورا کرنے کو ضرور اُدھار لینا ہے۔ ثنا سے الگ دو ہزار ہتھیار لیے وہ اس بار بھی تقاضا کر کے گئی ہے۔ لیکن مارے شرم کے تمھارے ہاں نہیں آئی اور وہ جو نذیر ہے ناں صدر بازار میں کپڑے کی دُکان والا اُس سے دسیوں جوڑے اُدھار اٹھا لاتی ہے اور کیا ہے کہ کبھی کوئی جوڑا تین، چار ہزار سے کم کا ہو۔ مارے مروت

دسمبر کے شمارہ میں اُردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے تحفہ خاص، زبان و بیان پر مہارتِ کُلّی کے حامل شاعر، نقاد، صاحبِ طرز ادیب، شگفتہ مزاج و خوش خوراک مردِ نفیس

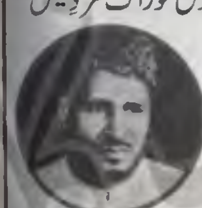

مولانا ماہر القادری

کی زندگی کے دلچسپ حالاتِ زندگی کہ تقویٰ و پارسائی ہی نہیں رنگین مزاجی بھی ان کا طرۂ امتیاز تھا جیسا کہ خود فرماتے ہیں۔

ساقی ہے اور جام بھی بادل گھرے ہوئے
میرا یہ حال ہے کہ میں توبہ کیے ہوئے

محمود احمد لئیق کی لاجواب تحقیق

ب لوگ تمھارا منہ رکھنے کو دے دیتے ہیں۔''

فاطمہ بیگم کی بات نے حمیدہ کے اوسان خطا کر دیے۔

پر خالہ رخشندہ نے مجھ سے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اس نے میرے بھی اٹھارہ سو دینے ہیں......''

حمیدہ بیگم نے پست آواز میں کہا محلے میں بنائی ساکھ مٹی ہونے چلی تھی وہ کیسے اپنے دل کو مضبوط کرتیں۔

''ہائے ہائے حمیدہ اس طرح تو تمھاری ہی بدنامی ہوگی جہان بھر میں...... پر اس کم بخت نے تمھیں ہی نہیں چھوڑا، تو ایسے میں تمھارے نام سے دوسروں کو لوٹتے اسے کیا ڈر لگتا۔ میری مانو تو کسی طریقے سے اُسے سمجھا بجھا کر ایک بار تو لوگوں کا قرض چکاؤ اس کے بعد سب کو محتاط کر دیں گے کہ اس کو اُدھار مت دینا......''

فاطمہ خالہ کی بات پہ حمیدہ نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

......☆......

حمیدہ بھابھی اللہ کا واسطہ ہے میرا بیٹا شدید بیمار ہے صرف پانچ سو روپیہ دے دیں قسم سے جیسے ہی پیسے ہاتھ آئے میں سب سے پہلے آپ کا اُدھار چکاؤں گی۔''

رخشندہ نے روتے ہوئے گویا حمیدہ بیگم کی منت کی۔

''دیکھو رخشندہ میں تمھیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں میرے پاس پیسے نہیں ہیں اب جان چھوڑو میری اور ہاں خبردار جو میرے نام سے محلے میں کسی سے اُدھار مانگا ویسے بھی میں نے ساروں کو منع کر دیا ہے کہ اب جس کسی نے تمھیں اُدھار دیا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔''

حمیدہ بیگم نے سختی سے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئیں یہ گویا رخشندہ بی بی کو اشارہ تھا کہ اب تم بھی پھٹو یہاں سے۔ رخشندہ نے ایک پل ان کے تیوری چڑھے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر شکست خوردہ قدموں سے باہر کا رُخ کیا۔ پہلے محلے کے ہر گھر کا دروازہ اس کے لیے کھلا تھا لیکن جب سے اس نے اُدھار لے کر واپسی میں حیل و حجت سے کام لیا تھا، تو حمیدہ بیگم سمیت سارے محلے کا رویہ بدل گیا تھا۔ حمیدہ بیگم نے کافی سختی کا معاملہ کیا تھا یوں رخشندہ بیگم کو پیسے دیتے ہی بنی تھی اور وہ بھی یوں کہ کوئی ان کی سلائی مشین اٹھا کر لے گیا، تو کسی نے ڈائننگ ٹیبل کو غنیمت جانا اور کسی تیسرے نے ٹی وی پہ ہی اکتفا کر لیا کیونکہ بار بار کے تقاضے پر بھی رخشندہ بی بی نے نقد واپس نہ کرنے کی گویا قسم کھا رکھی تھی اور جب لوگ گھر کی چیزیں اٹھانے لگے، تو مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انھیں پیسے دینا ہی پڑے اور آج جبکہ انھیں حقیقتاً پیسوں کی ضرورت تھی ان کا بیٹا بخار میں پھنک رہا تھا، تو سب نے انھیں ٹکا سا جواب دے کر چلتا کیا تھا۔

رخشندہ کی سمجھ میں آج یہ بات آئی تھی کہ ایک بار اعتبار کھو جائے، تو پھر اُسے بحال کرنا ممکن نہیں رہتا۔ عیاشیوں پر بے دریغ لٹانے والی کے پاس آج ضرورت پوری کرنے کے لیے دھیلا بھی نہ تھا اور کسی دوسرے سے ملنے کا راستہ اس نے خود بند کیا تھا۔ جبھی اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے کانوں میں پڑے ٹاپس اتارے کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا بیٹے کے علاج کے لیے انھیں وہی ٹاپس بیچنے تھے جو کبھی انھوں نے دوسروں سے اُدھار لے کر بنوائے تھے۔

○○○

کشمکش

اسس کا خیال تھا کہ کھلے دروازے سے آتے ٹھنڈے جھونکوں نے اسے گھیر لیا ہے

بنتِ پاکستان سارہ، کراچی

کھڑکی کے پٹ بڑی مضبوطی سے بند تھے۔ ان پہ گرتی بوندوں کی ٹپ ٹپ اندر سنائی دے رہی تھی۔ ہیٹر کی گرمائش کمرے کو موسم کی سختی سے بچائے ہوئے تھی۔ یہ دو بھاری کمبلوں کے اندر چھپے نحیف وجود کی دوا کا وقت تھا۔ وہ کھانا کھاتے ہی پھر کمبل میں دبک گئی تھی۔ انھیں سردی کے نام ہی سے سردی لگتی تھی اور یہ موسم سرما ہی تھا۔ طوفانی دھواں دھار برستی بارش کا یخ بستہ موسم۔

سلمہ نے ایک بار پھر انھیں سہارا دے کر بٹھایا اور پانی کا گلاس آگے بڑھا دیا۔ انھوں نے ہتھیلی پہ رکھی تینوں گولیاں اکٹھی منہ میں رکھ کے بادل نخواستہ پانی کے بڑے سے گھونٹ سے نیچے اُتار کے بُرا سا منہ بنایا۔ کڑوی گولیاں اوپر سے پانی بھی موسم کے مانند سرد تھا۔ انھوں نے مزید دو گھونٹ لیے اور گلاس پرے کر دیا، تو اس نے تکیہ برابر کر کے انھیں لیٹنے میں مدد دی۔ دائیں کروٹ لیٹا کے کمبل ٹھیک کیا، بتی بجھا کے زیرو واٹ کا بلب جلایا اور جانے کے لیے اٹھ گئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" بستر کے سرہانے سے لڑکھڑاتی سی آواز اُبھری۔

"عشا پڑھ کے آتی ہوں بی جان! آپ سو جائیں۔" اس نے گردن موڑ کے جواب دیا۔

"کتنی بار کہا ہے اول وقت عشا پڑھ لیا کرو۔ مگر مجھ بڑھیا کی بھلا کون سنے!" وہ آپ ہی آپ بڑبڑائیں۔ سلمہ دروازہ کھول کے نکل گئی تھی۔

"دروازہ تو بند کر کے جا۔" اپنی پشت پہ دروازہ بند ہونے کی آواز نہ آئی، تو وہ پھر بول پڑیں۔ سلمہ دروازہ پار کر چکی تھی۔

"سردی بہت ہے۔" انھوں نے اپنے گرد کمبل کا گھیرا تنگ کیا۔ باہر سے آتی بادلوں کی گرج انھیں بے چین کرنے لگی۔ سارا دن برسنے کے بعد بارش اب بھی نہیں تھمی تھی۔

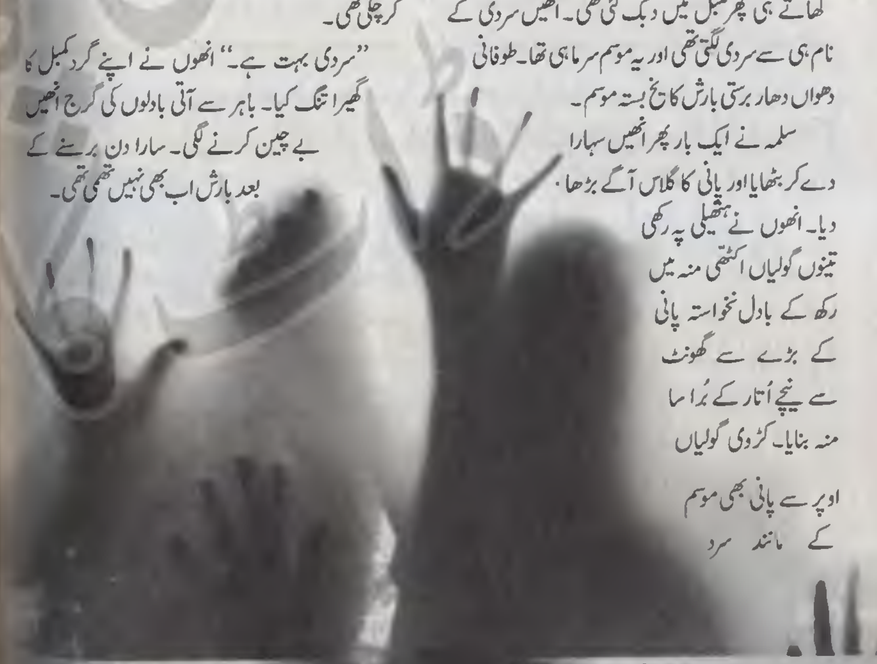

"جانے اس لڑکی کو کاہے کی جلدی رہتی ہے، ناہنجار نے دروازہ بھی بند نہیں کیا۔ ٹھنڈ سے چاہے بوڑھی بی بی اکڑ کے لکڑ بن جائے...... یہاں کسی کو کوئی پروا نہیں۔ ہائے......! ہڈیوں میں برف سی جم رہی ہے......" خفگی سے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔ باہر برستی بارش ان کے کمزور اعصاب پہ ٹپ ٹپ گر رہی تھی۔

سامنے جلتا نیلگوں ننھا سا بلب ماحول کے اندھیرے سے لڑنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں کمرا دھندلایا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ انھیں ٹھنڈی ہوا کے یخ جھونکے کمبل کی دیوار میں سوراخ کر کے اندر گھستے محسوس ہوئے۔ کپکپی طاری ہونے لگی تھی۔

"اری دروازہ تو بند کر دے آ کر!" انھوں نے حتی المقدور چلانے کی کوشش کی، مگر آواز بھی شاید جم سی گئی تھی، حلق ہی میں پھنس کر رہ گئی۔

"ہائے ربا! بڑھاپا بھی بڑی نامراد چیز ہے، دوسروں کی محتاجی...... ہاتھ پیر چلتے تو ذرا ذرا سے کام کے لیے دوسروں کا منہ تو نہ دیکھنا پڑتا۔" جھنجھلاہٹ حد سے سوا تھی، بے بسی سے ان کی آنکھوں میں بارش کے قطرے چمکنے لگے۔

سلمہ نماز پڑھ کے ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ انھیں سردی بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی، کھلے دروازے سے آتے ٹھنڈے جھونکے ان کے گرد گھیرا ڈالنے تاک میں تھے، اِدھر کو روزن ملے اور اندر گھس کے بڑھیا کی ہڈیوں کو جکڑ لیں، ہیٹر کی گرماہٹ بھی ان کے آگے گھٹنے ٹیک چکی تھی۔

انھوں نے کپکپاتی زرد انگلیاں اندر سے نکال کے گلے تک آئے کمبل کو اوپر کھینچ کے سر تک پہنچایا اور کمبل کے اندر گٹھڑی بن گئیں۔

کچھ دیر یونہی گزر گئی، پھر ان کی ذہنی روح بھٹکنے لگی۔ انھیں لگا ان کے اماں ابا، بہن بھائی سفید لباس تن پر لپیٹے ان کے اردگرد آ کھڑے ہوئے ہوں۔ انھیں آوازیں آنے لگیں......

"شاید میرا آخری وقت آ گیا ہے؟" انھیں خیال گزرا۔ چند لمحے یوں ہی سکڑی رہنے کے بعد انھوں نے ہمت کر کے دائیں ہاتھ کی چٹکی سے پکڑ کر کمبل ایک آنکھ سے نیچے سرکایا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اردگرد کی چیزیں پہلے کی طرح ساکت تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ گھبرا کے سلمہ کو پکارتیں انھیں کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔

منہ باہر نکال کے وہ کافی دیر تک کھانستی رہیں، ساتھ والی میز پر سلمہ پانی کا جگ رکھ کے گئی تھی۔ وہ بمشکل تمام سہارا لے کے ہانپتی کانپتی اُٹھ بیٹھیں۔ کپکپاتے ہاتھ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور گھونٹ گھونٹ پی کے تنفس بحال کیا۔

دھیمی نیلگوں روشنی میں سامنے کے رخ پہ لگا گھڑیال رات کے گیارہ بجنے کا عندیہ دے رہا تھا۔ وہ دس بجے تک نیند کی وادی میں اتر جاتی تھیں مگر آج......

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی سلمہ کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت کو کوستی اور اپنے بڑھاپے پہ دو حرف بھیجتی دروازہ بند کرنے کے لیے خود پر سے کمبل ہٹانے لگیں کہ ان کی نظر مخالف دیوار میں جڑے دروازے پہ پڑی۔

یکدم سردی کا اثر زائل ہونے لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے بگولے یکا یک دم دبا کے بھاگ کھڑے ہوئے، ہیٹر کی گرمی سے ہڈیوں میں جمی برف پگھلنے لگی، وہ اُٹھتے اُٹھتے بیٹھ گئیں۔

دروازہ بند تھا......

زندگی قدم گھسیٹ گھسیٹ کے چل رہی تھی اور دن لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ایک دن ایک سال کے برابر۔ ایک گھنٹا..... ایک دن جتنا۔ وقت پھیل گیا تھا نجانے کیوں؟ طول وعرض کی لمبائی کی طرح بے حد لمبا۔ سرکاری ہسپتال کے پہلے وارڈ کی بدبودار فضا میں وقفے وقفے سے بیڈ نمبر تیرہ کی گھوں گھوں ماحول کی بدنما خاموشی کو بے ڈھنگے پن سے توڑتی جا رہی تھی۔

''یہ بڈھا رات کو بھی سکون سے نہیں سونے دیتا۔'' دن رات آخ تھو کی زور دار آواز سے بلغم نکالنے والے نحیف وکمزور ہڈیوں کے ڈھانچے، بڈھے نے چادر سے منہ نکال کے ناگواری کا اظہار کیا اور چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

''گھوں گھوں..... گھوں.....'' یہ اس کا جواب تھا۔

اس کے لیے رات بڑی طویل ہوتی تھی۔ شیطان کی آنت کی طرح لمبی۔ سوسو بار کھانس لیتا۔ مگر صبح ہو کر نہ دیتی۔ نیند بھی نہیں آتی تھی۔ آخر کار کوئی دو سو بار کھانسنے کے بعد صبح کی سپیدی کھڑکی کے اُس پار نمودار ہوئی اور کچھ دیر میں کمرا روشن ہوگیا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ فہد نے نو بجے آنا تھا۔ جانے اس آدھے گھنٹے کو گزرنے میں کتنے گھنٹے لگنے تھے۔ وہ نظریں گھڑی پہ جمائے لمحے گننے لگا۔ دروازے سے داخل ہونے والے ہر شخص پہ اسے اپنے بیٹے کا گمان ہوتا پھر اسے نہ پاکر مایوسی سے سر ہلاتا آنوواردکی طرف متوجہ ہو جاتا۔

انتظار تمام ہوا اور اس کا مطلوبہ چہرہ دروازے میں نمودار ہوا۔ جب تک وہ اس کے بستر کے قریب پہنچتا اس نے اپنے اوپری جسم کو اُس کے استقبال

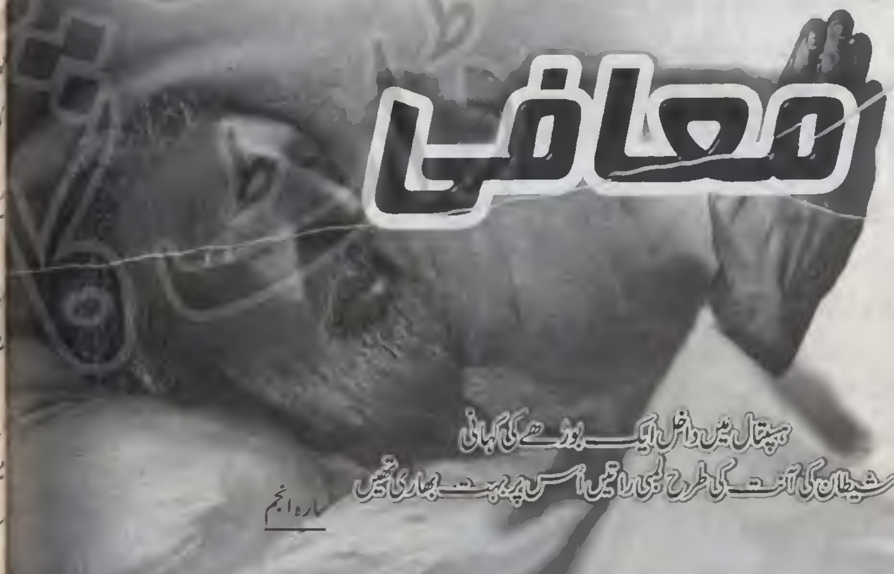

معافی

ہسپتال میں داخل ایک بوڑھے کی کہانی

شیطان کی آنت کی طرح لمبی راتیں اس پر بہت بھاری تھیں

سارہ انجم

اٹھانے کی پوری کوشش کی اور ناکام ہو کے پھر پہ گر گیا۔ مگر نظروں اور دیگر اعضا سے بے تابی ٹی پڑ رہی تھی۔

''السلام علیکم ابا جی! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' وارد کے خوش نما چہرے پہ گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کے تھیلے میں سے چیزیں نکالنے لگا۔

''وعلیکم السلام پُتر۔ میں تو تیرے سامنے ہوں..... گھوں گھوں..... تو مجھے اپنے بچوں کا بتا..... اور شمس بھی..... گھوں گھو.....'' جھری زدہ ابھری نس والا ہاتھ اس کے گھٹنے پہ ٹک گیا۔

''سب ٹھیک ہیں ابا جی'' اس نے بستر سے ملحق میز کی دراز سے پیالہ نکال کر تھیلی میں بندھی گدلی سی یخنی اس میں انڈیلی۔

''تو انھیں مجھ سے ملوانے کیوں..... نہیں لاتا؟ انھیں لے آیا کر پُتر..... گھوں گھوں..... اور شمس..... کو بھی۔''

''ہاں لاؤں گا ابا جی'' اس نے چمچ بھر بھر یخنی ان کے منہ میں ڈالنی شروع کی۔

وہ انھیں نہیں بتا سکتا تھا کہ انھوں نے بچوں کے وں میں اس قدر دہشت بٹھا رکھی ہے کہ کوئی ان سے ملنے نہیں آنا چاہتا۔ البتہ شمس کی بات اور تھی۔

''شمس کو بھی لائے گا ناں.....؟'' اس نے اپنے پوپلے منہ میں گلکاری کی طرح یخنی کچھ دیر کلّے میں دبائے رکھنے کے بعد اندر دھکیلتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

''شمس.....'' باپ کے ہونٹوں کے کناروں سے ٹپکتے قطرے رومال میں منتقل کرتے ہوئے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو تھمے تھے۔

''وہ..... ابا جی..... ہاں وہ شمس..... کہہ رہا تھا کہ مصروفیت کے باعث چکر نہیں لگا سکتا۔ ورنہ وہ..... آنا تو بہت چاہ رہا تھا۔''

''تو سچ..... سچ کہہ رہا ہے..... پُتر؟''

''ہاں ابا جی۔''

''تو ایسا کر..... ابھی..... فون کر اسے..... گھوں گھوں..... میرے سامنے.....''

''ابھی؟؟؟''

''آہو۔ آواز اونچی رکھیو..... بہت دن ہوئے..... گھوں گھوں..... آواز نہیں سنی اُس کی۔''

فہد نے تذبذب کے عالم میں موبائل اُٹھا کے باپ کا چہرہ دیکھا۔ وہاں آس کے نجانے کتنے چراغ روشن تھے۔ اس نے انگوٹھے کی مدد سے نمبر ملائے اور چند لمحوں میں مردانہ آواز گونجی۔

''ہاں کیا بات ہے؟'' اس نے اسپیکر کھول دیا۔

''شمس..... وہ ابا جی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ تمھیں یاد کر رہے ہیں۔ ڈاکٹرز ان کی طرف سے بہت.....''

''چاچا مَرا تو نہیں ہے نا ابھی؟'' فہد کی بات کے جواب میں دوسری طرف شمس نے توپ کا گولا اُگلا اور چاچا اس حملے سے دہرا ہوگیا۔ یوں لگا جیسے کسی نے ماضی کے قفل لگے دروازے کو دھماکے سے اُڑا دیا ہو اور وہ ماضی میں داخل ہوگئے ہوں۔

''یہی..... بالکل یہی..... ہاں یہی الفاظ تو تھے جو کبھی ان کی زبان سے گولی کی صورت نکلا کرتے تھے۔

مکافاتِ عمل......

تاریخ کا خود کو دُہرانا......

یا کچھ اور...... سب سے پہلے یہ الفاظ اس کے باپ اور اپنے سگے بھائی کے لیے استعمال کیے تھے۔ انھیں یاد آیا۔

اس زمانے میں خاندانی چپقلش کے باعث دونوں گھرانوں کے درمیان کشیدگی ہوگئی تھی۔ ملنا ملانا سب ختم ہوگیا تھا۔ قریب سے بھی گزرتے، تو یوں بچتے بچاتے گویا اگلا کوئی اچھوت ہو۔ اسی دوران انھیں بڑے بھائی کے دل کے دورے کی خبر ملی، تو انھوں نے افواہ سمجھا اور جب اگلے دورے پہ شکیلہ بھابھی نے معافی مانگتے ہوئے بھائی صاحب کی طبیعت سے مطلع کرتے ہوئے بتایا کہ بھائی صاحب انھیں بہت یاد کرتے ہیں، تو وہ غرور سے تن گئے۔ انھیں لگا وہ بہت اونچے ہوگئے ہوں۔ بھائی صاحب ان کے سامنے جھک گئے تھے۔ ان کی انا کو بڑی تسکین محسوس ہوئی تھی، مگر جھکنا بھائی صاحب کی مجبوری تھی ان کی تو نہیں۔

تب انھوں نے بڑے غرور سے کہا تھا۔

''بیمار ہیں تو میں کیا کروں؟ مرے تو نہیں ہیں نا۔''

انھیں علم تھا کہ جوان جہاں بھائی نے کون سا واقعی مرجانا ہے۔ مگر بھائی صاحب ان لفظوں کا بوجھ سینے پہ لیے اگلے دورے پر دنیا سے رخصت ہوگئے۔

بھائی تھے وہ ان کے...... کتنی ہی دیر تو انھیں ان کے جانے کا یقین نہ آیا اور جب آیا، تو ان کے دل نے بتایا کہ ہر کسی نے اپنے وقت پہ جانا ہے لہٰذا بھائی صاحب بھی قدرت کی طرف سے مہلت ختم ہونے پہ وفات پاگئے۔ تب وہ بڑے کروفر سے ان کے جنازے میں شریک ہوئے تھے۔

وہ ایسے ہی تھے...... جو منہ میں آیا سب غلط ملط کہہ جانے والے۔ چھوٹوں کے لیے کوسنے، لعنتیں، بددعائیں...... اور بڑے...... اور بڑوں کو وہ ناک پہ سے مکھی کی طرح اُڑا دیا کرتے تھے۔

''چاچا سے کہہ دو فکر نہ کرے۔ مرجائے گا، تو جنازے میں ضرور آؤں گا۔''

شمس نے دوسری طرف سے کہا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

''ابا...... ابا جی...... آپ آرام سے لیٹیں ڈاکٹر...... ڈاکٹر......'' ان کے ٹیڑھے ہوتے ہاتھ پیر اور حلقوں سے ابلی آنکھیں دیکھ کے فہد بے طرح چلایا تھا۔ لمحوں میں بیڈ نمبر تیرہ ڈاکٹروں کے گھیرے میں چھپ گیا تھا۔

انھیں مختلف شکلیں نظر آنے لگیں۔ وہ لوگ یاد آنے لگے جو اپنی ناکردہ وہ غلطیوں کی معافیاں مانگتے قبر میں جالیٹے تھے۔ انھیں وہ زندہ لوگ یاد آئے جو ان کی زبان کے تیر کھا کے اب ان کی شکل بھی نہ دیکھنا چاہتے تھے۔

''معافی...... گھوں گھوں...... معافی......'' غنودگی کے عالم میں ان کے ہونٹوں سے نکلا۔

مگر اب معافی کس سے ملے؟ فی الحال وہ سکون آور انجکشن کے زیر اثر سوگئے تھے۔ مگر کل پھر انھیں جاگنا تھا۔ سال برابر دن گزارنے کی کوفت سہنے کے لیے۔ اپنوں کی راہ تکنے کے لیے۔ اور...... اور معافی کی بھیک مانگنے کے لیے۔

OOO

خوب صورت

ایک خوشگوار دن کا ماجرا

کتے کے پلے سے عجیب طرح سے واسطہ پڑ گیا تھا

امتیاز حسین

ستمبر مجھے ہمیشہ ہی سے اچھا لگتا ہے۔ گرمیاں دم توڑ رہی ہوتی اور سردیاں جھانک رہی ہوتی ہیں۔ نہ گرمی ہوتی ہے، نہ سردی۔ گرمی سٹھی ہوتی ہے کہ اب واپس نہیں آسکتی لیکن سردی چونکہ ہلکی ہلکی اور میٹھی میٹھی ہوتی ہے اس لیے اس کی تانک جھانک اچھی لگتی ہے۔ اسلام آباد میں برسات تازہ تازہ ختم ہوئی تھی جو حبس کو بھی ساتھ ہی لے گئی تھی۔ اس لیے موسم کھلتے ہی باہر نکلنے کو دل چاہ رہا تھا۔ برسات کے بعد تو اسلام آباد ویسے بھی دیکھنے والا ہوتا ہے ہر چیز سبز ہوجاتی ہے حتیٰ کہ لوگ بھی سبز۔ ویسے بھی دِل سبز ہوجائے تو ہر چیز سبز ہی نظر آتی ہے، پندرہ ستمبر ایسا ہی دن تھا۔ تھا بھی اتوار سب کا دل باہر نکلنے کو چاہ رہا تھا۔ عمر نے کل ہی بتا دیا تھا کہ دوپہر دو ایک بجے نکلیں گے۔ اس قسم کے پروگرام ہمارے بچے ہی بناتے ہیں۔ بچے بھی صرف ہمارے لیے بچے ہیں ورنہ بچے کہاں ہیں۔ سب سے چھوٹا عمر ہے جو خود ماشا اللہ ایک بچے کا باپ ہے۔ لیکن ہمارے لیے تو بچہ ہی ہے، بہرحال ہفتے کے دن ہی سارا پروگرام طے ہوگیا۔ ہمیں تو صرف بتا ہی دیا جاتا ہے اس لیے کہ ہم نے کچھ کرنا نہیں ہوتا۔ سارا بندوبست تو بچوں نے ہی کرنا ہوتا ہے۔ ہم نے تو صرف لطف اندوز ہونا ہوتا ہے، کبھی ہم بھی بندوبست کرتے تھے اور یہ لطف اندوز ہوتے تھے۔

اتوار کی صبح موسم بڑا خوشگوار تھا سب خوش تھے کہ پکنک کا مزہ آئے گا۔ لیکن دس بجے کے قریب اچانک بارش شروع ہوگئی۔ بارش اتنی تیز اور طوفانی کہ سارا پروگرام بہا کر ساتھ ہی

لے گئی۔ چلی بھی اتنی لمبی کہ ہم لوگ مایوس ہوگئے۔ ایسے موسم میں پکنک کیسے منائی جاسکتی تھی اس لیے سب آرام سے بیٹھ گئے۔ کر ہی کیا سکتے تھے۔ عین اس وقت جب ہم لوگ مایوس ہوگئے تھے موسم نے اچانک کروٹ بدلی اور کھل گیا۔ بادل جتنی جلدی آئے تھے اتنی ہی جلدی غائب بھی ہوگئے۔ موسم بارش کی وجہ سے اور بھی خوشگوار ہوگیا۔ ہر چیز جیسے ڈھل کر نکھر گئی۔ موسم کے ساتھ ہی عمر کا بھی موڈ بدل گیا۔ تین بجے اس کا فون آیا کہ تیار ہوجائیں چار بجے نکلیں گے۔ کچھ نہیں تو ایک چکر ہی لگائیں گے موسم اور سبزے ہی سے لطف اندوز ہولیں گے۔ تیاریاں شروع ہوگئیں۔ مجھے آفس میں کچھ کام تھا۔ آفس نزدیک ہی ہے۔ بھاگم بھاگ گیا اور کام سمیٹ کر واپس آگیا۔ سب لوگ چار بجے کے حساب سے تیار تھے۔ ہم لوگ تھے ہی کتنے۔ میں، بیگم اور صائمہ بیٹی۔ تین ہی تو تھے۔ اتنے ہی عمر وغیرہ تھے۔ عمر، اس کی بیوی سدرہ اور ان کا تین سالہ بیٹا شایان۔ ہم سب ایک ہی گاڑی میں آرام سے آجاتے تھے۔ چار بجے عمر نہ آیا، تو سب کے چہرے پر تشویش کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ وقت کا سخت پابند ہے۔ اگر اسے دیر ہوجائے، تو سب سمجھ لیتے ہیں کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ سوا چار بجے تک وہ نہ آیا، تو بے چینی شروع ہوگئی۔ سب سمجھ گئے کہ کچھ نہ کچھ ہوگیا ہے ورنہ وہ لیٹ نہیں ہوتا۔ کوئی اسے فون بھی نہیں کررہا تھا کہ پریشان نہ ہو۔ یہ بھی پتا تھا کہ وہ عادت کے مطابق پہلی فرصت میں اطلاع دے گیا۔ اگر اسے کوئی پریشانی تھی تو فون کرکے اس کی پریشانی میں اضافہ کرنا مناسب نہ ہوتا۔ ویسے بھی اگر کوئی بڑا حادثہ ہوگیا ہوتا، تو وہ ضرور اطلاع دیتا۔ اتنی تسلی تھی کہ وہ بلاوجہ لیٹ نہیں ہوتا۔ اس لیے پروگرام میں تاخیر یا اس کے ملتوی ہونے کا افسوس نہیں تھا۔

کوئی ساڑھے چار بجے عمر کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ ایک کتا اس کی گاڑی کے نیچے آگیا ہے جس کی دونوں پچھلی ٹانگیں ٹوٹ گئیں ہیں۔ اب وہ اس کو ویٹرنری ہسپتال لے جانا چاہتا تھا کہ اس کا علاج ہوسکے۔ اس نے ہم لوگوں سے ویٹرنری ہسپتال کے متعلق پوچھا لیکن ہم میں سے کسی کو بھی اس کے متعلق پتا نہیں تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ وہ جلدی میں تھا اس لیے کہ کتا تکلیف کی وجہ سے شور مچا رہا تھا۔ وہ اسے جلد سے جلد ہسپتال پہنچانا چاہتا تھا۔ عمر کی کال کے بعد ہم لوگ سوچنے لگ گئے کہ کتا کیسے اس کی گاڑی کے نیچے آیا ہوگا؟ وہ تو بہت اچھا اور محتاط ڈرائیور ہے۔ جانوروں وغیرہ کا بھی بہت خیال رکھتا ہے۔ پچھلے سال اس نے ایک بلی کو بچانے کے لیے اپنی گاڑی کا نقصان گوارا کرلیا، لیکن بلی کو بچالیا تھا۔ آج کتا کیسے اس کی گاڑی کے نیچے آگیا؟ پھر بات ہونے لگی کہ وہ کتے کو ہسپتال کیسے لے جائے گا؟ کسی بوری وغیرہ میں ڈالنا پڑے گا۔ پتا نہیں کتا ہوگا کتنا بڑا۔ درد کی وجہ سے کہیں پاگل ہی نہ ہوا ہو۔ کہیں اسے کاٹ ہی نہ لے۔ طرح طرح کی باتیں ذہن میں آتی رہیں۔ سب کی خواہش اور دُعا تھی کہ کتا بچ جائے۔ ہم لوگ اسلام آباد کے سیکٹر L-10 میں رہتے ہیں۔ یہاں آوارہ کتوں کی بہتات ہے۔ جس گلی اور سڑک پر دیکھیں پھر رہے ہوتے ہیں۔ پتا نہیں سی ڈی اے (CDA) کو کیوں نظر نہیں آتے؟ بڑے لمبے وقفے کے بعد عمر کا فون آیا۔ اس نے ہم لوگوں کو تیار ہونے کے لیے کہا تاکہ کہیں باہر نکل سکیں۔ حادثے کی تفصیل اور کتے کے متعلق پوچھا، تو اس نے کہا ملنے پر بتاؤں گا۔

ہمیں گھر سے لے کر نکلا، تو راستے میں عمر نے بتایا کہ وہ چار بجے سے کچھ پہلے ہمیں لینے کے لیے گھر سے نکلا۔ سدرہ اور شایان بھی گاڑی میں اس کے ساتھ تھے۔ جیسے ہی اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور آگے بڑھا تو اسے لگا جیسے گاڑی کے پہیے کے نیچے کوئی پتھر آیا ہو۔ ساتھ ہی آواز بھی آئی۔ اس نے گاڑی روکی اور واپس آیا، تو اس نے دیکھا کہ کتے کے تین پلے تھے۔ ان میں سے ایک گاڑی کے پہیے کے نیچے آگیا تھا اور اس کی دونوں ٹانگیں بُری طرح کچلی گئی تھیں۔ دوسرے دونوں کچھ فاصلے پر بیٹھے اس کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ زخمی پلا بُری طرح چیخ رہا تھا۔ انھیں اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ اس گلی میں آوارہ کتوں کی بہتات ہے۔ ہر وقت اِدھر اُدھر پھرتے نظر آتے ہیں۔ اکثر گرمی اور دھوپ سے بچنے کے لیے گاڑیوں کے نیچے سوئے ہوتے ہیں جیسے ہی گاڑی میں بیٹھیں یا گاڑی سٹارٹ ہو بھاگ جاتے ہیں۔ پتا نہیں یہ بے چارہ کیوں نہ بھاگ سکا۔ مجھے پتا نہ چلا اور کُچلا گیا۔ پلا سخت تکلیف میں تھا۔ ان کچلی ہوئی ٹانگوں کی وجہ سے شاید اس نے مرنا تو نہیں تھا لیکن اس کی باقی زندگی ان کو گھسیٹتے ہوئے گزرنی تھی۔ اس طرح کے کتنے ہی کتے ہمیں سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ اس نے سوچا کیوں نہ اس کو اس عذاب سے نجات ہی دلا دی جائے۔ یہ سوچ کر وہ پسٹل لینے کے لیے اندر جانے لگا، تو سدرہ نے اسے روک دیا۔ اسے اس پلے پر ترس آرہا تھا۔ آخر انھوں نے اسے بچانے کا فیصلہ کیا۔ اسے فوراً ویٹرنری ہسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ لیکن اسے کیسے لے جائیں۔ چھوٹا سا تھا اس لیے سوچا کوئی تھیلا یا بوری لے لیتے ہیں اس میں ڈال لیں گے۔ تھیلا لینے کے لیے اندر جانے

ایک سیکنڈ

سیکنڈ وقت کی بہت ہی معمولی سی مدت کو کہتے ہیں۔ یہ بہت جلد گزر جاتا ہے۔ انسانی اور حیوانی اجسام میں بعض عمل اتنی تیزی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگتا ہے۔

کسی شخص کا ہاتھ بجلی کے تاروں کو چھو جائے تو وہ سیکنڈ کے آٹھویں حصے کے اندر ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ یہ ایک غیر ارادی فعل ہوتا ہے۔

انسانی چھینک کا عمل ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچاتا ہے۔

ایک مشہور ناول نگار کا کہنا ہے کہ یورپ کے دو پہلوان کُشتی لڑ رہے تھے۔ دس سیکنڈ میں ایک نے دوسرے کو پچھاڑ دیا اور اس عرصے میں میرا ذہن ایک مکمل ناول کا خاکہ ترتیب دے چکا تھا۔

ایک مینڈک سیکنڈ کے چالیسویں حصے میں اپنی خوراک یعنی کیڑے کو چٹ کرجاتا ہے۔

گرگٹ اپنے سے ایک فٹ اوپر اڑتی مکھی کو نصف سیکنڈ سے بھی کم وقت میں چٹ کرجاتا ہے۔

چیتا غصے کی حالت میں ایک سیکنڈ میں ایک سو تیس فٹ لمبی چھلانگ لگاتا ہے۔

ایک شکاری کے بیان کے مطابق وہ ایک بار جنگل سے ایک ہرن کو پانی پیتے دیکھ رہا ہے کہ اچانک چیتا ایک گز کے فاصلے سے حملہ آور ہوا۔ حملے سے پہلے چیتا غرایا۔ ہرن نے یہ آواز سن لی۔ وہ اسی وقت چوکنا ہوگیا، چیتا سیکنڈ سے بھی کم مدت میں اپنی جگہ سے چھلانگ لگا چکا تھا، لیکن ہرن اس سے بھی پہلے وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ ہمیں چاہیے کہ سیکنڈ کو نظر انداز نہ کریں، کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ (الطاف اللہ لطف۔ کانگڑہ شب قدر)

لگا، تو راستے ہی میں موٹر سائیکل پر ڈالنے والے کپڑے پر نظر پڑگئی۔ پلے کو اسی میں لپیٹ کر پچھلی سیٹ کے آگے رکھ لیا۔ اب ہسپتال کی تلاش شروع ہوئی۔ گلی میں ایک دو سے پوچھا لیکن کسی کو پتا نہیں تھا۔ اس سیکٹر میں سی ڈی اے (CDA) کا ایمرجنسی سنٹر ہے ان سے پوچھا انھیں بھی پتا نہیں تھا۔ 1122 سے پوچھا، تو انھوں نے 15 سے رابطہ کرنے کو کہا۔ ایدھی سنٹر گئے ان کو بھی پتا نہیں تھا۔ کسی نے بتایا کہ یہ الشفا ہسپتال کے پاس ہے۔ الشفا جا رہے تھے کہ راستے میں I-9 میں ”علی ہسپتال“ نظر آ گیا۔ وہاں سے پوچھا، تو انھوں نے بتایا کہ یہ الشفا کے پاس نہیں مری روڈ پر کمیٹی چوک کے پاس ہے۔ کمیٹی چوک روانہ ہوگئے۔ پلا مسلسل چیخ رہا تھا جوان کے لیے بھی تکلیف کا باعث تھا۔ مری روڈ پر ایک دو جگہ رُک کر تصدیق کی کہ واقعی ویٹرنری ہسپتال کمیٹی چوک کے پاس ہے بھی یا نہیں۔ تصدیق کے بعد پھر آگے روانہ ہوئے۔ ایک جگہ اچانک پلے کی چیخیں بند ہوگئیں۔ سدرہ نے کہا شاید مر گیا ہے۔ جس کپڑے میں لپٹا ہوا تھا اس کو ہاتھ لگایا، تو پھر حرکت کرنے اور چیخنے لگا۔ تصدیق ہوگئی کہ زندہ ہے۔ جلدی جلدی کمیٹی چوک پہنچے۔ چوک میں پہنچ کر پوچھا تو ایک گلی بتائی گئی۔ اس طرف چلے لیکن ہسپتال پہنچنے سے کوئی ایک منٹ پہلے پلا پھر خاموش ہوگیا۔ شک پڑنے پر اسے ہلایا جلایا گیا لیکن نہ اس نے حرکت کی نہ چیخا۔ غالباً مر چکا تھا۔ جلدی سے اسے ہسپتال کے اندر لے گئے۔ ہسپتال میں صرف ایک ہی آدمی موجود تھا جس نے بڑے ’ماڈرن‘ طریقے سے اس کو چیک کیا۔ پلے کا کان پکڑ کر کھینچا۔ پلے نے کوئی حرکت کی نہ آواز نکالی، تو اس نے تصدیق کر دی کہ ”مر چکا ہے۔“ بہت افسوس ہوا کہ اسے بچا نہ سکے۔ لیکن یہ اطمینان تھا کہ ہم نے کوشش پوری کی۔ آگے اس کی قسمت۔ اس ویٹرنری ہسپتال کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ ایک کمرے کا ہسپتال تھا اور اس میں ایک ہی بندہ تھا۔ شاید اتوار کی وجہ سے اکیلا ہو۔ میرے خیال میں تو ان کے پاس اس پلے کو بچانے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس کو بے ہوشی کا انجکشن لگا دیتے تا کہ اسے وقتی طور پر درد سے نجات مل جائے یا اس کا علاج ممکن نظر نہ آتا، تو اسے زندگی ہی سے نجات دلا دیتے۔ یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کی اگر صرف ٹانگیں ہی ٹوٹی تھیں تو یہ مر کیسے گیا۔ یا تو درد سے مر گیا ہوگا یا پھر گاڑی اس کی ٹانگوں پر سے ہی نہیں باقی جسم پر سے بھی گزری ہوگی۔ عمر نے بتایا کہ انھوں نے تو اس کی آگے کی بھی منصوبہ بندی کر لی تھی۔ اگر اس کی مرہم پٹی ہو جاتی، تو وہ اسے گھر لے جاتے۔ وہ چل پھر تو سکتا نہیں تھا اس لیے چھت پر ایک جگہ مخصوص کر لی جہاں پر اسے رکھا جاتا۔ پھر ٹھیک ہونے پر اسے کہیں چھوڑ دیا جاتا۔ لیکن وہاں تک تو بات ہی نہ پہنچ سکی۔

کسی سیانے کا قول ہے ”خوبصورت وہ ہے جو خوبصورت کام کرتا ہے۔“ بے حسی، خود غرضی اور نفسا نفسی کی اس دُنیا اور زمانے میں جہاں لوگ انسانوں کو تڑپتا چھوڑ کر گزر جاتے ہیں ایک چھوٹے سے آوارہ کتے کے لیے اتنی بھاگ دوڑ، مجھے اپنا بیٹا اور بہو اُس لمحے بڑے ہی خوب صورت لگے تھے۔

○○○

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے..... ذرا

اُمِ عاقب

ولائی 2013ء کے شمارے میں ”اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے“ نظر سے گزرا۔ بے اختیار دل چاہا کہ میں اس ”سلگتے ...ال“ کا جواب تحریر کروں۔

عورت پاکستان کی ہو، بھارت کی یا دُنیا کے کسی ...ونے کی۔ جب تک وہ اپنے اصل مقام سے آشنا ...یں ہوگی۔ اپنی ذمہ داریوں اور دائرہ کار کا تعین نہیں ...رے گی ایسے واقعات کا ظہور غیر فطری نہیں۔ کیا یہ ...نطق عجیب نہیں کہ خود تو ٹھنڈا، مزے دار دودھ پیچ ...را ہے کھلے برتن میں رکھ دیں اور بلی پر پابندی ...ئیں کہ دودھ نہ پیے؟؟

یہ عورت کی اپنی ذمہ داری ہے کہ اپنے آپ کو ...فوظ مقام پر رکھے اور اپنی حفاظت کی تمام تدابیر بروئے کار لائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں عورت کی ملازمت کے خلاف ہوں۔ میں تو خود سروس کرتی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عورت بہت مجبور ہو کر گھر سے نکلتی ہے، تو پھر اسے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کسی پٹرول پمپ پر وردی پہن کر زیادہ محفوظ ہے یا کسی چار دیواری کے اندر ساتر لباس کے ساتھ خدمت سر انجام دینے میں زیادہ مامون ہے۔

میرے گھر ایک خاتون ملازمہ ہے۔ وہ اپنے گھر سے برقع اوڑھ کر آتی ہے اور میرے گھر چادر اوڑھ کر کام کرتی ہے۔ بہت سنجیدہ اور کم گو ہے۔ غیرت کے حصار میں لپٹی ہوئی۔ میرے خیال میں اوّل تو کوئی مرد اُس کا ہاتھ پکڑنے کی جرأت نہیں کرے گا اور اگر کرے گا بھی تو پھر ہنسے گا نہیں، البتہ روئے گا ضرور۔

اللہ خالق کائنات نے عورت کے اندر خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم حیا اور غیرت کا گہرا جذبہ رکھا ہے۔ اگر

○○○

عورت اپنے اس جذبہ کی حفاظت کرے، اسے پروان چڑھائے، تو وہ ہر جگہ محفوظ و مامون ہے۔ اللہ نے انسان کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اُسے وہ حدود و قیود بھی سمجھائیں جن کی پابندی کر کے وہ بہتر اور محفوظ زندگی بسر کرسکتا ہے۔ انبیا کے ذریعے انسان کی ہدایت کے سرچشمے جاری کیے تاکہ وہ اشرف المخلوقات کے اعلیٰ درجے کا حق ادا کرسکے۔ اب اگر انسان خواہ مرد ہو یا عورت لبرل ازم کے نام پر شریعت کے قوانین توڑنے پر تُل جاتا ہے، تو یاد رکھیں جہاں شریعت کا قانون ٹوٹتا ہے تباہی وہیں سے شروع ہوجاتی ہے۔

ایک مرتبہ میں لاہور نیازی اڈے کی انتظار گاہ میں بیٹھی تھی۔ انتظار گاہ خواتین و حضرات سے بھری ہوئی تھی۔ اچانک ایک عورت عمر تقریباً 35 سال، 2 بچے بھی ہمراہ تھے۔ اپنی نشست سے اُٹھی، وہ خوب ماڈرن اور تنگ لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھی۔ وہ کسی سے موبائل پر با آوازِ بلند بات کررہی تھی۔ گفتگو کے بھی کچھ آداب ہیں اور میرے خیال میں موبائل کے استعمال کی بھی کچھ اخلاقیات ہیں۔ یہ کیا تُک ہے کہ آپ بسوں، گاڑیوں اور پبلک مقامات پر اپنے آپ کو ''طشت از بام'' کرتے پھریں۔ خیر وہ خاتون نہ صرف باتیں کررہی تھی بلکہ انتظار گاہ میں پڑے صوفوں اور کرسیوں کے درمیان تنگ سی خالی جگہ پر گھوم پھر بھی رہی تھی۔

یہ ایک واقعہ نہیں
بلکہ ہماری سڑکیں اور پبلک مقامات
ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔

ایسے میں اگر اُسے کسی کی کہنی لگ جائے تو.....

یہ ایک واقعہ نہیں بلکہ ہماری سڑکیں اور پبلک مقامات ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ میں ایک اُستاد ہوں اور پچیس سال سے اس خدمت پر مامور ہوں۔ لڑکیوں کے جو حالات آج ہیں، 15 سال پہلے اس کا تصور بھی نہ تھا۔

یہ کیا ستم ظریفی کہ ایک عورت سولہ سنگار کیے، خوشبو کی لپٹیں اڑاتی، دعوتِ نظارہ دیتی پھرے اور مردوں سے مطالبہ کرے ''نگاہ رکھ نیچی اپنی''۔ عورت خود تو شریعت الٰہی کی دھجیاں بکھیرے اور مردوں کو تنقید کا نشانہ بنانے کے لیے مظلومیت کا سوانگ بھرے۔

اللہ نے مرد کو عورت کا ''قوام'' بنایا ہے۔ مگر آج کی منہ زور عورت ''قوامیت'' کی یہ پگڑی مردوں سے چھین کر اپنے سر پر رکھنا چاہتی ہے۔ اگرچہ بہت سے مردوں نے خوشی خوشی یہ پگڑی خود ہی عورت کے حوالے کردی ہے تبھی تو اکبر غیرتِ قومی سے زمیں میں گڑ گیا تھا۔

تاہم ابھی زیادہ تر مرد اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہیں لیکن مرد و زن کی اس کشمکش میں معاشرتی نظام تباہ ہورہا ہے۔ آزادی کے نام پر جہاں لڑکیاں گھروں سے بھاگ رہی ہیں وہاں غیرت کے نام پر قتل بھی ہورہے ہیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان سلامتی کی راہ اگر کوئی ہے، تو صرف قرآن و سنت ہے۔ آیئے قرآن کے دامنِ رحمت میں پناہ ڈھونڈیں اور اپنی عورت کو اُس کے اصل مقام سے آشنا کرنے کے لیے کم از کم سورۃ النور، سورۃ الاحزاب، سورۃ الاعراف اور سورۃ النساء کے احکامات ضرور پڑھوائیں۔

ooo

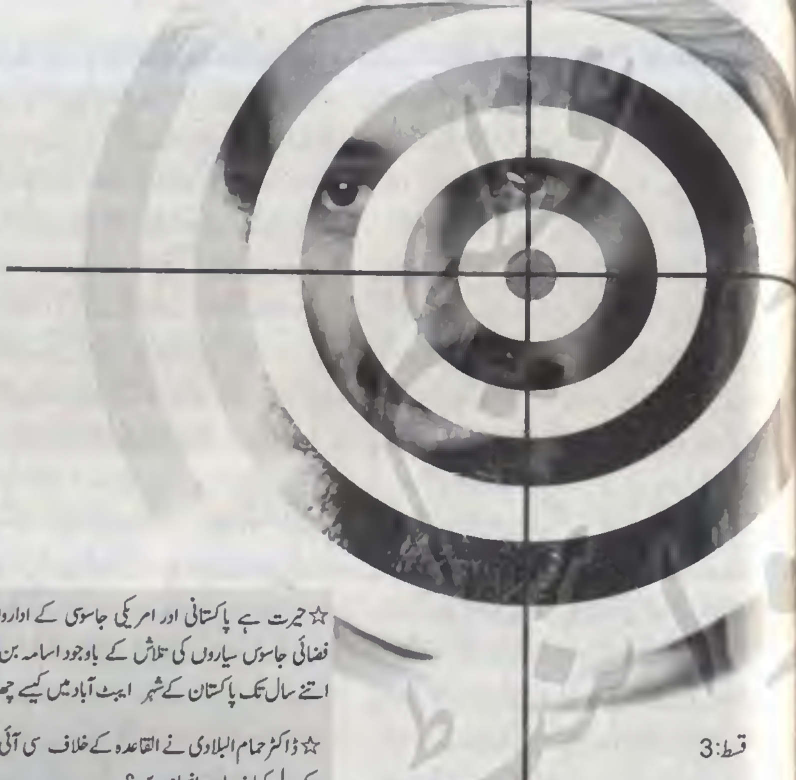

قسط:3

انکل سام کے ہاتھوں
اُسامہ بن لادن کا گرم تعاقب

پروفیسر محمد فاروق قریشی

☆ حیرت ہے پاکستانی اور امریکی جاسوسی کے اداروں اور فضائی جاسوس سیاروں کی تلاش کے باوجود اسامہ بن لادن اتنے سال تک پاکستان کے شہر ایبٹ آباد میں کیسے چھپا رہا؟

☆ ڈاکٹر حمام البلادی نے القاعدہ کے خلاف سی آئی اے کے لیے کیا خدمات انجام دیں؟

☆ سی آئی اے نے اسامہ بن لادن کے پیغام رساں الکویتی تک کیسے رسائی حاصل کی؟

☆ صدر اوباما نے القاعدہ کے خاتمے کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے؟

☆ کیا سی آئی اے کو یقین تھا کہ اسامہ بن لادن ایبٹ آباد کمپاؤنڈ میں موجود ہے؟

☆ اسامہ بن لادن کی تلاش میں ڈاکٹر شکیل آفریدی نے کیا کردار ادا کیا؟

بعدازاں ابوفراج اللبی کو سی آئی اے کے حوالے کر دیا گیا۔ ان کی پرتشدد تفتیش کے نتیجے میں اس نے بتایا کہ خالد شیخ محمد کی گرفتاری کے بعد اُسامہ نے اُسے اس کی جگہ ترقی دے کر القاعدہ کا نمبر تین عہدیدار بنا دیا۔ اُس وقت وہ ایبٹ آباد میں مقیم تھا اور یہ کہ اُسامہ کا پیغام رساں کویتی نہیں بلکہ مولوی عبدالخالق جان ہے۔ سی آئی اے کی تحقیق کے مطابق یہ فرضی نام گھڑا گیا تھا۔ القاعدہ کے ایک ماریطینی محبوس نے تفتیشی افسروں کو بتایا کہ کویتی تورابورا میں مارا جاچکا ہے۔

کیا القاعدہ کے ان چاروں قیدیوں پر پرتشدد تفتیش کے ذریعے اُسامہ بن لادن کا کوئی سراغ ملا؟ نہیں۔ لیکن ان کی فراہم کردہ اور دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات سے اہم افراد کی شناخت اور کچھ ضروری سوالوں کے جوابات حاصل ہوئے۔ انہی کی بنیاد پر سی آئی اے نے بن لادن تک پہنچنے کے لیے کویتی پر توجہ مرکوز کی۔ لیکن کویتی کو تلاش کرنا آسان کام نہ تھا کیونکہ وہ بہت سے عرفی ناموں سے جانا جاتا تھا۔ مثلاً محمد خان، شیخ ابواحمد جبکہ اس کا حقیقی نام ابراہیم سعید احمد شاید اس کے افرادِ خانہ کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ امریکی صدر بدستور اُسامہ بن لادن کے بارے میں متجسس رہتا تھا اور سی آئی اے کے ذمہ داران سے اس بارے میں استفسار کرتا رہتا تھا۔ سی آئی اے کا ڈائریکٹر مائیکل ہیڈن کا کہنا ہے کہ اس نے صدر بش کو بتایا کہ سی آئی اے اُسامہ کے پیغام رساں کے ذریعے اُسامہ تک پہنچنے کے منصوبے پر کام کر رہی ہے اور انہوں نے ممکنہ پیغام رساں کویتی پر تمام تر توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔

سی آئی اے کے مرکزی دفتر میں کوئی دو درجن مرد و خواتین بن لادن کی تلاش کے منصوبے پر ایک عشرے سے کام کر رہے تھے اور کچھ کے تو بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ گزرتے ہوئے برسوں کے ساتھ یہ سب تجربہ کار افراد شدت کے ساتھ اس احساس کا شکار ہوتے جا رہے تھے کہ وہ 9/11 کے حملوں کو روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے اور تین ہزار انسانی جانوں کے زیاں سے بچا جا سکتا تھا۔ اگرچہ سی آئی اے نے انتظامیہ کو اپریل سے اگست 2001ء کے دوران بار بار القاعدہ کی طرف سے پیش آنے والے ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا تھا لیکن بش انتظامیہ کے نیشنل سیکیورٹی کے افسران نے ان کی وارننگ کو نظرانداز کیے رکھا۔ اس طرح یہ ایک لحاظ سے انتظامیہ کی ناکامی بھی تھی کہ خطرے کا بروقت تدارک کرنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے۔ تاہم سی آئی اے اپنی کوتاہیوں سے بری الذمہ نہیں ہو سکتی تھی خصوصاً جنوری 2000ء میں ملائشیا میں منعقدہ دہشت گردوں کی چوٹی کی میٹنگ میں شمولیت کے بعد نواف الہاظمی اور خالد المہدار کو مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان کی کوئی نگرانی کی گئی۔ اس کے نتیجے میں وہ نہ صرف امریکا واپس آئے بلکہ انہوں نے کرائے پر گھر لیا، بینک اکاؤنٹ کھولے، ڈرائیونگ لائسنس لیا، کار خریدی اور ہوابازی کے مقامی اسکول میں پرواز کی تربیت حاصل کی اور بعدازاں 9/11 کو امریکی ایئرلائن کی فلائٹ 77 پر ہائی جیکروں کے طور پر سوار ہوئے جو پینٹاگون سے ٹکرائی جس میں 189 افراد ہلاکت کا شکار ہوئے۔

اس طرح 9/11 کے حملے سی آئی اے، ایف بی آئی اور انتظامیہ کی مشترکہ ناکامی تھی لیکن غفلت کے ذمہ داران کے خلاف 9/11 کے بعد کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

اوباما بجنگ آمد

11 ستمبر 2001ء منگل کی صبح اِلی نائے ریاست کا سینیٹر باراک اوباما شکاگو میں سفر کرتے ہوئے اپنی گاڑی کے ریڈیو پر خبر سنتا ہے کہ ایک ہوائی جہاز ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ٹاور کے ساتھ ٹکرا گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور طیارہ دوسرے ٹاور کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے۔ باہر سڑکوں پر لوگ سراسیمگی کا شکار ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ کہیں اگلا نشانہ شکاگو کا سیئرز ٹاور نہ بننے والا ہو۔ اپنے دفتر پہنچ کر اوباما نے ٹی وی سکرین پر جھلکیاں دیکھیں۔ ایک ہوائی جہاز کو لوہے اور شیشے کے ڈھانچے میں گھستے ہوئے، مرد عورتیں کھڑکیوں کے ساتھ لٹکتے ہوئے، پھر نیچے چھلانگیں لگاتے ہوئے، بلند ٹاور ملبے کا ڈھیر بنتے ہوئے۔

چھے سال بعد امریکی سینیٹر اوباما امریکا کے صدارتی الیکشن کے لیے ڈیموکریٹک پارٹی کی نامزدگی کی دوڑ میں ہیلری کلنٹن کو افسانوی طرز کا چیلنج دے رہا تھا۔ اگرچہ بہت سے عوامل ہیلری کلنٹن کے حق میں تھے لیکن اوباما نے اپنی علمی قابلیت، تدبر اور پرسکون مزاج کی بدولت نوجوانوں میں تبدیلی کی تڑپ پیدا کر دی جو اس کی انتخابی مہم میں شامل ہو گئے۔ کچھ لوگوں کو امید تھی کہ اوباما کی جیت امریکی قوم کے اجتماعی احساسِ گناہ یعنی کالے لوگوں کی غلامی اور نسلی امتیاز کا کفارہ ثابت ہو گی۔ 17 جولائی 2007ء کو القاعدہ کے حالات پر ”خفیہ معلومات کا جائزہ“ (NIE) ذرائع ابلاغ کو جاری کیا گیا۔ اس القاعدہ نے پاکستان کے قبائلی علاقے ’فاٹا‘ میں محفوظ ٹھکانہ بنا لیا تھا اور مختلف کارروائیوں کے لیے افرادی قوت اور قیادت تیار کر لی تھی۔ 2005ء میں القاعدہ نے برطانوی تاریخ کے بدترین دہشت گرد حملے میں 52 مسافروں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اگلے سال سات برطانوی، امریکی اور کینیڈین ہوائی جہازوں کو مائع دھماکا خیز مواد سے اُڑانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ خفیہ معلومات کی جائزہ رپورٹ شائع کرنے کا مقصد یہ بتانا تھا کہ القاعدہ ایک دفعہ پھر مغرب میں حملے کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکی ہے اور پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر پرویز مشرف کو پاکستان کے قبائلی علاقوں میں موجود جنگجو گروپوں سے معاملات طے کرنے کی چھوٹ دینے کی امریکی پالیسی تبدیل ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ کی اشاعت کے دو ہفتے بعد ولسن سنٹر واشنگٹن میں تقریر کرتے ہوئے اوباما نے بش انتظامیہ کی عراق پالیسی پر تنقید کی اور کہا کہ اُنھوں نے عراق جنگ میں بہت سارے وسائل جھونک دیے ہیں اور القاعدہ کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ پرویز مشرف کے لیے بش کی نرم پالیسی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اوباما نے زور دے کر کہا ”اگر ہمارے پاس ٹھوس خفیہ معلومات ہیں اور صدر مشرف کوئی اقدام نہیں کرتا، تو ہم کریں گے۔ میں ایسے دہشت گردوں کو فوجی طاقت استعمال کرتے وہاں سے اٹھانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا جو امریکا کے لیے براہ راست خطرہ بن سکتے ہیں۔“ لیکن دارالحکومت واشنگٹن میں بہت سے سیاسی پنڈت اوباما کو نیشنل سیکیورٹی معاملات پر ناتجربہ کار سمجھتے تھے اور مقابلتاً ری پبلکن امیدوار جان مکین اور ڈیموکریٹک امیدوار ہیلری کلنٹن کو تجربہ کار اور قابل

اعتماد سمجھتے تھے۔

ولسن سنٹر کی تقریر کے ایک ہفتہ بعد شکاگو میں ڈیموکریٹک صدارتی امیدواروں میں مباحثے کے دوران سینیٹر ڈاڈ کرسٹوفر نے اوباما کے پاکستان پر یک طرفہ حملے کو ''غیر ذمہ دارانہ'' اور ہیلری کلنٹن نے ''بڑی غلطی'' قرار دیا۔ اس کے جواب میں اوباما نے کہا کہ تباہ کن عراق جنگ کے حامی مجھ پر تنقید کر رہے ہیں کہ میں نے دہشت گردی کے خلاف صحیح میدان جنگ منتخب کیا ہے۔ ریپبلکن صدارتی امیدوار مِٹ رومنی اور ڈیموکریٹک صدارتی امیدوار جان مکین دونوں نے امریکا کے اتحادی پاکستان پر بمباری کرنے کی اوباما کی تجویز پر اُس کی ناتجربہ کاری کا مذاق اُڑایا۔ صدارتی امیدوار نامزد ہو جانے پر اوباما نے جان مکین پر جوابی وار کیا ''جان مکین جہنم کے دروازے تک بن لادن کا تعاقب کرنا چاہتا ہے لیکن اس غار تک نہیں جانا چاہتا جہاں وہ رہتا ہے۔'' صدرِ امریکا کا حلف اٹھانے کے بعد اوباما نے عراق جنگ کی مخالفت کے باوجود اعلان کیا ''امریکا القاعدہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف جنگ کرے گا۔''

صدر کا عہدہ سنبھالتے ہی فوجی طاقت کے فوری استعمال کی پالیسی اختیار کی۔ حلف برداری کے تین دن بعد 23 جنوری 2009ء کو نیشنل سیکیورٹی کونسل کے پہلے اجلاس میں اوباما نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ڈرون حملوں کی جارحانہ مہم کی منظوری دی اور اسی دن شمالی اور جنوبی وزیرستان میں سی آئی اے نے دو ڈرون حملے کیے جن میں دس جنگجو اور ایک درجن شہری ہلاک ہوئے۔ بل کلنٹن کو بوسنیا میں نسل کشی روکنے کے لیے مداخلت کا فیصلہ کرنے میں دو سال لگے جبکہ 2011ء میں لیبیا میں جہاں معمر قذافی اپنے ہی عوام کا قتل عام کرنے کی دھمکی دے رہا تھا' اوباما کو مداخلت کرنے میں صرف چند ہفتے لگے۔ 9 دسمبر 2009ء کو اوباما نے ناروے جا کر ''بین الاقوامی سفارتکاری کو مضبوط کرنے کی غیر معمولی کوششوں'' کے صلے میں امن کا نوبل پرائز وصول کیا۔ ان کا انعام دینے والوں کی بدحواسی ملاحظہ کریں کہ اوباما نے صرف ایک ہفتہ پہلے افغان جنگ کو تیز کر دیا۔ افغانستان میں امریکی فوجیوں کی تعداد میں تیس ہزار کا اضافہ کر کے کل تعداد کو دوگنا کر دیا۔ پاکستانی طالبان اور القاعدہ کے ٹھکانوں پر 45 ڈرون حملوں کی اجازت دی جس کے نتیجے میں القاعدہ اور اُزبک تنظیموں کے سینکڑوں جنگجو اور پاکستانی طالبان راہنما بیت اللہ محسود اور کچھ شہری مارے گئے۔ اوباما کی سینکڑوں افراد کو بغیر مقدمہ چلائے قتل کرنے کی پالیسی کو انسانی حقوق گروپوں اور دوسروں نے خاموشی سے قبول کر لیا۔ جبکہ انہوں نے گوانتانامو میں بغیر قانونی تقاضوں کو پورا کیے پرتشدد تفتیش پر بش انتظامیہ کی پرزور مذمت کی تھی۔

اوباما نے نوبل پرائز وصول کرنے کے موقع پر اپنی تقریر میں افغانستان اور پاکستان میں القاعدہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف زمینی جنگ اور ڈرون حملوں کا دفاع کیا۔ اس نے اعلان کیا ''مجھے دنیا کا سامنا کرنا ہے جیسی یہ اس وقت ہے اور میں امریکی عوام کو درپیش دھمکیوں کے سامنے خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔

کوئی غلطی نہ کرو کیونکہ دنیا میں برائی موجود ہے۔ عدم تشدد کی تحریک ہٹلر کی افواج کو نہیں روک سکتی تھی۔ مذاکرات القاعدہ کے راہنماؤں کو قائل نہیں کر سکتے کہ

وہ ہتھیار ڈال دیں۔ یہ کہنا کہ بعض اوقات طاقت کا استعمال ضروری ہوتا ہے' امن پر شک کرنے کے مترادف نہیں ہے۔ یہ انسان کی کمزوریوں' عقل کی محدودیت اور تاریخ کا ادراک کرنے کی بات ہے۔''

اوباما یہ سمجھتا تھا کہ محض اس لیے کہ بش انتظامیہ نے القاعدہ کی دھمکی میں مبالغہ آرائی کی' اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ دھمکی محض ایک سراب ہے۔ اوباما کی حلف برداری کی تقریب میں صومالیہ کی جنگجو تنظیم ''الشباب'' کی طرف سے دہشت گردی کا شدید خطرہ موجود تھا۔ بش اور اوباما انتظامیہ کی توجہ اس ممکنہ خطرے پر مرکوز رہی جب تک کہ تقریب پرامن طور پر اختتام پذیر نہ ہوگئی۔ لیکن یہ اوباما اور اس کی نیشنل سیکیورٹی ٹیم کے لیے ایک یاددہانی تھی کہ ان کی نئی انتظامیہ کو دہشت گردی پر بہت زیادہ توجہ دینا ہوگی۔

اوباما القاعدہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور تباہ کر دینے کے لیے پرعزم تھا اور اس کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ اُسامہ بن لادن کو ختم کر دینے کا عمل تیز کیا جائے۔ صدارت سنبھالنے کے تھوڑے عرصے بعد اوباما نے اوول آفس میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر لیون پینیٹا کو زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں اُسامہ بن لادن کو پکڑنے کی کوششوں کو دوچند کرنے کی ضرورت ہے۔ سی آئی اے افسران سے جب پوچھا گیا کہ اُسامہ بن لادن کہاں ہے تو اُن کا جواب تھا کہ ان کے پاس کوئی واضح سراغ نہیں لیکن یہ کہ وہ پاکستان میں کسی جگہ موجود ہے۔ 2 جون 2009ء کو صدر اوباما نے لیون پینیٹا کو اوول آفس میں بلایا اور ایک میمو پر دستخط کیے جس میں درج تھا ''میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ مجھے تیس دن کے اندر بن لادن کو پکڑنے اور انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کے لیے ایک تفصیلی لائحہ عمل پیش کیا جائے۔'' پینیٹا کی ذمہ داری تھی کہ وہ بن لادن کا ایک بیٹا سعد بن لادن جس نے پچھلے کئی سال ایران میں زیرِحراست گزارے تھے اور اب رہا ہو کر پاکستان کے شمالی قبائلی علاقوں میں پہنچ چکا تھا۔ خیال تھا کہ وہ اپنے باپ سے ملنے کی کوشش کرے گا اور سی آئی اے کو اُسامہ تک پہنچا دے گا۔ لیکن سی آئی اے اہلکاروں کی پھرتیوں کے باعث وہ ایک ڈرون حملے میں مارا گیا اور اُسامہ تک پہنچنے کا امکان ختم ہوگیا۔ اس اثنا میں ایک اردنی ڈاکٹر حمام البلاوی نے سی آئی اے کو پاکستان میں القاعدہ قیادت کی جاسوسی کرنے کی پیش کش کی۔ سی آئی اے نے اس کو ایک سنہری ذریعہ سمجھا اور نومبر 2009ء میں پینیٹا نے صدر کو بھی یہ اُمید افزا خبر سنائی۔ ستمبر 2009ء میں ایک افغان امریکی شہری نجیب اللہ زازی ڈینور سے نیویارک آیا اور اس نے نیویارک کی زیرِزمین ریل سب وے میں انتہائی تباہ کن بم دھماکوں کا پروگرام بنایا لیکن ایف بی آئی کی ژرف نگاہی نے اس کی نشاندہی کر لی اور 11 ستمبر 2009ء کو اسے مین ہٹن سے گرفتار کر لیا گیا۔ زازی القاعدہ کا حقیقی کارکن تھا جو چھے سال سے امریکا میں رہ رہا تھا۔ اس کے لیپ ٹاپ پر دھماکا خیز مواد کی تکنیکی معلومات موجود تھیں جو اس نے پاکستان کی ایک تربیت گاہ سے حاصل کی تھیں۔

2009ء کرسمس کے دن ایک 23 سالہ نوجوان نائجیرین عمر فاروق عبدالمطلب ڈیٹرائٹ جانے والی نارتھ ویسٹ ایئرلائن کی فلائٹ نمبر 253 پر ایمسٹرڈم سے سوار ہوا۔ جہاں پر 300 مسافر اور عملے کے

ارکان سوار تھے۔ ڈیٹرائٹ کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے انڈرویئر میں چھپایا ہوا بم نکالا اور اس کو اڑانے کی کوشش کی لیکن اپنی ناتجربہ کاری اور مسافروں کی مداخلت کی وجہ سے ناکام رہا۔ گرفتاری کے بعد اس نے بتایا کہ یہ دھماکا خیز چیز اس نے یمن سے حاصل کی تھی۔ اگر وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتا، تو نہ صرف امریکی معیشت کو زبردست نقصان پہنچتا بلکہ اوباما کی صدارت پر بھی کاری ضرب لگتی۔ ان حالات میں اردنی ڈاکٹر بلادی کی اہمیت بہت بڑھ گئی جس نے 9/11 کے بعد القاعدہ کی اعلیٰ قیادت کے اندر داخل ہو جانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس لیے افغانستان کے علاقہ خوست میں متعین سی آئی اے کی سٹیشن چیف جینیفر میتھیوز کو اس پر نظر رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ میتھیوز نے ڈاکٹر بلادی کو ملاقات کے لیے مرکز میں بلانے کا انتظام کیا اور دفتر میں داخلے کے وقت اس کی تلاشی بھی نہ لی گئی۔ جب ان کی اس سے ملاقات ہوئی، تو اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بم کو دھماکے سے اڑا دیا جس میں میتھیوز سمیت سی آئی اے کے چھ افسران ہلاک ہو گئے۔ سی آئی اے کے لیے یہ ایک بڑا مہلک حملہ تھا۔ درحقیقت اردنی ڈاکٹر القاعدہ کی جاسوسی نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ ان کا باقاعدہ بھرتی کیا ہوا کارکن تھا۔

خوست کے اس خودکش بم دھماکے کے بعد سی آئی اے انتظامیہ کا القاعدہ نمبر ایک اور نمبر دو کو ڈھونڈ نکالنے کا عزم اور پختہ ہو گیا۔ ان کا ردعمل اتنا شدید تھا کہ انہوں نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں طالبان اور القاعدہ کے ٹھکانوں پر گیارہ ڈرون حملے کروائے جن میں ساٹھ سے زیادہ جنگجو ہلاک ہو گئے۔ اس کے ایک ہفتے کے اندر القاعدہ کی یمن شاخ نے امریکا میں محوِ پرواز ایک امریکی طیارے کو مار گرایا اور پاکستانی جنگجوؤں نے سی آئی اے کے سات ملازمین کو ہلاک کر دیا۔ یہ واقعات سی آئی اے کو شدید یاددہانی کروا رہے تھے کہ القاعدہ کی قیادت کو ختم کرنا کتنا ضروری تھا۔ اس لیے اب زیادہ جاسوس' زیادہ ڈرون جہاز اور مواصلاتی سیارے دستیاب تھے۔ نیشنل سیکیورٹی کونسل میں پاکستانی امور کی ڈائریکٹر شمیلہ چودھری کہتی ہے کہ 2010ء میں تقریباً 400 امریکی افسران پاکستان کا ویزہ لینے کے خواہشمند تھے۔ یقیناً یہ سب افراد سفارتکار تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستانی سیاستدان پورے یقین سے کہہ رہے تھے کہ اُسامہ بن لادن پاکستان میں نہیں۔ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور وزیر داخلہ رحمان ملک دونوں نے اُسامہ کی پاکستان میں موجودگی سے انکار کیا۔ ان تردیدوں کے باوجود سی آئی اے کے لیے پاکستان میں اپنے عملے کی تعداد میں اضافہ کرنا ناگزیر تھا۔ یکم مئی 2010ء کو پاکستانی نژاد امریکی شہری فیصل شہزاد نے نیویارک شہر کے ٹائمز سکوائر میں اپنی گاڑی کو دھماکے سے اڑانے کی ناکام کوشش کی۔ لیون پینیٹا نے پاکستانی حکومت کو پیغام دیا کہ اگر پاکستانی دہشت گردوں نے امریکا میں کسی قسم کا حملہ کیا تو سخت کارروائی کی جائے گی۔ صدر آصف علی زرداری نے جواب دیا کہ مذکورہ ملزم امریکی شہری ہے آپ اپنے گھر کو ٹھیک کیوں نہیں کرتے۔ تاہم اوباما نے پاکستان میں سی آئی اے اہلکاروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا اور ڈرون حملوں میں شدت پیدا کر دی۔ جو لوگ اوباما کو امن پسند اور جنگ مخالف سمجھتے تھے

ان کو بہت مایوسی ہوئی کیونکہ 2010ء تک امریکا بیک وقت چھے مسلم ممالک میں کسی نہ کسی قسم کی جنگی کارروائیوں میں مصروف تھا۔

کھوج کا عمل

2007ء میں سی آئی اے کو ایک تیسرے ملک کی وساطت سے الکویتی کے حقیقی نام ابراہیم سعید احمد کا علم ہوا۔ سی آئی اے کو پاکستان کی ملٹری ایجنسی کے ساتھ مشترکہ آپریشن کے ذریعے القاعدہ سے تعلق رکھنے والے مشتبہ فون نمبروں کا پتا چلا۔ اِن میں الکویتی کا نمبر بھی تھا۔ الکویتی کے فون نمبر پر آنے والی ایک کال کے ذریعے سی آئی اے کو تصدیق ہو گئی کہ وہ اسامہ بن لادن کے ساتھ کام کر رہا ہے اور یہ بھی کہ وہ پاکستان کے شمال مغربی علاقے میں کہیں موجود ہے۔ اسامہ کا یہ پیغام رساں سخت حفاظتی اقدامات کے تحت فون استعمال کرتا تھا جو اکثر و بیشتر بند رہتا تھا۔ وہ پشاور کے اردگرد یا ایبٹ آباد سے ایک گھنٹے کی مسافت کے فاصلے پر اس میں بیٹری ڈالتا اور اس کو استعمال کرتا اور پھر بند کر دیتا تھا۔ وہ اپنا فون ایبٹ آباد میں، جہاں وہ اسامہ بن لادن کے ساتھ رہتا تھا کبھی استعمال نہیں کرتا تھا۔ اگست 2010ء میں سی آئی اے کے ایک پاکستانی اہلکار نے الکویتی کو پشاور میں اپنی سفید سوزوکی جیپ میں دیکھ لیا اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے دو گھنٹے میں ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی حویلی تک پہنچ گیا۔ ایبٹ آباد کی بلند چار دیواری والی قلعہ نما حویلی فوراً سی آئی اے کی توجہ کا مرکز بن گئی کیونکہ وہاں ٹیلی فون یا انٹرنیٹ کا کنکشن بھی موجود نہ تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کے مکین عوام الناس سے الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔ کسی کو بھی یقین نہ آتا تھا کہ پیغام رساں حقیقتاً اسامہ بن لادن کے ساتھ ہی رہائش پذیر ہو گا۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر لیون پینیٹا نے اس دریافت میں گہری دلچسپی لی اور اس کے اندرونی حالات معلوم کرنے کا حکم دیا۔ اس نے صدر اوباما اور قومی سیکیورٹی کے مشیروں کو اوول آفس میں اس اہم پیش قدمی کے بارے میں بتایا اور کہا ''ہم ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کے پیغام رساں الکویتی کی رہائش گاہ تک پہنچ گئے ہیں اور اس بات کا امکان ہے کہ اسامہ بن لادن بھی وہیں مقیم ہو۔'' آیندہ مہینوں میں لیون پینیٹا نے ایجنسی کے افسروں پر شدید دباؤ ڈالا کہ وہ جاسوسی کا ہر ممکن حربہ آزمائیں اور معلوم کریں کہ حویلی کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے تجویز کیا کہ حویلی کے اندر موجود درخت کے اوپر کیمرا لگا دیا جائے لیکن اس سے بیشتر کہ یہ پرخطر کام کیا جاتا، الکویتی نے اس درخت کو ہی کاٹ ڈالا۔

سی آئی اے کے افسران نے حویلی کے مکینوں کی سرگرمیاں معلوم کرنے کے لیے درجنوں تجاویز پیش کیں جن میں سے چند ایک پر توجہ مرکوز کی گئی۔ ان میں سے ایک منصوبہ یہ تھا کہ ایک پاکستانی ڈاکٹر شکیل آفریدی کو ایبٹ آباد میں بیماریوں سے بچاؤ کے انجکشن لگانے کی فرضی مہم کا انچارج بنایا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ حویلی کے مکینوں کے خون کے نمونے حاصل کر لیے جائیں اور ان کا بن لادن فیملی کے ڈی این اے سے موازنہ کیا جائے۔ ڈاکٹر شکیل آفریدی نے نرسوں اور ہیلتھ ورکرز کو بھرتی کیا اور ہیپاٹائٹس بی کی انسدادی مہم چلائی لیکن اس کے کارکن بن لادن کے بچوں یا بڑوں کے خون کا نمونہ

حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ (بعد میں پاکستانی حکام نے ڈاکٹر شکیل آفریدی پر غداری کا مقدمہ چلایا۔ عدالت نے اس کو قید کی سزا دی جو وہ اس وقت بھگت رہا ہے) سی آئی اے میں اس بات پر مکمل اتفاق رائے پایا جاتا تھا کہ القاعدہ راہنما تک پہنچنے کا کلیدی ذریعہ الکویتی ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے کویتی کی حرکات وسکنات اور نقل وحمل پر توجہ مرکوز رکھی گئی۔ سی آئی اے کے ذمہ داران کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ کویتی ابھی تک القاعدہ کا رکن ہے لیکن ان کو ابھی یہ یقین نہیں تھا کہ اسامہ بن لادن اسی حویلی میں مقیم ہے۔ حویلی کے مکینوں نے اپنے بارے میں مکمل رازداری قائم رکھی ہوئی تھی۔ کسی کو حویلی کے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی اور اس کی تعمیر کا نقشہ ایسا تھا کہ باہر کسی بھی زاویے سے اس کی جاسوسی اور نگرانی ممکن نہ تھی۔ حویلی میں آنے جانے والوں کی نگرانی سے متعلقہ افسران کو یہ یقین ہوتا جارہا تھا کہ اسامہ کی فیملی وہاں مقیم ہے۔ لیکن کیا اسامہ بھی وہاں موجود ہے اس کا جواب دینا مشکل تھا۔ الکویتی اور اس کے بھائی کے کنبے پاکستان کے دوسرے شہروں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ حویلی کے بارے میں کئی باتیں بڑی پریشان کن تھیں۔ مثلاً یہ پاکستان کی سب سے بڑی ملٹری اکیڈمی سے ایک میل سے بھی کم فاصلے پر واقع تھی۔ نیز یہ کوئی چھوٹی گمنام عمارت کے بجائے بلند و بالا قلعہ نما بلڈنگ تھی۔ مزید یہ کہ اس میں بہت سے بچے رہتے تھے جن میں ایک بنام محمد ایبٹ آباد سے باہر کسی مذہبی اسکول میں پڑھتا تھا۔ حویلی میں تقریباً بیس بالغ افراد اور بہت سے بچے رہتے تھے جو بن لادن کے لیے سیکیورٹی رسک ہوسکتا تھا۔ حویلی میں رہنے والے دوسرے افراد اپنے موبائل فون بغیر کسی حفاظتی احتیاط کے آزادانہ استعمال کرتے تھے۔ مزید برآں یہ کوئی دور افتادہ قبائلی علاقہ نہ تھا بلکہ ایک اہم شہر تھا جہاں پولیس بھی موجود تھی۔ سی آئی اے کے افسران ان سب باتوں پر غور وفکر اور ان کا تجزیہ کرتے تھے۔ 2010ء کے موسم خزاں میں سی آئی اے نے ایبٹ آباد میں اپنے اہلکاروں کے لیے ایک عام لیکن محفوظ گھر قائم کرلیا جہاں سے وہ اس حویلی کا مستقل مشاہدہ اور جائزہ لیتے رہتے تھے۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ حویلی میں الکویتی اور اس کے بھائی کے کنبوں کے علاوہ ایک تیسرا خاندان بھی موجود ہے جو تین عورتوں، ایک مرد اور نو بچوں پر مشتمل ہے۔ یہ خاندان کبھی باہر نہیں جاتا۔ یہ علامات اسامہ بن لادن کے خاندان کے تشکیلی ڈھانچے سے مناسبت رکھتی تھیں۔ ایبٹ آباد میں سی آئی اے کے جاسوسوں کی موجودگی اور خلائی جاسوسی سیاروں کے باوجود ان کو کبھی اسامہ بن لادن واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔ زیادہ سے زیادہ ان کو ایک عام آدمی حویلی میں سیر کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا لیکن اس کا بھی چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن سی آئی اے متعدد افسران کو یقین ہو چلا تھا کہ اسامہ بن لادن اسی حویلی میں موجود ہے۔ اگرچہ ان کے پاس براہ راست کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا۔

2011ء کے آغاز تک ایبٹ آباد حویلی میں اسامہ بن لادن کے قیام کا معمول جوں کا توں رہا۔ اس دوران امریکی جاسوسوں نے یہ دریافت کیا کہ حویلی میں ایک کتا موجود ہے۔ اوباما کے نیشنل سیکیورٹی

ایڈوائزر ڈینس مکڈونو نے اس خبر کو مایوس کن قرار دیا کیونکہ معزز مسلمان عموماً کتا گھر میں نہیں رکھتے۔ تاہم مشرق وسطیٰ کے معاملات کے ماہرین نے نشاندہی کی کہ اسامہ بن لادن نے نوے کے عشرے میں سوڈان کے دارالحکومت خرطوم میں قیام کے دوران کتے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود کسی کو یقینی طور پر معلوم نہیں تھا کہ اسامہ وہاں موجود ہے۔

اسامہ بن لادن کے آخری سال

اسامہ بن لادن ایبٹ آباد میں حویلی میں نہ صرف اپنے بیوی بچوں اور کتابوں کے ساتھ مصروف رہتا تھا بلکہ وہ خود ایک کمیں گاہ میں محبوس، اپنے مفرور اہلکاروں کے ذریعے القاعدہ کو چلانے کا سنجیدہ اور مشکل کام بھی سرانجام دیتا تھا۔ اس کی اپنی تنظیم پر گرفت اور بیرونی دنیا سے رابطہ صرف ابواحمد الکویتی کے ذریعے قائم تھا۔ کویتی اور اس کا بھائی ابرار دونوں تیس بتیس سالہ جوان تھے اور اسامہ فیملی کی بیرون خانہ تمام ذمہ داریاں انجام دیتے تھے۔ وہ ارشد خان اور طارق خان کے عرفی نام استعمال کرتے ہوئے مقامی جنرل اسٹور سے خورونوش کا سامان خریدتے تھے، بن لادن کے بچوں کو بغرض علاج ڈاکٹر کے پاس لے جاتے تھے۔ وہ اپنی سفید سوزوکی جیپ اور سرخ وین میں خاموشی سے آتے جاتے تھے۔ بعض اوقات وہ مقامی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے لیکن کسی سے گپ شپ نہیں کرتے تھے۔ پوچھنے والوں کو بتاتے کہ ان کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار ہے۔ درحقیقت ان کا باپ پاکستان کے شمالی علاقے سے پانچ عشرے قبل کویت منتقل ہوگیا تھا اس لیے یہ عربی اور پشتو زبانیں بول سکتے تھے۔ ان کا پاکستان کے پشتو بولنے والے لوگوں میں گھل مل جانا بہت آسان تھا۔ ان خصوصیات کی وجہ سے دونوں بھائی اسامہ بن لادن کے لیے ناگزیر بن چکے تھے۔ انھوں نے اسامہ بن لادن کے ہاتھ پر وفاداری کی بیعت کر رکھی تھی اور بن لادن کے حکم کی بے چون وچرا تعمیل کرتے تھے۔ کویتی اسامہ کے خطوط اور کمپیوٹر فلیش ڈرائیوز جن میں القاعدہ راہنماؤں کے لیے ہدایات ہوتی تھیں، پشاور پہنچاتا تھا جو بعد میں افغان سرحد کے قریب قبائلی علاقے میں پہنچائی جاتی تھیں۔ جہاں بہت سے القاعدہ راہنما رہتے تھے۔ وفادار کویتی کے ذریعے وہ اپنی تنظیم کے عراق، صومالیہ اور یمن جیسے ممالک میں مقامی وابستگان سے رابطہ قائم رکھتا تھا۔ ان معاملات میں وہ اپنی بیویوں کو کبھی ملوث نہیں کرتا تھا۔

بن لادن کا اپنی تنظیم کے لوگوں کے ساتھ بڑا رابطہ کار لیبیا کا چالیس سالہ جنگجو عطیہ عبدالرحمٰن تھا۔ اسامہ بن لادن اپنے معتمد نائب مصری ڈاکٹر ایمن الظواہری سے بھی زیادہ عبدالرحمٰن کے ساتھ رابطے میں رہتا تھا۔ 9/11 کے بعد بھی اسامہ بن لادن اپنے لوگوں کے فیصلے اور تنظیم کے منصوبوں میں دوسروں سے زیادہ دخیل تھا۔ رحمان کے توسط سے اسامہ بن لادن شمالی افریقا کی تنظیم ''اسلامی مغرب میں القاعدہ''، صومالی جنگجو گروپ ''الشباب'' عراق اور جزیرہ نما عرب میں القاعدہ گروپوں تک اپنی ہدایات پہنچاتا تھا۔ 9/11 کے بعد رحمان نے القاعدہ کے پرانے راہنما سیف العدم کے ساتھ اسامہ بن لادن کے رابطہ کی بحالی کے لیے ایران کا سفر بھی کیا جہاں وہ بن لادن کے بیوی بچوں کے ساتھ زیرِ حراست تھا۔ عراق میں القاعدہ کے بے رحم راہنما

مصعب الزرقاوی نے شیعہ آبادی کے خلاف وحشیانہ انتقامی کارروائیاں کیں اور عمان میں امریکی ہوٹلوں پر بھی بم حملے کروائے جن میں اردنی شہری بڑی تعداد میں مارے گئے۔ وہ یرغمال بنائے گئے لوگوں کے خود سر قلم کرتا اور اس کی ویڈیو ٹیپس تیار کرواتا تاکہ ان کو انٹرنیٹ پر دنیا بھر میں پھیلایا جاسکے۔ رحمان نے اس کو ایک طویل خط لکھا اور زور دیا کہ وہ اسامہ بن لادن کی ہدایات پر عمل کرے اور ظالمانہ کارروائیوں سے باز رہے کیونکہ ان کے سبب عرب دنیا میں القاعدہ کی شہرت کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اکتوبر 2007ء اسامہ بن لادن نے عراق میں القاعدہ کی کارروائیوں کی مذمت کی اور عوام سے معذرت کی۔ اسامہ بن لادن اب بھی امریکا کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے عراق، الجزائر اور یمن کے ساتھیوں کو پیغامات بھیجے کہ امریکا کے بڑے شہروں شکاگو، نیویارک، واشنگٹن اور لاس اینجلس اور آئل ٹینکروں پر حملے کیے جائیں اور صدر اوباما اور جنرل ڈیوڈ پیٹریاس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جائے۔ اس کی تنظیم کے راہنماؤں نے اس کو بتایا کہ القاعدہ کے پاس اتنے بڑے منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے وسائل دستیاب نہیں۔ اس لیے افغانستان میں لڑنے والے امریکی فوجیوں پر توجہ مرکوز رکھنے پر اکتفا کیا جائے۔ اسامہ نے ان پر زور دیا کہ غیر مسلم امریکی شہریوں کو بھرتی کیا جائے جو اپنی حکومت کے مخالف ہیں۔ چنانچہ انھوں نے لانگ آئی لینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک بیروزگار ہسپانوی امریکی کو بھرتی کرلیا اور اس نے 2008ء میں افغانستان کے ایک امریکی اڈے پر حملہ کرنے میں حصہ لیا۔ بعد میں اس کو پاکستانی فوجیوں نے گرفتار کرلیا اور امریکیوں کے حوالے کردیا۔

القاعدہ کی مشکلات میں اضافہ ہوگیا جب صدر بش نے 2004ء میں پاکستان کے قبائلی علاقوں پر ڈرون حملے شروع کیے لیکن صدر اوباما نے ڈرون حملوں کی مہم کو وسیع کیا اور اس میں شدت پیدا کر دی۔ بش کے دور میں چالیس دن میں ایک حملہ کیا جاتا تھا۔ اوباما کے زمانے پر چار دن میں ایک حملہ ہونے لگا جس سے القاعدہ کا تیسرے درجے کا بہت ہی اہم راہنما مصطفیٰ ابوالیزید میراں شاہ کے ایک گھر میں اپنے بیوی بچوں سمیت مارا گیا۔ پچھلے دو سال میں ان ڈرون حملوں کے نتیجے میں اسامہ اپنے بہت سے اہم جنگجو راہنماؤں سے محروم ہو چکا تھا اور القاعدہ کے مالی وسائل بھی بہت کم ہو گئے تھے۔ القاعدہ کے حملے پاکستان کے اندر بھی جاری تھے اور دو مواقع پر صدر مشرف کو قتل کرنے کی ناکام کوشش بھی کی گئی۔ اسامہ بن لادن اپنی میڈیا مہم پر خصوصی توجہ دیتا تھا اور بڑے طمطراق سے ویڈیو ٹیپس جاری کرتا تھا۔ 2007ء میں بن لادن نے آدھ گھنٹے کی ایک ویڈیو جاری کی جس میں اس نے پہلی مرتبہ امریکی صدر کے انداز میں امریکی عوام سے خطاب کیا۔ اس نے کسی حملے کی دھمکی نہیں دی بلکہ اس کے بجائے امریکیوں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی اور امریکا کے خلاف مختلف الزامات عائد کرتے ہوئے اس کی تباہی کی دعا کی۔ یہ ویڈیو ٹیپس القاعدہ کے میڈیا ونگ کے ذریعے الجزائر ٹی وی چینل کو بھیجی جاتی تھیں یا انٹرنیٹ کی جہادی ویب سائٹس پر جاری کردی جاتی تھیں۔ ان ٹیپس میں وہ

عالم اسلام کے اندر پیش آنے والے اہم واقعات پر اظہار خیال کرتا تھا اور غیر پسندیدہ چیزوں کی مذمت کرتا تھا۔ 2008ء میں اس نے ڈنمارک کے اخبار کی طرف سے پیغمبر محمد ﷺ کے خاکے شائع کرنے پر مذمت کی اور تین ماہ بعد اسلام آباد میں ڈینش سفارت خانے پر خودکش بم حملہ بھی کیا گیا جس میں چھ افراد ہلاک ہوئے۔ مارچ 2009ء میں اس نے غزہ پر اسرائیلی حملے کی مذمت کی۔ 2010ء میں اس نے فرانس کی حکومت کی طرف سے مسلم خواتین پر حجاب کی پابندی کو تنقید کا نشانہ بنایا اور انتقام کی دھمکی دی۔ 2010ء کے موسم گرما میں وسیع پیمانے پر سیلاب کی تباہ کاریوں اور دو کروڑ پاکستانیوں کے بے گھر ہو جانے کے بعد بحالی کے کام میں حکومت کی نااہلی اور سست روی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ مسلم دنیا کے ہر مسئلے پر فصاحت کے ساتھ گفتگو کرتا تھا لیکن 2011ء میں تیونس اور مصر میں آمرانہ حکومتوں کے خاتمے اور انقلابی تبدیلیوں پر اس کی خاموشی معنی خیز تھی کیونکہ عرب ریاستوں میں آمریت کا خاتمہ اس کا نصب العین تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ نئی انقلابی حکومتوں کی جدوجہد میں کسی نے القاعدہ اور اسامہ بن لادن کو اپنا ہیرو قرار نہیں دیا نہ ہی عوام الناس نے طالبان طرز کی حکومت کا مطالبہ کیا۔ تاہم اپریل 2011ء میں اس نے آڈیو ٹیپ میں اپنا پیغام ریکارڈ کروایا جس میں اس نے تیونس اور مصر کے انقلابات کو خوش آئند کہا اور زور دیا کہ ان ملکوں میں شریعت کے قانون کا نفاذ کیا جائے۔ لیکن 2011ء تک مسلم دنیا میں اسامہ بن لادن کی ایک مجاہد اور انقلابی شہرت ماند پڑ چکی تھی اور القاعدہ کی طرف سے مسلمان شہریوں کا قتل عام اس کی ساکھ کے لیے مہلک ثابت ہوا۔

حملے کا طریقہ کار

جون 2011ء میں عمر پاٹک نام کا ایک انڈونیشی جنگجو پاکستانی سیکیورٹی اہلکاروں کے ہاتھوں ایبٹ آباد میں گرفتار ہوگیا۔ یہ شخص 2002ء میں بالی کے بم دھماکوں کے منصوبہ سازوں میں سے ایک تھا، جن پر القاعدہ کی طرف سے لاکھوں ڈالر کی ادائی کی گئی تھی۔ سی آئی اے کے تجزیہ کاروں کے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ اس نے جنوبی مشرقی ایشیا سے ایبٹ آباد کا سفر کیوں کیا۔ تقریباً اس وقت فضا سے زمینی جائزے کے قومی ادارے نے ایبٹ آباد حویلی کے نقشے کی ایک کمپیوٹر فائل تیار کرلی جس کی مدد سے اس کا چھوٹا ماڈل تیار کیا گیا جو سی آئی اے اور وائٹ ہاؤس میں دلچسپی کا باعث اور فوجی حکمت عملی کے نقطہ نظر سے مددگار ثابت ہوا۔ گزشتہ سالوں میں امریکی انتظامیہ نے جائنٹ اسپیشل آپریشنز کمانڈ (JSOC) کے نام سے بری، بحری اور ہوائی فوج اور میرینز (Marines) کے منتخب دستوں پر مشتمل ایک چھوٹی خودمختار فورس تشکیل دی اس فورس کے ارکان کو دنیا کی سخت ترین جسمانی تربیت کے ذریعے تیار کیا جاتا تھا اور ان کو سیل (Seal) کہا جاتا تھا۔ نہایت ہی ماہر فوجی افسر کو ان کا کمانڈر مقرر کیا جاتا تھا۔ اس فورس نے عراق اور افغانستان میں نہایت اہم مشن سرانجام دیے۔ جنوری 2011ء میں اس فورس کا کمانڈر وائس ایڈمرل ولیم میک ریون تھا۔ وہ عراق میں اہم خدمات انجام دے چکا تھا۔ وہ جسمانی طور پر مضبوط، بہادر اور نڈر تھا۔ جنرل پیٹریاس نے اسے اپنا ہیڈ

کوارٹر افغانستان منتقل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ افغانستان میں اسپیشل آپریشنز کی تعداد میں اضافہ ہو گیا جس میں بے شمار طالبان کمانڈرز کو ہلاک کر دیا گیا۔ میک ریون نے جلد ہی سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کا دورہ کیا جہاں مائیکل موریل نے اسے ایبٹ آباد حویلی کی صورت حال سمجھائی۔ میک ریون نے کہا ''ہمارے لیے اس قسم کے آپریشن معمول کی بات ہے لیکن چونکہ یہ جگہ پاکستان کی سرحد کے 150 میل اندر واقع ہے اس لیے اس میں نقل و حمل کا مسئلہ ہے اور دوسرا اس حملے کی وضاحت کرنے کا سیاسی پہلو ہے جو اس کو پیچیدہ بناتا ہے۔'' اس نے سی آئی اے کے ساتھ مل کر آپریشن کی تفصیلات طے کرنے میں اتفاق کیا۔ اس آپریشن کی ساری تفصیلات سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں طے کی گئیں۔ کیونکہ یہ ایک انتہائی خفیہ منصوبہ تھا۔ ایبٹ آباد کمپاؤنڈ کو AC1 کہا جاتا تھا اور آپریشن کا کوڈ ''اٹلانٹک سٹی'' مقرر کیا گیا۔ آپریشن کی کمان صدر اوباما سے لیون پینیٹا اور میک ریون تک جاتی تھی۔ میک ریون اسپیشل آپریشنز پر ایک کتاب کا مصنف تھا۔ اس نے کیلیفورنیا کے نیول پوسٹ گریجوایٹ اسکول میں اسپیشل آپریشنز کا نصاب مرتب کیا۔ 9/11 کے بعد بش انتظامیہ کی انسداد دہشت گردی کی حکمت عملی کا خالق بھی میک ریون ہی تھا۔

اوباما کی نیشنل سیکیورٹی ٹیم اور میک ریون نے آپریشن اٹلانٹک سٹی کی چار مختلف صورتوں پر گہرا غور و خوض کیا۔ بی ٹو بمبار ہوائی جہاز کے ذریعے ایبٹ آباد حویلی کو تباہ کر دیا جائے۔ ڈرون حملہ، پاکستانیوں کو بتائے بغیر سیل ٹیم اسپیشل آپریشن کرے یا پاکستانیوں کے اشتراک سے آپریشن کیا جائے۔ سوال یہ پیدا ہو رہا تھا کہ اس معاملے میں پاکستانیوں کو کس حد تک شامل کار کیا جائے یا اس کو مکمل طور پر خفیہ رکھا جائے۔ چونکہ یہ حملہ پاکستان کے کافی اندر کیا جانا تھا اس میں پاکستان کی زمینی اور فضائی حدود اور خودمختاری کی خلاف ورزی کا ہونا لازمی تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ پاکستان امریکا کا برائے نام ہی سہی اتحادی تو تھا اور پاکستان نے امریکا کے ساتھ مل کر افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف اور بعد میں طالبان اور القاعدہ کے خلاف بہت سے مشترکہ آپریشن کیے تھے۔ اس آپریشن کا فیصلہ اس وقت اور بھی مشکل ہو گیا جب ایک امریکی شہری اور سی آئی اے کے رکن ریمنڈ ڈیوس نے دن دہاڑے لاہور شہر میں دو پاکستانیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اور پاکستان امریکا تعلقات جو ہمیشہ شکوک و شبہات اور دوطرفہ الزامات کی زد میں رہے ہیں، اپنی بدترین حالت کو پہنچ گئے۔ افغانستان میں جنگ لڑنے والے نیٹو اور امریکی فوجیوں کے لیے تمام تر خوراک، اسلحہ اور ساز و سامان کی رسد پاکستان کے زمینی اور فضائی راستوں سے پہنچائی جا رہی تھی۔ ایبٹ آباد آپریشن کے نتیجے میں سپلائی کے ان راستوں کے بند ہو جانے کے امکان سے نمٹنے کے لیے امریکی انتظامیہ نے وسطی ایشیا کی ریاستوں اور روس کے راستے نادرن ڈسٹری بیوشن نیٹ ورک قائم کرنے کے معاہدے کیے۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ ہیلری کلنٹن نے واضح کر دیا کہ بن لادن کو پکڑنے کی خاطر پاک امریکا تعلقات کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ پھر بھی پاکستانیوں کو اطلاع دیے بغیر آپریشن پر پاکستانی افواج کے زمینی یا فضائی ردعمل کو خارج از امکان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

14 مارچ 2011ء کو اوباما کی جنگی کابینہ کا وائٹ ہاؤس میں اجلاس ہوا۔ انھوں نے صدر اوباما کے ساتھ مجوزہ آپریشن کی چاروں صورتوں (آپشنز) پر تبادلہ خیال کیا اور ان کے دوران پیش آنے والی مشکلات، کامیابی اور ناکامی کے امکانات، انسانی جانوں کے نقصانات، پاکستانی اداروں کی طرف سے مزاحمت اور سیاسی اثرات کا تفصیلاً جائزہ لیا گیا۔ کئی ملاقاتوں اور لمبی چوڑی بحث تمحیص کے بعد بالآخر فیصلہ کر لیا گیا کہ اسپیشل آپریشنز فورس کی سیل ٹیم ہیلی کاپٹرز کے ذریعے یک طرفہ حملہ کرے گی اور پاکستانیوں کو مناسب وقت پر بتا دیا جائے گا۔ 16 مارچ کو سی آئی اے کنٹریکٹر ریمنڈ ڈیوس کو ایک سمجھوتے کے ذریعے رہا کروا لیا گیا جس کی رو سے امریکی حکومت نے دونوں مقتولوں کے وارثان کو خون بہا کے طور پر بیس لاکھ ڈالر ادا کیے۔ یہ واقعہ امریکی انتظامیہ کے لیے اطمینان بخش اور خوش آیند تھا اور اب پہلے سے زیادہ یکسوئی کے ساتھ ایبٹ آباد آپریشن پر عملدرآمد کر سکتے تھے۔ امریکی انتظامیہ کے سامنے یہ چیلنج بھی موجود تھا کہ پاکستانی سیکیورٹی اداروں کی طرف سے مزاحمت کی صورت میں حملہ آور ٹیم کا لائحہ عمل کیا ہو گا اور یہ بھی کہ پاکستانی حکام کو اس آپریشن کے بارے میں کیسے مطمئن کیا جائے گا۔ صدر اوباما نے آپریشن کے کمانڈر میک ریون کو بتایا کہ حملہ آور امریکی ٹیم کی حفاظت واپسی کو یقینی بنایا جائے کیونکہ پاکستانیوں کو خوشنودی سے امریکی فوجیوں کی زندگی زیادہ اہم ہے۔ اپریل کے مہینے میں سیل ٹیم نے شمالی کیرولینا کے جنگلات میں ایک ایکڑ میں واقع ایبٹ آباد کمپاؤنڈ ماڈل پر آپریشن کی ریہرسل شروع کر دی تھی۔ آپریشن میں چور نظری ہیلی کاپٹر استعمال کیے جانے تھے جن کو پاکستانی رڈارڈ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ سیلز کمانڈو ہر قسم کی مخالفت صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ اور میک ریون نے حملہ آوروں کی تقویت کے لیے کئی امدادی ٹیمیں تشکیل دے رکھی تھیں۔ یہ ایک تہ در تہ منصوبہ تھا۔ اپریل کے وسط میں سیل ٹیموں نے نیوادا کے صحراؤں میں دوبارہ آپریشن کی مشق کی۔ جب سیل ٹیم کے ارکان کو ٹارگٹ کے بارے میں بتایا گیا تو ان کے جوش و خروش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ پینٹاگان نے سیل ٹیم کو آپریشن مکمل کرنے کے لیے تیس منٹ کا ٹائم دیا تھا کیونکہ اس کے بعد پاکستانی فوج کی مداخلت کا خطرہ موجود تھا۔ لیکن امریکی افواج کے چیئرمین جائنٹ چیفس آف اسٹاف ایڈمرل مائیک ملن کو میک ریون اور اس کی ٹیم پر مکمل اعتماد تھا۔ میک ریون نے اوباما اور اس کی جنگی کابینہ کو بتایا ''ہم یہ آپریشن کر سکتے ہیں۔ ہم جو کچھ عراق اور افغانستان میں روزانہ رات کو کر رہے ہیں یہ ان سے زیادہ مشکل نہیں۔ اس کا مشکل حصہ پاکستان کی خودمختاری اور اس کی فضائی حدود میں اتنی دیر تک پرواز کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔''

چونکہ ایبٹ آباد آپریشن کی منصوبہ بندی مکمل ہو چکی تھی، وائٹ ہاؤس کے ذمہ داران نے غور و خوض شروع کر دیا کہ اگر اسامہ بن لادن پکڑا گیا تو وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم تھا کیونکہ بن لادن متعدد بار اعلان کر چکا تھا کہ وہ امریکا کا قیدی بننے سے شہادت کی موت کو ترجیح دے گا۔ ایک اسلامی ویب سائٹ پر اس نے لکھا ''میں آزادی کی زندگی گزارنے کا عہد کر چکا ہوں۔ خواہ موت کا ذائقہ ہی کیوں نہ ہو ذلت اور دھوکے کی موت نہیں مرنا چاہتا۔''

○○○

جوشِ عقیدت
کی بے ادبی یا زبان و بیان سے بے خبری

ڈاکٹر طاہر مسعود

اختر عباس صاحب!

برادر السلام و علیکم! اُردو ڈائجسٹ کا ستمبر 2013ء کی اشاعت میں مجددِ عصر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بارے میں میاں محمد عبدالشکور صاحب (سابق صدر پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین) کا تاثراتی مضمون نظر نواز ہوا۔ مضمون معلومات افزا تھا، مولانا کی بابت دو ایک نئے واقعات کا علم ہوا۔ تاہم مضمون لکھتے ہوئے مضمون نگار سے ایک ایسی ''بے ادبی'' سرزد ہوئی جو جوشِ عقیدت نیز بے احتیاطی اور زبان وادب سے بے خبری کا شاخسانہ تھی۔

فاضل مضمون نگار قارئین کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ سید مودودیؒ مرحوم کی شخصیت میں خود پسندی اور انانیت اس درجہ ناپید تھی کہ انھوں نے اپنی کسی تصنیف میں کبھی ''میں'' کا صیغہ استعمال نہیں کیا۔ انھیں اُس حقیقت کی طرف مولانا مرحوم ہی نے متوجہ کیا، یہ فرما کر:

''میں نے زندگی بھر اس بات کی کوشش کی ہے کہ میری سوچ، گفتگو یا تحریر میں کبھی ''میں'' غالب نہ آئے۔

کبھی اس طرح کے علمی وادبی خطوط لکھنے کا بھی دستور تھا۔ بڑے بڑے ادیبوں کے مابین رسائل اور اخبارات میں کسی لفظ، شعر، مصرع یا حوالہ سے شروع ہونے والی بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی۔ علمی، ادبی، ذاتی، سیاسی ایسی بحث کے کئی حوالے بن جاتے۔ جہاں جلی کٹی سنائی جاتیں وہاں نئے نئے تنقیدی گوشے اور زاویے بھی سامنے آجاتے۔ پھر زمانے کی رفتار تیز ہوگئی۔ اچھا لکھنے پڑھنے والوں نے اپنے علاوہ دوسروں کو پڑھنا ہی کم کردیا۔ پڑھ لیا تو کسی کمی بیشی پر گرفت کرنے کو تحصیل حاصل جان کر فراموش کردیا۔ کراچی یونیورسٹی کے صدر شعبہ ابلاغیات ڈاکٹر طاہر مسعود نے بڑے دنوں بعد بڑوں کی یاد تازہ کی ہے۔ ممکن ہے کچھ پڑھنے والوں کو ان کے کچھ دلائل سے اِتفاق نہ ہو مگر انھوں نے بڑی محبت سے اپنا خط بغیر قطع و برید کے چھاپنے پر اصرار کیا۔ تو ہمیں بھی فرمائش پوری کرنے میں کوئی باک نہیں تھا۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہوئی ہے کہ اصل مضمون نگار جن کے جملوں پر گرفت ہو رہی ہے۔ انھوں نے فاضل مکتوب نگار کے اعتراض کو محبت سے قبول کرتے ہوئے کہا ''ہاں لگتا ہے سہو ہوگیا۔'' یوں ان کی اعلیٰ ظرفی کے باعث ہم اس موضوع پر کسی طویل علمی اور سیاسی بحث سے صاف بچ گئے ہیں۔ (ایڈیٹر)

ضرورت پڑنے پر بھی میں یہ کبھی نہیں کہتا کہ ''میں نے یہ سوچا ہے'' یا ''میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔''

مولانا کا یہ ارشاد مضمون نگار کے دل میں اُتر گیا۔ چنانچہ انھوں نے اس نقطۂ نگاہ سے مولانا کی متعدد تصانیف کو چھان ڈالا اور واقعی انھیں کسی تصنیف میں بھی ''میں'' کا صیغہ باوجود تلاش و بسیار کے نہیں ملا۔ یہاں تک تو بات بالکل ٹھیک تھی۔ ظاہر ہے کہ مولانا کے تقویٰ اور بے نفسی سے تو دشمن بھی انکار نہیں کرتے۔ مجھے دُکھ اور تکلیف اس وقت پہنچی، جب فاضل مضمون نگار نے برِاعظم پاک و ہند کے دو چوٹی کے علما مولانا سید ابوالحسن ندویؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی دو کتابوں کے حوالے سے یہ رقم فرمایا کہ یہ کتابیں ''میں'' کی تکرار سے بھری پڑی ہیں اور پھر یہ نتیجہ بھی اپنی فاضلانہ تحقیق سے برآمد کیا کہ:

''بیسویں صدی کے مفکرین میں یہ اعزاز صرف مولانا مودودیؒ کو حاصل تھا کہ لاکھوں صفحات پر پھیلی ان کی تحریروں میں آپ ''میں'' کہیں تلاش نہ کرسکیں گے۔''

میں اس ''محققانہ نتیجے'' کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا، البتہ مولانا ندوی (علی میاں) اور مولانا آزاد کی تصانیف کی بابت فاضل نگار نے قارئین میں جو غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

1۔ فاضل مضمون نگار نے علی میاں کی جس کتاب میں بقول ان کے ہر ہر صفحے پر ''میں'' وغالب بابا، اس کا نام انھوں نے ''مسلمانوں کے زوال سے دنیا نے کیا کھویا'' بتایا ہے۔ نہایت ادب سے فاضل مضمون نگار کی خدمت میں عرض ہے کہ علی میاں کی جملہ تصانیف میں اس عنوان کی کسی تصنیف کا وجود پایا ہی نہیں جاتا۔ غالباً موصوف کا اشارہ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'' کی جانب ہے، جو اپنے موضوع پر ایک بے مثال کتاب ہے۔ فاضل مبصر کو شاید یہ سن کر خوشی ہوگی کی علی میاں کو اس موضوع پر کتاب لکھنے کا مشورہ مولانا مرحوم ہی نے دیا تھا، بلکہ عنوان بھی ان ہی کا تجویز کردہ تھا۔ مذکورہ کتاب اس وقت میرے سامنے ہے اور میں اس کے ''ہر ہر صفحے'' پر ''میں'' کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہوں۔ نہ صرف یہ کہ ''میں'' کا لفظ کتاب میں ناپید ہے بلکہ دیباچے میں جہاں ''میں'' لکھنا ناگزیر تھا، وہاں بھی علی میاں نے ''میں'' کے بجائے مصنف کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ غالباً فاضل مضمون نگار کے حافظے نے دھوکا کھایا ہے کہ کتاب پڑھے ہوئے بھی انھیں مدت ہوچکی تھی۔ لیکن مضمون لکھتے وقت کیا مضائقہ تھا اگر وہ اصل کتاب سے احتیاطاً ہی رجوع کرلیتے۔

2۔ اب آیئے مولانا ابوالکلام آزاد کی شہرۂ آفاق کتاب ''غبارِ خاطر'' کی طرف۔ یہ کتاب اصلاً مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زنداں سے حکیم محمد اجمل خاں کو تحریر کیے ہیں۔ خطوط بالعموم مکتوب نگار کے خیالات و احساسات اور واقعات و تاثرات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ ان میں ''میں'' کا استعمال ضرورت بھی ہے، مجبوری بھی کہ اسلوب کا حُسن نکھرتا ہی ''میں'' کی تکرار سے ہے۔ مرزا غالب کے خطوط اس کی زندہ مثال ہیں۔ مرزا نے خطوط کو ایک نئے اور منفرد طرزِ نگارش سے روشناس کرایا اور جس سے غالب فہمی میں نقادوں اور محققوں کو روشنی ملی۔ کاش کہ فاضل مضمون نگار ادب کے طالب علم ہوتے یا زبان دانی سے انھیں معمولی سا بھی علاقہ ہوتا، تو یہ ماننے میں انھیں تامل نہ ہوتا کہ ''میں'' کے استعمال کے معنی لازماً انانیت کے اظہار کے نہیں ہوتے، اگر ہوتے تو پھر آپ بیتی (Autobiography) کی صنف میں شرفا دلچسپی ہی نہ لیتے، کیونکہ اس میں ''میں'' کی داستانِ حیات کے سوا ہوتا ہی کیا ہے؟ طبیعت کو مار کر ایک سخن گسترانہ دلیل دیتا ہوں کہ اگر ''میں'' اتنا ہی گرا پڑا لفظ ہے تو یہ فرمایئے کہ دورِ

ایوبی میں جماعت اسلامی کے جس جلسے میں گولی چلی، بھگدڑ مچی اور مولانا مودودیؒ جو تقریر کرنے کھڑے ہو چکے تھے، کسی نے انھیں بیٹھ جانے کا مشورہ دیا، تو انھوں نے یہ کیوں فرمایا کہ:

"اگر میں بیٹھ گیا، تو پھر کھڑا کون رہے گا؟"

کیا اس فقرے میں ایک بہت بڑا "میں" نہیں پایا جاتا؟ اور اگر کوئی ہرزہ سرا اس تاریخی فقرے سے یہ معنی اخذ کرنا چاہے کہ اس میں تو اپنی شجاعت کا دعویٰ کیا گیا ہے تو آپ ایسے ہرزہ سرا کو کیا کہہ کر قائل کریں گے؟

اصل ماجرا یہ ہے کہ ہمارے محترم میاں عبدالشکور صاحب تک اسلام کی حقانیت کا پیغام مولانا کے لٹریچر کے ذریعے پہنچا اور انھوں نے اسی پر اکتفا کر لیا۔ اگر مولانا مرحوم کی بلند پایہ بلکہ مجددانہ تصانیف کے مطالعہ کے بعد وہ دیگر علمائے کرام بالخصوص مولانا آزاد کی تصنیف قرآن اور ان کے انقلابی رسالے "الہلال" کا جس کے ذریعے انھوں نے مسلمانانِ ہند میں قرآنی روح بیدار کرنے کی کوشش کی، بہ نظرِ غائر مطالعہ کر لیتے تو ان پر منکشف ہوتا کہ مولانا مودودیؒ کی ذہنی و فکری نشوونما میں ان کے پیشِ رو مولانا آزاد کے "الہلال" اور ان کے لٹریچر کا کتنا قابل لحاظ حصہ ہے۔ تب کیا خبر کہ وہ مولانا مرحوم ہی کی نسبت سے سہی، تھوڑا بہت احترام و ادب مولانا آزاد کا بھی کر لیتے۔ بدقسمتی سے مولانا مرحوم کے مداحوں میں ایک حلقہ ایسے کٹر جذباتی عقیدت مندوں کا پایا جاتا ہے جو مولانا کی عظمت کے سحر میں اس طرح گرفتار ہے کہ دوسرے علما اور ان کی دینی و تصنیفی خدمات کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ ان میں بعض تو وہ بھی ہیں جو مولانا مرحوم کو قد آور ثابت کرنے کے لیے دیگر علمائے حق کے قد و قامت میں تراش خراش کر دینا فریضہ تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ اس معاملے میں مولانا کا اپنا نقطۂ نظر اکابر پرستی کے خلاف تھا۔ انھوں نے علمائے اسلام، مجددین، مصلحین کسی کی بھی عقیدت نہیں پائی، ان بزرگوں کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ان کی اصلاحی مساعی میں کوئی کمی اور کوتاہی پائی، تو برملا اس پر تنقید کی۔ مولانا جس شخصیت پرستی کے مخالف تھے اور جس کی وجہ سے انھیں بارہا ہدفِ ملامت بنایا گیا، کیسی عجیب اور ستم ظریفی کی بات ہے کہ ان کے پیروکاروں کا ایک طبقہ مولانا کی آزادانہ غور و فکر اور جرأت مندانہ تنقید و احتساب کی قائم کردہ روایت سے نہ صرف انحراف کر رہا ہے بلکہ اس نے پرستش کے لیے مولانا مرحوم کا بُت بنالیا ہے حالانکہ خاکسار کی رائے میں سید مودودیؒ کی عظمت اس بے ادب اور غیر محتاط عقیدت کی محتاج نہیں۔ تاریخِ اسلام میں ان کا مقام متعین ہو چکا ہے اور یہ وہ مقام ہے جس پر رشک ہی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں، جیسا کہ ان کے بعض عقیدت مند سمجھتے اور بلاتکلف کہتے ہیں کہ اس دور میں اسلام کی سچی خدمت صرف مولانا ہی نے کی ہے۔ بھلا اس سے کس کو انکار ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے پر مولانا مرحوم کی فکر کے اثرات سب سے گہرے ہیں، لیکن تصویر کا ایک رُخ یہ بھی ہے، جس کی طرف ایک مرتبہ مفسرِ قرآن اور جید عالمِ دین مفتی محمد شفیعؒ نے اشارہ کیا تھا۔

آپ نے فرمایا تھا: نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کو ذہنی لحاظ سے مولانا مودودیؒ کی تحریریں جتنا متاثر کرتی ہیں، ہم علما کی تحریریں نہیں کرتیں۔ لیکن دین کی طرف رجوع کرنے کے بعد اس نوجوان طبقے کی اخلاقی تربیت جیسی ہم علما کر سکتے ہیں، مولانا مودودیؒ نہیں کرتے۔ یہ بات سچ ہے اور اس کا ایک ثبوت برادر محترم میاں محمد عبدالشکور کا مضمون ہے۔ خط کی طوالت کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

والسلام

نیاز مند طاہر مسعود (کراچی) 29 ستمبر 2013ء

ooo

اپنے بچوں کو یوں بے عزت نہ کریں

ان بچیوں کو ذہین اور ماؤں کے دل پر بوجھ بننے سے پہلے سمجھیے اور سنبھالیے

نوشین ناز
نیوٹریشنسٹ / ماہرِ غذائیات

صحت نہیں وزن کم کریں

اس نامہربان خاتون نے اپنی مریضہ بیٹی میری کو اِس طرح میرے سامنے کوسا کہ میں ان کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر سے بے جان سی بیٹھی ہوں۔ کلینک میں بظاہر ہر چیز نارمل ہے، مگر میرے اندر تک اداسی اتری ہوئی ہے۔

20 سال کی لڑکی کا زار و قطار رونا اور غلط باتیں کرنا یقیناً نارمل نہیں تھا۔ اور اُس کے جانے کے بعد میں کتنی دیر سوچتی رہی کہ کیا اس کی ماں کا رویہ نارمل تھا؟

"نارمل رویے نارمل لوگوں کو پیدا کرتے ہیں۔ یہ بے نمازی، جہنمی لڑکی زندگی اور زمین پر بوجھ ہے۔ اپنے موٹاپے تک کو دور نہیں کر سکتی نہ اپنی آخرت کو بچا سکتی ہے!"

یہ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

آپ سب سے میری گزارش ہے نماز بے شک ہمارا مذہبی فریضہ ہے، اس کی باقاعدگی خود پر اور اپنے بچوں پر ضرور لازم کریں۔ لیکن انھیں یوں بے عزت نہ کریں۔

بچے آٹھ بجے کا ڈراما اپنی ماؤں کے ساتھ بیٹھ کر باقاعدگی سے دیکھ سکتے ہیں، تو نماز کے لیے بھی انھی کے ساتھ باقاعدگی سے اٹھ سکتے ہیں۔ انھیں یہ سوچ کر نماز پڑھائیں کہ اس مبارک عمل میں مکمل صحت اور بہت ساری بیماریوں کا حل ہے۔

ہمارے بچے سست اور بے دین ہو رہے ہیں۔ جب انھیں نماز پڑھنے کے لیے کہو، تو پہلے ہی دن اس قدر پریشان کرتے ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ نماز انھیں بوجھ محسوس ہوتی ہے، تو ہم اگلے دن کے لیے اس مشقت سے ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں۔

کیوں......؟ کیا ہمیں یہ کام اتنی سی کوشش کے بعد مشکل لگنے لگتا ہے؟

غور کیجیے تو پلے گروپ میں بچے کو اسکول روتا دھوتا چھوڑ کر آنا مشکل ہوتا ہے۔ اُس کی خاطر اسکول میں اُس کی کلاس کے باہر سارا دِن بیٹھے رہنا آسان نہیں۔ ہمیں یہ ساری تکلیفیں، تو قبول ہوتی ہیں۔

اُسے دنیا دار بنانے کی پڑھائی کے لیے ہم اتنی تکلیف خوشی سے اٹھا لیتے ہیں لیکن دین نجات کے پلے گروپ میں جب داخل نہیں کرواتے، تکلیف نہیں اٹھاتے، تو وہ ساری زندگی کے لیے اِس اسکول اور اُس کی تعلیم سے محروم ہو جاتا ہے۔ پھر جب ہم اُس کے بڑے ہونے پر اُسے زبردستی نماز پر کھینچتے ہیں، تو وہ بالکل نہیں مانتا اور ہم غصہ دکھاتے ہیں کہ یہ تو پیدا ہی بے دین ہوا ہے۔ یہ سست ہے۔ یہ تو فرشتوں کے گھر شیطان پیدا ہو گیا۔

میرے نزدیک یہ ناانصافی ہے۔ یہ جملے میں نے اپنے کانوں سے سُنے ہیں اور اُس لڑکی کو نماز اور اللہ سے بے حد دُور اور خفا دیکھا ہے۔ وہ زندگی کی ہر دوڑ میں ناکام ہے۔ وزن زیادہ ہے شکل وصورت یا Looks اچھی نہیں رہیں۔ تین مرتبہ ایف اے میں فیل ہو چکی ہے۔ کوئی تعلیم نہیں ہے۔ متحرک نہیں ہے، تو گھر کے کاموں میں سلیقہ مند نہیں ہے۔ ہر وقت کی ڈانٹ کھا کھا کر وہ بد اخلاق، چڑ چڑی اور بدزبان ہو چکی ہے۔ یعنی حاصل جمع یہ وہ ایک بے کار لڑکی ہے۔ زمین پر اور اپنی والدہ کے دِل پر بڑا بوجھ ہے!

اور اُسے یہ بوجھ بنایا کس نے؟

کیا وہ ہمیشہ ایسے تھی؟ کیا وہ ایک بوجھ کی طرح ہی پیدا ہوئی تھی؟

ہماری زبان اور رویہ ہمارے بچوں کو بنا بھی دیتا ہے اور بگاڑ بھی دیتا ہے۔

آپ کو اگر سختی کرنی تھی تو پلے گروپ سے کرنی چاہیے تھی۔ تب تو لاڈ سے اس پہلو کی طرف آپ کا دھیان ہی نہیں گیا اور اب ایک دم سے اُس بچی کی کایا کیسے پلٹے گی؟ جس سختی اور پابندی سے اُسے اسکول روانہ کیا تھا۔ کیا اُس سختی سے نماز کے لیے کھڑا کیا تھا؟ جس سختی سے اسکول کے امتحان کی تیاری کروائی تھی کیا اُس سختی سے روزے رکھوائے تھے؟ جس سختی سے اُس کے میرٹ کے لیے اکیڈمیاں بدلی تھیں۔ کیا اُس سختی سے اُسے اللہ کے قریب کرنے کی حکمت عملیاں بنائیں تھیں؟

بچی غلط نہیں ہے!

یہ میں آپ کو بہت کھل کر بتا رہی ہوں۔ آپ کو آخری عمر میں بخار چڑھ گیا سب اچھا اچھا کرنے کا، تو اپنے بچوں کو اب کوئی جادو کی چھڑی سے نہیں بدل سکتی سوائے..... نرم خوئی، مسلسل محنت اور دُعا سے جو سب سے بہترین پہلا اور آخری حل ہے۔

میرا دِل بہت بھرا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے جسم سے جان نکلی ہوئی ہے۔ جو کچھ وہ لڑکی نعوذ باللہ، اللہ کے متعلق بولی تھی کوئی بے دین ہی بولتا ہے۔ جب دنیا میں وہ کسی اتھارٹی کو نہیں مانتی، تو کچھ بھی کہہ سکتی ہے۔

وہ کسی اُوپر والے کا وجود ماننے کو تیار نہیں ہے۔

کیونکہ اُس بتانے والی نے صرف اللہ کو جلاد بنا کر پیش کیا جو جہنم تیار کر کے بیٹھا ہے اور سب کو پکڑ پکڑ کر جہنم میں پھینکنے جا رہا ہے۔

لاحول وَلا۔ اگر وہ ربّ کریم ایسا ہوتا تو جس طرح کے ہمارے اعمال ہیں اگلے وقت کا کھانا بھی نصیب نہ ہو۔

یہ اُس کی رحمت ہے کہ بُرے اعمال کے باوجود ہم اچھا کھاتے پیتے ہیں۔ بہترین پُر آسائش گھروں میں رہتے ہیں اور طبعی عمریں پوری کرتے ہیں۔

اللہ رحمٰن ہے کریم ہے! توبہ کرنے والا اُسے بے حد پسند ہے۔ وہ جہنم کا داروغہ نہیں ہے کہ ہر شخص کو اُٹھا کر اس

میں پھینک دے اور رحمٰن کریم تو ہر پل انتظار کرتا ہے کہ میرا بندہ اچھا سوچ بھی لے، تو میں اُسے اجر دوں گا۔

وہ اپنے بندوں اور بندیوں سے بے حد پیار کرتا ہے۔ اللہ بس پیار ہی پیار اور رحیم ہی رحیم ہے۔ پلٹ آنے والوں کے لیے وہ ہمیشہ رحمٰن رہا ہے۔ پیاری چھوٹی بہن تم دِل نہ چھوٹا کرو۔ بس ایک بار زندگی اور اللہ کی طرف پلٹ آنا۔ دیکھنا دُنیا کا ہر اچھا معجزہ تمھارے لیے ہے۔ تمھاری زندگی میں اچھا ہونا باقی ہے۔ کیونکہ تمھارا پلٹنا باقی ہے۔

......☆......

20 سال میں 60 کلو وزن

سوال: میں 20 سال کی ہوں اور میرا وزن 60kg ہے اور قد 5 فٹ سات انچ ہے۔ میں اپنا وزن کم کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے مشورہ دیں۔ (سحرش، کوئٹہ)

جواب: آپ کا ٹارگٹ 8 کلو ہے جو دو ماہ میں آسانی سے حاصل ہو جائے گا۔ آپ Six meals پورے دِن میں کھائیں، آپ نے تین Main meal لینے ہیں اور دو Healthy snacks آپشنل لینے ہیں۔ سلاد اور دہی کا استعمال Main meal سے پہلے کریں۔ ایک گھنٹا روزانہ Exercise کریں، Fizzy Drinks نہ استعمال کریں۔ پاستا اور دوسرے Junk فوڈز سے مکمل پرہیز کریں اور عادت بنالیں دِن میں دو دفعہ دُودھ کے استعمال کی۔ اِس سے آپ کی ہڈیاں مضبوط ہوں گی۔

امید کے دنوں میں کھانا

سوال: میں آج کل امید سے ہوں۔ مجھے حمل کے دوران کیا کھانا چاہیے؟ (صبیحہ، کراچی)

جواب: ایک حاملہ خاتون کو Extra 300 کیلوریز اپنے روزمرہ پلان میں لینی پڑتی ہیں تا کہ اُس کے بچے کی نشو ونما صحیح طریقے سے ہو سکے۔

آپ کو متوازن غذا لینی ہو گی جو دودھ ہی سے بنی ہو۔ پھل، سبزیاں، مچھلی، گوشت، انڈے ہول Carbohydrates کے گروپ میں سے ہو۔ آپ کی غذا میں تقریباً دس فی صد لحمیات پروٹین ہونے چاہئیں جو کہ گوشت، دالوں، مچھلی، انڈوں اور دودھ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور 35% گڈ فیٹ ہونے چاہئیں جو کہ مکھن، مارجرین آئل اور nuts سے حاصل ہوتے ہیں۔ کاربوہائیڈریٹ بھی آپ کی غذا کا لازمی حصہ ہونا چاہیے۔ آپ کو اِس میں سے 55 کیلوریز لینی ہوں گی۔ کاربوہائیڈریٹ بریڈ، پاستا، آلو، چاول، Corn اور دوسرے اَناج سے حاصل ہوتا ہے۔ پانی زیادہ پئیں۔ ریلیکس رہیں۔ باقاعدگی سے نماز پڑھیں اور رکوع و سجدہ آپ کے لیے صحت اور آسانی لائے گا۔

قد بڑھانے کے ٹپس

سوال: میں چودہ سال کی ہوں۔ میرا وزن 39kg ہے اور قد پانچ فٹ 2 انچ ہے جبکہ میرے والد کا قد چھ فٹ ہے۔ براہِ مہربانی مجھے کچھ Tips دیں کہ میرا قد بڑھ جائے۔ (سائرہ افتخار، جھنگ)

جواب: آپ ابھی چھوٹی عمر میں ہو، تو آپ متوازن غذا اور ریگولر ورزش سے اپنا مقصد حاصل کر سکتی ہو۔ کوشش کرو پوری نیند لینے کی۔ اپنا وزن نارمل Maintain کریں۔ ہمیشہ لوفیٹ ڈیری پروڈکٹ کا استعمال کیا کریں جب بھی ممکن ہو۔ جیسے کہ Skimmed milk، لوفیٹ خمیر، فیٹ فری دہی، لوفیٹ کریم اور لوفیٹ آئس کریم۔ آپ چکن روسٹ بند کر دیں، گرل اور Steamed فارم میں اپنے بڑے کھانے میں استعمال کریں۔ مُرغی کی کھال اُتار کر استعمال کریں۔ سُرخ گوشت کا استعمال اور ساسجز Sausages

کا استعمال مکمل بند کر دیں اور چالیس منٹ تک روز ورزش کیا کریں۔

کیا جاگنگ سے کمی ممکن ہے؟

سوال: میری عمر 15 سال ہے اور میرا وزن 67kg اور قد پانچ فٹ آٹھ انچ ہے۔ کیا Jogging سے Belly فیٹ چلا جاتا ہے یا پھر کوئی اور ورزش کرنی ہوگی۔ (کمال جواد (سیالکوٹ)

جواب: آپ کو تقریباً 10 کلو وزن کم کرنا ہوگا۔ اپنا پہلے ٹیسٹ کروائیں اور وہ غذا استعمال کریں جو صحت مند ہو۔ جسم کا زائد وزن کم کرنے میں جاگنگ ایک عمدہ ورزش ہے۔ یہ آپ کا نظام دورانِ خون بھی بہتر کرتی ہے۔ آپ ورزش کے ساتھ ساتھ غذا پر بھی توجہ دیں۔ موسمی سبزیاں اور پھل ضرور کھائیں۔ بندگوبھی کا سوپ لیں جتنا آپ لے سکتے ہیں۔ یہ وزن جلدی کم کرنے میں مدد دے گا۔ یہ آپ کو وٹامن سی، فولک ایسڈ، پوٹاشیم اور ریشہ فراہم کرے گا۔ آپ بندگوبھی کا سلاد اور مختلف گرِل فوڈز بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ پانی کا استعمال مسلسل رکھیں۔

آئیڈیل وزن

سوال: میں 35 سال کی شادی شدہ عورت ہوں میرا وزن 64kg اور قد 5 فٹ ایک انچ ہے۔ میرا آئیڈیل وزن کتنا ہونا چاہیے؟ مسز الماس (کراچی)

جواب: آپ کے لیے اچھا ہوگا کہ 8 کلو وزن کم کریں انڈے کی سفیدی کا آملیٹ ناشتے میں لیں اور فریش فروٹس چائے کے وقت میں لیں اور گوشت میں ایکسٹرا Lean چکن، مچھلی استعمال کریں۔ اور ڈنر میں آپ سبزیوں کا سوپ چکن کے ساتھ لے سکتی ہیں۔ ورزش بہت ضروری ہے۔ آپ 45 منٹ کی واک روزانہ کریں۔ وقت ملے، تو ہفتے میں 5 دن باقاعدہ طور پر جم جائیں۔ سوئمنگ بہت اچھی ورزش ہے۔

19 سال میں 65 کلو

سوال: میری عمر 19 سال ہے اور میرا وزن 65kg ہے۔ میں چکن، گوشت اور سبزیاں نہیں کھاتی۔ آپ مجھے پھلوں اور سبزیوں پر مشتمل غذا کے متعلق کچھ بتائیں اور میرا وزن کم کرنے میں مدد دیں۔

جواب: اگر آپ صرف سیریل Cereals اور پھل استعمال کر رہی ہیں تو آپ کو اوور ویٹ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کوشش کریں ہر طرح کی غذا استعمال کریں چاہے تھوڑی سی کریں۔ آپ کی غذا کاربوہائیڈریٹ، پروٹین، فیٹ، وٹامن منرل سالٹ اور فائبر پر مشتمل ہونی چاہیے۔ اِن سب چیزوں کو آپ Correil پورٹینز میں استعمال کریں۔ ورزش کریں۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتے رہیے۔ خوش رہیں۔ صحت مند لائف سٹائل کی طرف آئیں۔ اللہ کی ہر نعمت سے استفادہ کریں۔

خوشخبری

انیقہ نے 85 کلو میں سے 10 کلو وزن کم کر لیا ہے۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ ورک آؤٹ اور ملٹی وٹامن کا استعمال مسلسل جاری رکھیں۔

95 سے 80 کرنے پر بہت مبارکباد۔ لیکن آپ کو دودھ ضرور پینا پڑے گا۔ کم از کم دو گلاس۔ یہ وزن کم کرنے اور صحت برقرار رکھنے کی کنجی ہے۔ لیکن یہ نہ بھولیں کہ دودھ ہمیشہ اسکم ہونا چاہیے۔ (عمران، سرگودھا)

104 کلو سے 95 کلو پر آئے ہیں۔ آپ کو مسلسل اور تقریباً ایک سال کی محنت درکار ہے۔ آپ بھی اپنے وٹامن ضرور جاری رکھیں۔ (کاشف سلیمان، چیچاوطنی)

آپ کو اللہ تعالیٰ نے پانچ سال بعد اولاد کی خوشخبری سنائی ہے۔ سمیرا اچھی اور متوازن غذا کے ساتھ خوش رہیں اللہ کا شکر کرنا نہ بھولیے گا۔ مجھے اور میرے اہل خانہ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے۔ (سمیرا فیصل، لاہور)

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اُکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، اس کی 3 بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بہ غور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے 2 سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہونے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے 6 شماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ منشورات کی 2 خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتا: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

ماہ اکتوبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز 1 ۔ (الف) چیف آف نیول اسٹاف (ب) آبدوز غازی

قصہ کوئز 2 ۔ (الف) 23 جون 1757 (ب) میر جعفر کے بیٹے میرن

قصہ کوئز 3 ۔ (الف) 1919 (ب) مصطفیٰ کمال پاشا

درست جوابات دینے والوں کے نام

گلزار عثمانی (لاہور)، مشرف حسین، راحت عائشہ (کراچی)، محمد تلمیذ الرحمٰن (فیصل آباد)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، فرحان اشرف (بہاولنگر)، عدنان اشرف (بہاولنگر)، محمد جہانگیر چودھری (میر پور)، محمد اویس دانش خانزادہ (سکرنڈ)، عبدالسلیم (حیدر آباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدر آباد)، محمد احمد (کراچی)، طٰہٰ یٰسین (حیدر آباد)، عقیل احمد خان (کراچی)، مصباح العین سخی رشید اعوان (گوجرانوالہ)، عرفان اللہ (بنوں)، محمد عثمان (لطیف آباد)، ایاز خلیل (حیدر آباد)، منظور احمد بھگیو (نواب شاہ)، محمد یونس کریم (ڈیرہ اسماعیل خان)، ساجد حسین (حافظ آباد)، محمد حبیب (فیصل آباد)، اویس حبیب (فیصل آباد)، ثمینہ فاروقی (ٹنڈو محمد خان)، سید ارشاد علی (ٹنڈو محمد خان)، حاکم علی (راولپنڈی)، عمر فاروق (پشاور)، پرویز اختر واحد (ہری پور)، طاہرہ عنایت (پشاور)، نادیہ رحمان (چکوال)، محمد محسن ندیم (اسلام آباد)، اقبال احمد خان (کراچی)، رقیہ بتول (جہلم)، محمود منور خان (سرگودھا)، ظفر اسماعیل (راولپنڈی)، محمد یوسف قریشی (لطیف آباد)، قمر اشتیاق (پشاور)، سارہ عارف (کراچی)، غلام حسین قادری (حیدر آباد)، فرحت النسا (بورے والا)، تنزیل الرحمان (ہری پور)

دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، یہی ہے اِس کوئز کا اصل مقصد

انچارج کوئز: غلام سجاد

یہی ہے قصہ کوئز

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- محمد جہانگیر چودھری، ڈڈیال ضلع میر پور خاص
- نادیہ رحمان، گاؤں سنگوالا تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال

آپ کو 6 ماہ تک اردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھی بھجوا سکتے ہیں

قصہ کوئز/1

تاریخ کے اولین اوراق بتاتے ہیں کہ بلوچستان دارا کی ہخامنشی سلطنت کا بھی حصہ رہا ہے۔ سکندرِ اعظم جب شمالی ہند کی مہم کے بعد یہاں سے واپس یونان گیا تو وہ اپنے لشکر سمیت بیلا اور مکران کے راستے ہی سے لوٹا تھا۔ سکندر کی وفات کے بعد بلوچستان اس کے گورنر سیلوکس کے تابع رہا۔ اس کے جانشینوں کے بعد باختریوں کے تسلط میں آیا، شیرانِ عادل (529-577ء) کے عہد میں بلوچستان ساسانی سلطنت کا حصہ بنا۔ 636ء میں سندھ کے راجا چچ نے مکران پر قبضہ کیا۔ پھر رائے خاندان کے بعد میں آنے والے حکمرانوں نے شمالی بلوچستان کے بھی اکثر حصوں پر تسلط جما لیا۔ 643ء میں مکران پر عربوں کی حکومت قائم ہوگئی جو دسویں صدی عیسوی تک جاری رہی۔ اس کے بعد بلوچستان پر پہلے آلِ غزنوی اور پھر آلِ غوری کی حکومت رہی۔ 1219ء میں یہ علاقہ سلطان محمد خان والئی خوارزم کی سلطنت میں شامل ہوا۔

1۔صوبہ بلوچستان کا رقبہ کتنا ہے؟

2۔ بلوچستان نے پاکستان کے ساتھ کب الحاق کیا؟

قصہ کوئز/2

بنگلہ دیش جنوبی ایشیا کا آزاد جمہوری ملک ہے۔ 1905ء میں عرفِ عام میں مسلم بنگال اور قانوناً مشرقی بنگال تھا۔ 1947ء میں پاکستان کا صوبہ بنا اور مشرقی پاکستان کہلایا۔ 1971ء میں انڈیا کی فوجی امداد سے علیحدہ ملک بنا۔ بنگلہ دیش کے بانی شیخ مجیب الرحمٰن نے 1947ء میں پاکستان قائم ہونے کے فوراً بعد بنگالی زبان کو قومی زبان بنانے کا نعرہ الاپ کر احتجاجی سیاست کا آغاز کیا۔ یہیں سے علیحدگی کے عناصر نے جنم لینا شروع کیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کو 1968ء میں صدر پاکستان ایوب خان نے علیحدگی کی ایک سازش کے الزام میں گرفتار کیا۔ اس سازش کا نام ''اگرتلہ سازش کیس'' رکھا گیا۔ انہی دنوں صدر ایوب کے خلاف ایک ملک گیر تحریک کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی رہا کرنا پڑا۔ شیخ مجیب نے رہائی پاتے ہی چھ ''نکات'' کا پروگرام پیش کیا جس میں مرکز کے پاس سوائے امورِ خارجہ کے کوئی اختیار باقی نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ درحقیقت علیحدگی کا پروگرام تھا۔

1: بھارت نے بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کب کیا؟

2: سب سے پہلے کس ملک نے بنگلہ دیش کو الگ ملک کے طور پر تسلیم کیا؟

قصہ کوئز/3

25مارچ 1971ء کو صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان نے شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا۔ انھیں مغربی پاکستان لایا گیا اور فوج کو امن و امان اور نظم و نسق قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔ عوامی لیگ کے رضا کار دستے بھارت کی امداد سے ''مکتی باہنی'' کے نام سے ایک چھاپہ مار فوج کی شکل میں پورے صوبے میں پھیل گئے۔ اگست 1971ء تک پاکستانی فوج نے حالات پر قابو پا لیا مگر مکتی باہنی اور دیگر باغی عناصر بھارت کی پناہ میں چلے گئے جسے بہانہ بنا کر 21نومبر 1971ء کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ پاکستانی فوجوں کی کمک اور سپلائی بند ہوگئی۔ بیرونی اور اندرونی دشمنوں کی وجہ سے 16دسمبر 1971ء کو ڈھاکا میں پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ بھارتی فوج ڈھاکا میں داخل ہوگئی اور مشرقی پاکستان کا صوبہ پاکستان سے کٹ گیا۔

1: بنگلہ دیش کا پہلا صدر کون تھا؟

2: بنگلہ دیش میں پہلا مارشل لا کب لگا؟

انعامات کے لیے تعاون
منشورات
خوبصورت اور معیاری کتب، کم قیمت اعلیٰ معیار
منصورہ، ملتان روڈ لاہور
042-35434909
042-35425356

چمنِ خیال

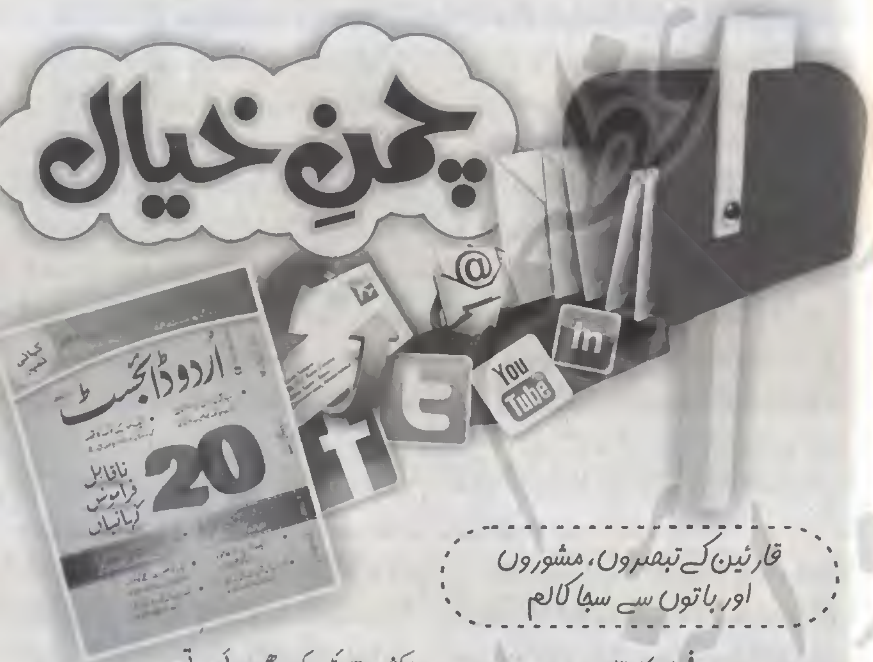

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

افسوس کا مقام

ڈاک خانے سے شمارہ لے کر نیوز ایجنسی پر گیا، تو ایجنسی والے منا بھائی نے پوچھا کہ تمھارا اُردو آ گیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں! آپ کے سامنے ہے، تو اس نے کہا کہ ہمارا ابھی تک نہیں آیا، آج ایک شخص اُردو کا معلوم کرنے آیا تھا، اس نے کل بیرون ملک چلے جانا ہے۔ اگر تم اپنا اُردو دے دو۔'' میں نے کہا ''حاضر سر!'' پھر ایجنسی والے سے اُردو تین دن بعد ملا۔ لیکن خوشی ہوئی کہ کسی مطالعہ کے شائق کی علمی پیاس بجھی۔

''کہانی نمبر'' کی تمام کہانیاں ہی منفرد اور بھرپور دلچسپی لیے ہوئے تھیں۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے روایتی سدا بہار کہانیوں کی نسبت تازہ بہ تازہ کہانیوں کو زیادہ اہمیت دی۔ سدا بہار کہانیوں کی اہمیت سے انکار نہیں مگر اکثر وہ قارئین کی پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کے لیے یہ کتنے دکھ اور افسوس کا مقام ہو سکتا ہے کہ آج صلاح الدین ایوبی کے قلعے کی مساجد عبادت کے بجائے سیاحت کے لیے وقف ہیں۔ سفرنامہ معلومات کے ساتھ دلچسپی بھی لیے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر شائستہ خان کا مضمون اس لحاظ سے نہایت افادیت کا حامل تھا کہ ہمارے ہاں ہر معمولی بیماری کا علاج بھی دوا ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ ہمارے جسم کو جو طاقت و توانائی غذا سے مل سکتی ہے، اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ مختصر یہ کہ ''کہانی نمبر'' ایک یادگار دستاویز کی صورت اُردو ڈائجسٹ کا ایک ایسا تحفہ ہے، جو قارئین کو مدتوں یاد رہے گا۔

(رانا محمد شاہد، بورے والا)

KitabPK.Com

قومی زبان اُردو کو
دفاتر سے مقابلے کے امتحانات تک لے جائیے

میں اُردو ڈائجسٹ گزشتہ تین ماہ سے باقاعدگی سے دیکھ بھی رہا ہوں اور ہر ماہ چمن خیال میں لکھ بھی رہا ہوں۔ اردو ڈائجسٹ واقعی پاکستان کا ایک مقبول ڈائجسٹ ہے۔ میں اردو ڈائجسٹ کے توسط سے حکومت وقت کی خدمت میں عرض کروں گا کہ اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ اُردو ہماری قومی زبان ہے، لیکن قومی زبان کے ساتھ جو سوتیلی ماں کا سلوک کیا جا رہا ہے وہ قابل افسوس ہے۔ اب جبکہ اقتدار ایک ایسی حکومت کے پاس ہے جو قائداعظم محمد علی جناحؒ کی بنائی ہوئی جماعت ہے اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اُردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا تھا۔ لیکن 65 برس گزرنے کے بعد بھی قائداعظم محمد علی جناحؒ کے اس خواب کو پورا نہیں کیا گیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلم لیگ کی حکومت ہنگامی بنیادوں پر اردو کے فروغ کے لیے عملی اقدامات اٹھائے اور تمام سرکاری اداروں اور مقابلے کے امتحانات میں اردو زبان کو نافذ کرائے۔

(امین مراد انصاری، کراچی)

عمدہ کہانیاں

اکتوبر 2013ء کا اردو ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے پہلی بار فیصل آباد کے مشہور بک اسٹال ملک بک اسٹال چوک گھنٹا گھر سے لے کر آیا۔ معیار میں کافی اچھا ہے، اُردو ڈائجسٹ دراصل رسالہ نہیں ایک مستقل کتاب ہے اور کتاب کا تعلق علم سے ہوتا ہے۔ علم کا تعلق قلم سے ہے، قلم کا تعلق نور سے اور نور کا تعلق اللہ کی پاک ذات سے ہوتا ہے۔ یوں یہ ڈائجسٹ بھی اللہ سے جوڑ دیتا ہے۔ رسالہ میں سب سے کارآمد کہانی لالی تھی۔ بہت ہی پیاری کاوش تھی۔

ڈائجسٹ میں سبھی لکھنے والے خوبصورت تحاریر لکھ رہے ہیں۔ محمد الیاس صاحب کی ''آپا تاج''، نیلوفر کی ''برف'' اور عمار مسعود کی ''دعائے مغفرت'' کہانیاں بھی خوب صورت تھیں۔ ہر لکھنے والے نے میری نظر میں بہت عمدہ الفاظ اور پلاٹ کا انتخاب کیا۔

(ملک علی رضا، فیصل آباد)

میرا تو کچھ بھی شائع نہیں ہوتا

ایک بات کا بہت افسوس ہے کہ میں نے آپ کو 4 خطوط، ایک مضمون اور کئی معلوماتی واقعات اور اقوال زریں ارسال کیے مگر کوئی بھی کسی شمارے میں شائع نہیں ہوا۔

آج آپ کو اپنے محلے کی 104 سالہ عمر رسیدہ دادی اماں کی زندگی کے دلچسپ واقعات ارسال کر رہا ہوں، امید ہے پسند آئیں گے اور نومبر 2013ء کے شمارے میں شائع فرما کر عزت افزائی فرمائیں گے۔

(محمد یونس کریم، پنیالہ ضلع ڈی آئی خان)

(یونس کریم صاحب! ناقابل اشاعت تحریریں ہم محفوظ نہیں رکھتے، وہ ضائع کر دی جاتی ہیں۔ آپ لکھنے سے پہلے فون کر کے مشورہ ضرور کر لیا کریں تاکہ آپ کی محنت ضائع نہ ہو)

مکافات عمل

اللہ کرے آپ کامل خیریت سے ہوں۔ ''مکافات عمل'' کے حوالے سے ایک سچا واقعہ ارسال کر رہا ہوں، مفید سمجھیں، تو شائع کر دیجیے۔ وضاحت کے طور پر عرض ہے کہ اس واقعے میں کسی کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا کہ یہ ایک تاریخ ہے اور تاریخ میں اس طرح کے واقعات نام بنام موجود ہیں۔ پھر بڑے لوگوں کے ذاتی واقعات بھی

دراصل تاریخ ہی ہوتے ہیں۔ (ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، لاہور)

ڈاکٹروں کے لالچ کی کوئی حد ہے؟

اردو ڈائجسٹ کو پڑھتے 35,30 سال ہو گئے ہیں۔ پہلے میرے سسر کی وجہ سے تعارف ہوا۔ ان کی وفات کے بعد میرے شوہر ہر ماہ ضرور خریدتے۔ بے شک سعودی عرب میں ہوں یا پاکستان، اردو ڈائجسٹ ضرور خریدا جاتا رہا اور بہت سے لوگوں کو متعارف بھی کروایا۔ سعودی عرب میں ایک انڈین مسلمان تھے، وہ ضرور لے کر پڑھتے اور اسی طرح واپس پہنچا دیتے۔

میں بہت پہلے ''مشورہ حاضر ہے'' سب سے پہلے پڑھتی پھر اسی وجہ سے ڈائجسٹ سنبھال کر بھی رکھتی تھی۔ آج ''درِ دل پہ دستک'' سب سے پہلے پڑھتی ہوں، بہت لوگوں کو بھی کوشش کر کے پڑھاتی ہوں، نصیحت کے لیے۔ سب سے پہلے تو آپ کی پوری ٹیم بہت مبارک باد کی مستحق ہے۔ اس دفعہ بھی 6 ستمبر کے حوالے سے ڈائجسٹ بے دلی سے اٹھایا، مگر پڑھنا شروع کیا، تو بہت زبردست پایا۔ بالکل مختلف۔ سب لکھنے والوں کو جتنا سراہا جائے کم ہے۔ ''خاص طور پر اللہ نے پاکستان کی حفاظت کی۔'' سکندر خان بلوچ کی کہانی پڑھ کر بہت کچھ حیرت، افسوس سمجھ میں نہیں آتا، کیا تبصرہ کروں پہ اپنے ملک کے لیڈروں کے بارے میں یہ سب کچھ پڑھ کر دل بہت اداس ہوا۔

اب میں ایک ملکی مسئلہ پر قلم اٹھا رہی ہوں۔ لکھنا لکھانا بہت مشکل ہے، پڑھنے کی حد تک شوق ہے۔ مسئلہ کی نشاندہی کر کے یہ توقع اردو ڈائجسٹ سے کر رہی ہوں کہ کوئی بھی لکھنے والا اس مسئلے کی تحقیق کر کے اسٹوری لکھے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے اہم ایشوز کی نشاندہی ضروری ہے۔

میڈیسن کا شعبہ بہت اہم ہے۔ انسانوں کی زندگیوں کے ساتھ یہ میڈیسن کمپنیاں بہت گھناؤنے مذاق کر رہی ہیں۔ میڈیسن کی کوالٹی، قیمت مناسب کر کے فائدے حاصل کر سکتی ہیں۔ مگر یہاں روز بروز قیمت بڑھا دی جاتی ہے، معیار کو کوئی چیک کرنے والا نہیں ہے۔ میڈیسن بیچنے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کر رہے ہیں، ہر حلال کام کو اور حلال روزی کو حرام کرنے کے بہت سے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔

بڑی بڑی میڈیسن کمپنیاں اشتہار کے طور پر پہلے کسی زمانے میں ڈاکٹروں کو ڈائریاں، پین، پین ہولڈر وغیرہ گفٹ دیا کرتی تھیں۔ لیکن آج کل ان کے لیے پرکشش مراعات، لگژری گاڑی کی چابی کبھی باہر کے ملکوں کی سیر (امریکا، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، سنگاپور) جیسے مہنگے ملکوں کی ایئر ٹکٹ، رہائش، سیر و تفریح کے مکمل انتظام سب یہ کمپنیاں کرتی ہیں۔ غریب ملک کے امیر عوام جب دوسرے ملکوں میں جا کر اپنے پاکستانی بھائیوں کو یا دوستوں کو ہوٹلوں میں دعوت دیتے ہیں۔ وہ جو وہاں ملازمت کے لیے گئے ہوئے پاکستانی ان کی عیاشیاں دیکھتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں۔

اپنے ملک کی سیر تو عام بات ہے وہ تو ہر سال بیوی بچوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات جانا لازمی ہے۔ البتہ باہر کے ملکوں میں بیوی ساتھ جاتی ہے، بچوں کے ٹکٹ نہیں ہوتے کچھ عرصہ بعد بچوں کے بھی ٹکٹ مل جایا کریں گے۔ دوسری بڑی عیاشی، شام کو کھانا باہر ہی کھایا جاتا ہے۔ اکثر ڈاکٹر حضرات مہمانوں سمیت

KitabPK.Com

ہوٹلنگ کرتے اور فخر سے بتاتے ہیں یہ سب میڈیکل ریپ نے انتظام کروایا ہے۔

ابھی گزشتہ دنوں ایک فیملی کا سن رہے تھے کہ باہر جانا ہے۔ ویزہ کا پتا نہیں کب لگے، میڈیکل ریپ کا فون آیا کہ ویزہ آچکا ہے۔ آپ ایڈوانس میڈیسن آرڈر کردیں اور جانے کی تیاری کریں، اب کہاں کی کوالٹی، کون ایسے جھنجٹ پالے۔ کوئی تو انھیں بتائے کیوں اپنی عاقبت خراب کررہے ہو اور لالچ اور برائی کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کون کرے گا۔ (افشاں نوید، کراچی)

چھوٹی سی تحریر

پہلی ملاقات ہے اس لیے پہلے تعارف کرانا مناسب ہوگا۔ میرا نام امتیاز حسین ہے، فوج سے میجر کی حیثیت سے 1992ء میں ریٹائر ہوا، لکھنے کا شوق بچپن سے ہے، زیادہ وقت کوئٹہ میں گزارا۔ اس لیے زیادہ تر وہیں کے اخبارات اور رسائل میں لکھتا رہا۔ وہیں سے میری دو کتابیں ''حصار'' اور ''راہ طلب'' کے نام سے چھپی ہیں۔ اب اسلام آباد شفٹ ہوگیا ہوں۔ یہاں پر حصار سیکیورٹی سروسز کا ڈائریکٹر ہوں۔ پاکستان کے معروف رسائل میں میری تحریریں چھپتی رہی ہیں۔ جن میں سیارہ ڈائجسٹ، قومی ڈائجسٹ، حکایت، سچی کہانیاں، ماہ نور، حرف اور ادب لطیف شامل ہیں۔ پتا نہیں اردو ڈائجسٹ کے لیے کیوں نہیں لکھ سکا۔

پہلی دفعہ ایک چھوٹی سی تحریر بھیج رہا ہوں۔ پندرہ ستمبر 2013ء ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ ویسے تو معمولی سی بات ہے، لیکن یہ حالات اور ماحول کا دوسرا مثبت رخ ہے، عموماً ہمیں منفی رخ ہی نظر آتا ہے۔ جھوٹ، لالچ، فریب، بے حسی اور خود غرضی کی اس دنیا اور ماحول میں ایسا کام روشنی کی ایک کرن کی طرح ہے۔ اس لیے سوچا کہ لکھوں اور اردو ڈائجسٹ میں بھیجوں۔ (امتیاز حسین، اسلام آباد)

موت نے چپکے سے نجانے کیا کہا؟

تحریروں کا انتخاب لاجواب ہوتا ہے۔ جو دل میں حوصلوں اور امنگوں کا ایک جہاں آباد کرتی ہیں اور انسان اپنے اندر کی مثبت تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کا انکشاف نہایت فنکارانہ اور نفسیاتی تحلل کے رنگ میں نظر آتا ہے۔

''در دل پہ دستک'' اس کے بارے میں لکھنے کے لیے الفاظ نہیں کہ احساسات کو لفظوں کا پیرہن دے پاؤں۔ بس ذہن و دل پہ پڑے بوجھ سرکنے لگتے ہیں بہت سی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں۔ ویسے تو انسانوں کا لکھا ہوا ادب زندگی کو بدلنے پر قادر نہیں، اگر کچھ زندگی کو بدلنے پر قادر ہے، تو اس رحمان کا کلام۔ ہاں البتہ یہ انسانوں کی لکھی ہوئی تحریریں بہت سی روشنی ضرور دیتی ہیں، جن میں کچھ راستے واضح اور صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔ کسی بھی قوم کی ترقی میں اس کا ادب بہترین کردار ادا کرتا ہے۔ قوموں کے بناؤ اور بگاڑ میں ادب کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ یہی ادب قوم کی پہچان بنتا ہے۔ ایک اچھا ادب انسانی روح کی طلب ہے۔

در دل پہ دستک میں کچھ لفظ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جسم میں داخل ہو کر روح کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ 8 اکتوبر کا سورج ہر سال دکھ، تکلیف اور اداسیوں کی چادر اوڑھے طلوع ہوتا ہے۔

موت نے چپکے سے جانے کیا کہا
زندگی خاموش ہو کر رہ گئی

زندگی کا سفر کبھی نہیں رکتا، دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ

برس بیت گئے۔ ہم تو سوچا کرتے تھے وقت ٹھہر گیا لیکن وقت تو گزر جاتا ہے بس دکھ ٹھہر جاتے ہیں۔ حادثات تو گزر جاتے ہیں، لیکن اپنے پیچھے ان مٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ جو کئی سالوں تک انسانی ذہنوں اور ان کی زندگیوں کو اپنے زیر اثر رکھتے ہیں۔ شکست و ریخت کے اس پس منظر میں کچھ تو ایسا ہوتا ہے جو انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور اشک باری کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

اہل وطن کی عظمت کو سلام جنھوں نے ایک بھٹکی ہوئی بچی کو بحفاظت گھر پہنچا دیا۔ یہی بچی اگر سرحد پار کر کے بھارت کے علاقے میں داخل ہوئی ہوتی تو......

یہی سوچ رونگٹے کھڑے کر دینے کو کافی ہے۔ کشمیر کی خوبصورت اور گل پوش وادی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ نہتے مظلوم کشمیری خاک و خون کے جس المناک دور سے گزر رہے ہیں وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ہمارے علاقے کی اک عورت بھی یوں ہی سرحد پار علاقے میں داخل ہو گئی تھی اور پھر...... اسے درد و ابتلا کے جس دور سے گزرنا پڑا اللہ پاک ہی جانتے ہیں۔

(تاجیہ ملک، چناری آزاد کشمیر)

اسامہ بن لادن والے مضمون میں ایک غلطی ہو رہی ہے۔ 9 ستمبر لکھا جا رہا ہے جب کہ یہ واقعہ نائن الیون یعنی 11 ستمبر کو ہوا تھا۔ (انجینئر نیک محمد، لاہور)

مستحکم دفاع نمبر

مستحکم دفاع نمبر واقعی دفاع نمبر ہے۔ بڑے معلوماتی اور جذبہ محبت وطن کے آرٹیکل پڑھنے کو ملے۔ محمد الیاس کی کہانیاں یا افسانے شائع کر کے آپ نے بہت بڑا قدم اٹھایا ہے کبھی نظر سے گزرے تو ان کے بارے میں بھی ایک پیرا شائع کر دیں تا کہ معلم کی اہمیت کا پتا چل جائے۔ کہانی معیار پر پوری نہیں اتری۔ آپ کا معیار اونچا، میری سوچ پست۔ آپ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔

آپ کا قیمتی وقت، میری باتیں...... اللہ زور قلم اور کرے، در دل پہ دستک دیتے رہیں، لیکن اتنا یاد رکھیں بقول ہاشم ندیم:

''مزاروں کے دروں پر دستک نہیں دی جاتی''

(سید طاہر ندیم خوارزمی، منڈی بہاؤالدین)

(خوارزمی صاحب! اللہ خیر کرے، خیر کی توقع رکھا کریں۔ ہر دل تو مزار نہیں بنا ابھی۔)

سوکھی ٹہنی

یہ تب کی بات ہے جب گاؤں میں دو چار گھروں میں فون کی سہولت ہوتی تھی اور اسی پہ سارے گاؤں کا رابطہ ہوتا۔ ہمارے گھر میں سارے گاؤں کے فون آتے اور پھر ہم ان کو بلانے جاتے، جن کا فون ہوتا۔ تھوڑا دور ہیجڑوں کا بھی ایک گھر تھا انھیں بھی فون کا پیغام دینے جاتے۔ وہ بڑے عجیب سے لگتے لیکن جب بھی میں انھیں بلانے جاتا وہ بڑے پیار سے بات کرتے۔ میں ان کے بارے میں سوچتا کہ یہ کیوں سب سے الگ ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کیوں ایسے رہتے ہیں؟ پھر مجھے ان پہ بڑا ترس آتا، پتا نہیں کیوں۔ یہ کہانی بھی شاید اسی بنیاد پہ بنی۔

تین مضامین چھپ گئے ہیں۔ نئی تحریر ''سوکھی ٹہنی'' آپ کے مطالعے کے لیے حاضر ہے۔ مجھے آپ کی کال کا انتظار رہے گا، یہ آپ اچھا کرتے ہیں کہ کبھی کبھی براہ راست لکھنے والوں کو فون کر دیتے ہیں۔ (محمد قاسم رضا، گوجرانوالہ)

(امید رکھیں سوکھی ٹہنی بھی کبھی نہ کبھی ہری ہو جائے گی)

○○○

KitabPK.Com

درِ دل پہ دستک

اختر عباس

urdudigest.pk

akhterabas@ymail.com

آم پہ آیا بُور اور بٹور

رات کا شاید ایک بجنے کو تھا۔ آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اور میں اپنے اسٹڈی روم کے فرش پہ رکھے گدے پر، دیوار سے ٹیک لگائے فلم دیکھ رہا تھا۔ یہ نوے کی دہائی کا وسط تھا، ان دنوں میں نے کچھ ایسے پڑھے لکھے دوست دریافت کیے تھے جو اچھی تخلیقی، تاریخی اور سائنسی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتے۔ آٹھ دس میں سے کوئی ایک اپنے موضوع اور پروڈکشن کے اعتبار سے بہترین ہوتی، وہ مجھے بتا دیتے، ایک تو اتنا اچھا تھا کہ فلم ہی گھر دے جاتا۔ دفتر سے واپس آ کر کھانا وانا کھاتے، ٹی وی دیکھتے دس گیارہ تو یوں بج جاتے کہ خبر بھی نہ ہوتی۔ نرگس بلاک میں واقع اس پرانے گھر میں میرے کمرے تک جانے سے پہلے انار کے تین پودے اور آم کا ایک بھرپور جواں پودا جس پر بور سے زیادہ بٹور آتا تھا (بور پہ پھل لگتے ہیں بٹور بیماری ہے بظاہر کچھ سا بنا ہوتا ہے لگتا ہے کہ خوب پھل آئے گا مگر نہ امبیاں لگتی ہیں نہ سائز بڑھتا ہے) اس کے ساتھ زمین میں لوہے کے دو پولوں پہ لگا جھولا تھا جس پر میں خود بھی کبھی کبھی رات گئے جھول لیتا تھا۔ آم کے پتے اور شاخیں میرے اسٹڈی روم کے دروازے پر سایہ کیے رکھتے۔ ٹی وی ٹرالی کے بالکل ساتھ میرا اسٹڈی ٹیبل تھا جس کے پہلے شیلف پر اس مہینے بھر میں پڑھی جانے والی یا تازہ خریدی ہوئی کتابیں دھری ہوتیں۔ اس سے اوپر والے شیلف پہ وہ کتابیں شرمندہ شرمندہ سامنہ لیے جھانک رہی ہوتیں جن کی طرف دیکھنے کی مہینوں سے فرصت ہی نہیں مل پائی ہوتی تھی۔

میں زندگی بھر کسی کام اور شوق کو ''سزا'' نہیں بنا سکا۔ جب تک خوش دلی سے جی مانا، توجہ دی، پھر پورے اطمینان سے دوسرے کی طرف متوجہ ہو گیا، جسے اب ٹی وی والے ''ملتے ہیں بریک کے بعد'' کہتے ہیں بس اسی طرح بریک لے کر دوبارہ اصل کام میں جت جاتا۔ اس رات آسکر انعام یافتہ فلم تھی، ''Gone with the wind۔'' اس کا ٹمپو اس قدر سلو تھا کہ مجھے پوری توجہ کے باوجود وہ جذب نہیں کر پا رہی تھی۔ اسی دوران اچانک ڈور بیل بجی، میں نے دیوار پہ ٹنگی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا اور اسٹڈی کا دروازہ کھول کر لمبی گیلری سے چلتا ہوا گھر کے مرکزی دروازے پہ پہنچا۔ وہاں نسیم صاحب موجود تھے۔ وہ ہمیشہ دس گیارہ بجے ہی تشریف لایا کرتے تھے۔ اور یہ ان کے جانے کا وقت ہوا کرتا تھا۔ وہ جرمنی کی ایک مشہور فارماسوٹیکل کمپنی شیرنگ ایشیا میں ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ (HRD) کے سربراہ تھے۔ سکھر سے تعلق

رکھنے والے اس محنتی اور مخلص دوست سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی، مجھے اب یاد نہیں۔ پھول ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کے ٹریننگ پروگراموں میں انھوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ وہ پاکستان کی پہلی پیرنٹس کونسل کے سربراہ بھی رہے۔ ایک دو بار انھوں نے کمپنی کے ٹریننگ روم میں سارا سارا دن ہماری نوجوان ٹیم کو Drive Change Naturally پہ ٹریننگ بھی دی۔ (2000ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں اس کمپنی کا Bayer سے مرجر ہو گیا اور لاہور آفس بند ہونے کے بعد وہ کراچی منتقل ہو گئے)

کھانا وہ کھا کر آئے تھے۔ چائے سے انھوں نے مروتاً بھی انکار نہ کیا۔ میں نے کچن میں جا کر خود ان کے لیے چائے تیار کی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے غور کیا، تو ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھیں بجھی خاموش اور گہری لگیں، میں نے بڑے رسان سے پوچھا ''علامہ صاحب! خیریت تو ہے؟''

بولے تو یوں لگا جیسے کنویں کی گہرائی سے آواز آئی، خیریت ہوتی، تو اسی وقت کیوں آتا؟ انھوں نے کپ رکھ دیا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔ ان کی آنکھیں جو لمحہ بھر پہلے نم تھیں اب باقاعدہ وہاں آنسو تیر رہے تھے۔ میں لپک کر ان کے قریب گیا۔ انھیں گلے لگایا، ان کے سر پر بوسہ دیا۔ اللہ خیر کرے کیا ہوا؟

''وہ آج شام ہمارے ایک کولیگ فوت ہو گئے۔''

''تو!''

میں نے حیرت سے انھیں دیکھا، رونے کی یہ وجہ تو بہرحال نہیں ہو سکتی۔ اصل میں جب اس کی میت قبر میں اتاری جا چکی، تو میں نے دیکھا کہ ہماری کمپنی کے ایک پرانے آفیسر بھی وہاں موجود تھے، جو کچھ عرصہ قبل ہی ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ انھوں نے بڑے طویل عرصہ حکومت کی، ہر اچھے عہدے پر فائز رہے۔ عید شبراتوں پر ان کے ڈرائنگ روم میں کیک رکھنے کی بھی جگہ نہ ہوتی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ڈرائنگ روم بھائیں بھائیں کرتا اور وہ گلے سے بھرے بولتے کہ اب تو کوئی ملنے بھی نہیں آتا۔ وہ جو آگے پیچھے پھرتے تھے ایک فون کے روادار نہیں رہے حالانکہ اب تو میں کسی کو کوئی سخت جملہ اور تلخ بات بھی نہیں کہتا۔

نسیم صاحب کا چہرہ دکھ، حیرت اور رنج کا گھر بنا ہوا تھا۔ پتا ہے کیا ہوا؟ میں نے سلام لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس میں مروت بھی تھی لحاظ بھی۔ ایک طویل عرصہ وہ میرے باس اور کولیگ بھی رہے۔ بے شک میں نے ان سے بہت سیکھا، اسی لیے ان کے بعد مجھے وہی پوزیشن دے دی گئی۔ میرے ہاتھ بڑھانے میں ایک احترام بھی شامل تھا اور لحاظ بھی۔ انھوں نے عجیب غیر متوقع حرکت کی۔ بداخلاق تو وہ پہلے بھی تھے مگر یہ انتہا تو میں نے کبھی سوچی بھی نہ تھی۔ انھوں نے غصے سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ بولے ''تم سمجھتے کیا ہو خود کو، میری جگہ لے لو گے۔''

''جگہ تو آپ لے چکے۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی، اب وہ غصہ بھی نہ کریں۔'' میرا انتخاب انھوں نے کیا۔ کمپنی پالیسی کے تحت مجھے ''گروم'' کیا۔ اسی پوزیشن کے لیے افسروں میں اپنا ایک گروپ تھا۔ میری وفاداری صرف کمپنی سے رہی۔ میں کبھی پاور پالیٹکس اور گروپنگ کا حصہ نہیں بنا۔ انھیں اس بات کا دکھ تھا، وہ کہتے تھے ''میرے ساتھ یا پھر میرے دشمنوں کے ساتھ۔ درمیان میں کوئی جگہ نہیں۔'' ہم ان سے چھوٹے تھے، کیسے سمجھاتے کہ یہ میدان جنگ نہیں، کام کی جگہ ہے۔ یہاں دوستیاں دشمنیاں مستقل نہیں ہوتیں اور ذاتی تو بالکل نہیں ہوتیں۔

''اتنی سینیئر پوزیشن پہ اور کئی سال کام کرنے کے بعد بھی وہ ایسی بداخلاقی کریں گے۔ نسیم صاحب اس صدمے سے باہر ہی نہیں آپا رہے تھے۔ ''گھر گیا دل نہیں لگا، آپ کے پاس آ گیا اس یقین کے ساتھ کہ پورے شہر میں آپ واحد ہیں جو میرے دل پہ آیا بوجھ اپنے ہاتھوں اتار دو گے۔''

نسیم صاحب بزرگ دوست ہی نہیں کچھ باتوں میں میرے استاد بھی تھے۔ ایک بار میرے ایک عارضی باس نے کئی روز سے منہ بنایا ہوا تھا۔ روز لکھ کر خط بھیج

KitabPK.Com

دیتے جو عام طور پر اس طرح کے موضوع پہ ہوتے کہ چلتے ہوئے ہلتے کیوں ہو اور کام کرتے ہوئے خاموش کیوں ہوتے ہو؟ جب چار پانچ خط اوپر تلے آ گئے، تو میں نے نسیم صاحب کو فون کیا اور پوچھا کہ آپ کی ایچ آر ڈی اس بارے میں بھی کچھ کہتی ہے۔ وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولے ”حضرت! یہ مسئلہ نہیں ہے مسئلے کی علامت ہے۔ فوراً جا کر باس سے ملیں اور وجہ جانیں ممکن ہے پوچھے بغیر ہی بتا دیں، کیونکہ جو وہ کر رہے ہیں ہماری ایچ آر ڈی کہتی ہے کہ وہ وجہ نہیں ہے، اظہار ہے، پیغام ہے۔ میں فوراً ہی اپنے سامنے والے آفس میں دبلے پتلے، غصے سے بھرے باس کے کمرے میں چلا گیا۔ ”سر! خط آ رہے ہیں مسلسل، خیریت تو ہے!“

”خیریت کیسے ہو؟ تم کوئی روز ملنے آتے ہو۔ نہ سلام نہ دعا، آتے ہی کام پہ لگ جاتے ہو۔ میں بھی یہیں پہ ہوں، عارضی ہی سہی تمھارا باس ہوں، مانو تو سہی۔“

معصوم آدمی تھے۔ میرے جاتے ہی غصہ جاتا رہا۔ چائے پلا کر رخصت کیا۔ ان سے آج تک تعلق اور قربت کا رشتہ قائم ہے۔ جس کی وجہ نسیم صاحب بنے۔

جسم پہ چوٹ آئی ہو، تو مرہم، پٹی، بینڈ ایج، پائیوڈین، آئیوڈیکس کچھ بھی وقتی ساحل ہو سکتا ہے مگر روح گھائل ہوئی ہو اور وہ بھی کسی کے تکبر اور غیر متوقع رویے سے، اس کی بداخلاقی سے یا دوسروں کے سامنے اپنی بے عزتی کے احساس سے، تو خود کو سمجھانے میں بھی وقت لگتا ہے۔

میں نے رات کے اس پہر اسٹڈی روم سے متصل لمبی گیلری کی ساری لائٹیں آن کیں اور نسیم صاحب کو لے کر وہاں ٹہلنے لگا۔ آم کے قریب آ کر رکا اور پھر وہ کام کیا جو بڑے بوڑھے کرتے تھے۔ دادا جی کا نام ایسے موقعوں پر بڑا مفید رہتا ہے۔ آم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، میرے دادا جی، اللہ غریق رحمت کرے کہا کرتے تھے۔ ”انسان بھی بور جیسے ہوتے ہیں جس کا اخلاق اچھا ہو، اس پر پھل آتا ہے اور جو بداخلاقی سے بنا ہو وہ سزا کے طور پر بٹور میں ڈھل جاتا ہے۔ دور سے بور ہی لگتا ہے۔ مگر اس پر کبھی پھل نہیں لگتا...... وہ اس حالت میں کالا ہو جاتا ہے اور پھر اس کو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو جلانا بھی پڑتا ہے۔“

”مگر مغربی صاحب تو اپنے آپ کو حد درجہ بااخلاق سمجھتے اور بہ بانگِ دہل اعلان بھی کرتے رہتے تھے۔“ نسیم صاحب کا غصہ اور دکھ ابھی باقی تھا۔ بداخلاقی کا کبھی کبھی مظاہرہ کرنے والوں یا اسے ایک طرز زندگی کے طور پر اختیار کرنے والوں کے پاس بھی ضرور کوئی دلیل ہوتی ہو گی ان سے کبھی واسطہ پڑے تو یقیناً بڑی حیرتیں بھی ملتی ہیں۔ مجھے یاد ہے یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے فوراً بعد بطور ایڈیٹر اپنے کیریئر کی پہلی ملازمت فیروز سنز میں شروع کی، زیادہ وقت نہیں ہوا تھا، ایک روز بن بادلیس روڈ پہ واقع فیروز سنز پریس سے بشیر راہی اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر آئے۔ راہی صاحب سرکولیشن کے انچارج تھے، وہ ناک کی سیدھ میں چلنے والے ورکر مشہور تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے اور دوسرا کوئی کام نہ کرنے والے۔ انھوں نے عجیب فرمائش کر دی، کہنے لگے ”سنا ہے آپ ہاتھ دیکھتے ہیں۔ میرے دوست اصرار کر کے ساتھ آئے ہیں اور میں نے آپ سے کبھی کوئی فرمائش بھی نہیں کی۔“ ہاتھ دیکھنے کا شوق عمر کے ایک حصے میں ضرور ہو جاتا ہے۔ پامسٹری پر فیروز سنز میں میر بشیر کی کتابیں چھپ رہی تھیں، جناب ایم اے ملک سے ذاتی نیاز بھی حاصل ہوتے تھے۔ آنے والے سالوں میں انھوں نے کمال مہربانی سے اپنی ایک کتاب میں میرے ہاتھ کا پرنٹ بھی شائع کیا اور ساتھ اپنے مشاہدات تحریر کیے۔ ملک کے مشہور پامسٹ صادق محمود ملک (ایس ایم ملک) سے 1992ء کے بعد

دوستی ہونے تک میں اپنی اِس تک بندی اور شوق سے تائب ہو چکا تھا۔ ان صاحب نے بے تکلفی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ گزشتہ سال فیروز سنز مال روڈ کا شوروم جلنے سے پہلے اوپر والی اکلوتی منزل پہ میرا دفتر تھا۔ قریب ہی ماہنامہ نظریہ پاکستان کے موجودہ مدیر نعیم احمد صاحب بیٹھے رضیہ بٹ کے ناول پڑھا کرتے تھے۔ وہ دن بھر اپنے چٹکلوں اور کھلے ڈُلے تبصروں سے رونق لگائے رکھتے۔ ہاتھ پر نظر پڑتے ہی میں نے ان سے کہا، ”اصولی طور پر دو باتیں یاد رکھیے، اول کسی کو ہاتھ نہ دکھائیے، دوم کسی کے سامنے مت دکھائیے۔ یہ ظالم لکیریں کھلی کتاب کے لفظوں سے زیادہ چلتی پھرتی فلم جیسی ہوتی ہیں۔ اللہ جی نے شاید ہماری عادتیں ٹھیک کرنے کے لیے لکیریں بنائی تھی۔ ہم ان سے موت، زندگی اور شادیاں، بچے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔“

انھوں نے بااصرار کہا کہ راہی صاحب میرے دوست ہیں، آپ ان کے سامنے ہی دیکھ لیں۔ ہاتھ کو چھوئے بنا اپنا مشاہدہ بولنا شروع کیا کہ اصل علم تو اللہ کی ذات کو ہے، ایسی لکیریں دیکھ اور پڑھ کر میں نے جانا ہے کہ انسانی زندگی کی تین بڑی برائیاں جو W سے شروع ہوتی ہیں ان لکیروں میں پائے جانے کا غالب امکان موجود ہے۔ انھوں نے گھبرا کر ہاتھ سمیٹ لیا اور بولے میں کسی روز تنہائی میں حاضر ہوں گا۔ میں مسکرایا تو راہی صاحب یہ کہتے ہوئے کہ دوبارہ موقع ملے نہ ملے اٹھ کر نیچے چلے گئے۔ انھوں نے ہاتھ پھر دراز کر دیا اور پوچھنے لگے میرے ہاتھ میں محبت اور عزت کتنی ہے؟“

میرا گماں یہ تھا کہ دونوں ہی عنقا ہیں۔ آپ مزاج کے بہت سخت اور تیز لگتے ہیں۔ ایسے مزاج کے حامل لوگوں کو عزت نہیں مل پاتی اور یہ محرومی بڑی مہنگی پڑتی ہے۔ انھوں نے دلائل سے ثابت کرنا شروع کیا کہ ایسا نہیں ہے کہ ان کی پہلی دلیل دلچسپ ہی نہیں انوکھی بھی تھی۔ کہنے لگے ”گھر میں میری اس قدر عزت ہے کہ جب گھر میں داخل ہوتا ہوں تو بچے اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتے ہیں۔ بیوی پوری عزت اور خاموشی سے کھانا رکھ کر ایک لفظ بولے بنا اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اس سے زیادہ عزت اور کیا ہو سکتی ہے۔“ میں نے بڑا ضبط کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور بول پڑا کہ ”جناب اسے عزت نہیں دہشت کہتے ہیں۔ اہل خانہ، بچے اور نوکر پیار اور اخلاق سے قریب آتے ہیں۔ غصے، خوف اور بدتمیزی کا خطرہ ہمیشہ منڈلا رہا ہو تو کوئی کیوں قریب آئے گا۔“

یہ سن کر نسیم صاحب بڑی دیر بعد کھل کر مسکرائے، ان صاحب کی دلیل انھیں ”بھا“ گئی تھی۔ پوچھنے لگے آپ کی بات مان گئے کیا؟“ میں نے گزارش کی کہ ایک ان کی بات ہی کیا آپ کے اور ہمارے آس پاس جتنے بھی ایسے چہرے اور لوگ ہیں، وہ بیچارے کبھی مان کے نہیں دیتے۔ مان جائیں تو بداخلاقوں کی کیٹیگری سے نہ نکل جائیں!

کچھ کو اپنی اس خوبی نما کمزوری کی خبر ہوتی ہے اور اکثر بے خبری میں مارے جاتے ہیں۔ گھر، اسکول، کالج، یونیورسٹی، آفس، سفر، سسرال کون سی جگہ ہے جہاں ایسے نادرِ روزگار لوگوں کا گزر نہ ہو، معاف کیجیے پولیس کے علاوہ ہماری اپنی صحافی برادری میں ایسے کرداروں سے واسطہ بہت ہی زیادہ پڑتا ہے۔ ایک صاحب بہت سالوں، سفارشوں اور گزارشوں کے بعد لاہور جم خانہ کے ممبر بنے تو مجھے بطور خاص دعوت دے کر ساتھ لے گے۔ وہاں ٹیلی فون کی ممانعت ہے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب کی بھی بطور خاص عمل داری ہے۔ انھوں نے پہلے تو جا کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھی اور پھر زور زور سے فون پر بات شروع کر دی۔ ویٹر نے مسکرا کر کچھ کہنے کی کوشش کی تو اسے شٹ اپ کال دے

KitabPK.Com

دی۔ وہ جوان کی آنکھوں میں لہجے اور ٹانگوں میں تکبّر تھا۔ مجھے دوبارہ ان کے ساتھ کہیں جانے کی آرزو سے ہی بے نیاز کر دیا۔

پچھلے دنوں بہاولپور سے پندرہ بیس کلومیٹر دور نور پور نورنگا کے مقام پر جہاں مبارک پور کو سڑک مڑتی ہے، ہم ذرا دیر کو رکے کیونکہ میں نے زندگی کا ایک قیمتی سال اس اسکول میں پڑھا۔ جب ہمارے ابو امریکن یونیورسٹی بیروت پڑھنے چلے گئے تھے اس وقت میں ساتویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ وہاں ہمارے میزبان نے بتایا کہ کچھ عرصہ قبل پولیس کے اعلیٰ آفیسر جو اپنی بدتمیزی اور بدتہذیبی کے لیے بڑے مشہور تھے۔ وہاں سے گزرے تو ڈرائیور کا دوران سفر ان کی مسلسل گالیاں سنتے ہوئے پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے بیچ سڑک کے گاڑی روک کر انھیں اپنی سرکاری بندوق سے گولی مار دی۔ وہاں ایک صاحب نے بڑی محبّت سے سیبوں کی ایک پیٹی کا تحفہ دیا۔ احمد پور شرقیہ عبور کرتے ہوئے ہم نے پیٹی کھول کر کھانے کے لیے کچھ سیب نکالے، تو ایک لمحہ کو بڑی تکلیف ہوئی، بند پیٹی میں کتنے ہی سیب گل چکے تھے۔

لکھتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں تو ایک دم سے خیال آیا ہے کہ یہ کب ضروری ہے کہ دوسروں کی بند کی ہوئی پیٹیوں میں پڑے سیب ہی خراب ہوں۔ اپنی ذات کی پیٹی میں تہ در تہ پڑے اور سجے سیبوں میں سے بھی تو کچھ ایسے ہو سکتے ہیں کہ جیسے مشفق خواجہ جیسے نقاد نے کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک باکمال جملہ لکھا تھا کہ اس کتاب کو پڑھ کر میز پر رکھنے کو دل نہیں چاہتا بلکہ اٹھا کر پوری قوت سے دور پھینکنے کو خواہش ہوتی ہے۔ ایسے ہی ان کو بھی نکال کر دور پھینکنے کی زوردار خواہش پیدا ہو۔

نسیم صاحب زندہ ہوتے تو ضرور یہ پڑھ کر کچھ کہتے، مسکراتے۔ ممکن ہے اپنی بھی کوئی ایک آدھ غلطی مان لیتے مگر چند سال پہلے سنا تھا۔ بائر (Bayer) کے ہیڈ آفس سے نکل کر سڑک کراس کر رہے تھے، سڑک کے پار ان کا بیٹا گاڑی لیے کھڑا تھا۔ انھیں گاڑی تک جانا اور بیٹے سے ملنا نصیب نہ ہوا۔ ایک تیز رفتار گاڑی نے عین آفس کے سامنے ہوا میں اچھال دیا۔ واپس زمین پہ تو اُس مردِ شریف کا جسم آئے روح تو کہیں اوپر ہی پرواز کر گئی۔ ان کے بیٹوں اور اہلیہ سے رابطہ نہ ہونے کے باعث تعزیت نہ کر سکا تھا۔ آج یوں سمجھیں یہ تعزیتی لفظ ان سب کے لیے کہ جن کے دل اور روحیں کبھی نہ کبھی کسی بدتمیز، بدتہذیب، گھمنڈی یا یوں مجھے بداخلاق کے لفظوں سے بے طرح زخمی ہوئیں اور وہ کتنی دیر ان کی اذیت جھیلتے رہے اپنے دل پہ بڑا بوجھ اور تکلیف سہتے رہے۔

میں اپنے لان میں بیٹھا یہ سطریں مکمل کر رہا ہوں چاروں طرف صبح کی پیلی سی روشنی نے ہر پودے اور پتے کو پیلا کیا ہوا تھا۔ حیرت سے دیکھا یہ چند لمحوں کا سراب تھا۔ جلد ہی وہ پھر اپنے اصل رنگ میں آ گئے۔ میں ایک دم گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور لان میں واش بیسن پر لگے مدھم اور دھندلے سے آئینے میں نظر آنے والی اپنی شکل کو دیکھنے لگا۔

دوسروں کو سکھاتے، پڑھاتے، ان کے سیبوں کی پیٹیوں سے خراب سیب نکالنے پہ خوش ہوتے، اجر و ثواب کی تمنا اور توقع رکھتے، سوچا تھا آج لگے ہاتھوں اپنی ذات کی دو چار پوشیدہ پیٹیوں کے گلنے والے سیبوں کو بھی نکال پھینکوں۔ دھندلے سے آئینے نے کھٹ سے سراب دکھایا ہے، تم! ارے نہیں تو!

”تم تو آم کے وہ بوٹے ہو، جس پہ سدا بور ہی آتا ہے۔ بُور کا کیا سوال!“ میں نے یہ جانتے ہوئے خاموشی سے آئینے کی بات مان لی ہے کہ کسی بھی آم پہ ہمیشہ بُور نہیں آتا۔

ooo

KitabPK.Com